رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ
نئے افق
کراچی

نومبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ نئے اُفق کراچی

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی

مدیر
عمران احمد

مدیر معاون
اقبال بھٹی

[illegible]
طاہر احمد قریشی

[illegible]
نورالدین

جلد	39
شمارہ	12
نومبر	2015

WhatsApp
0314-8250376

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)............50 روپے
پاکستان (سالانہ)............600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2 021-3562077 یکے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

میں بھی وہیں موجود تھا دیکھا کیا جلوہ تیرا، اللہ کی پناہ، اللہ کی پناہ منیٰ کا سانحہ شاید مرتے دم تک یاد رہے یوں تو اس طرح کے کئی حادثات خصوصاً منیٰ میں ان گناہگار آنکھوں نے دیکھے ہیں۔ بس چند لمحوں کی بات تھی پلک جھپکتے موت نے جھپٹا مارا اور سیکڑوں احرام پوشوں کو سمیٹ کر لے گئی مجھ میں اور مرنے والے، حجاج کرام میں چند قدم کا ہی تو فاصلہ تھا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بلا لیتا ہے منیٰ میں تقریباً ہر سال ہی ایسا سانحہ ہوتا ہے کبھی کم کبھی زیادہ حجاج اپنے رب کے حضور حاضر کر دیے جاتے ہیں۔

دراصل ایسے حادثات حجاج کرام کی بے صبری، جلد از جلد جمرات کو کنکر مار کر قربانی کرا کر حلق کر کے احرام سے نکلنے کی جلدی کا نتیجہ ہوتے ہیں میں وہیں موجود تھا ان جلد بازوں میں، میں خود بھی شامل تھا مزدلفہ سے واپسی کے فوری بعد سیدھے جمرات کی طرف ایک ہجوم رواں تھا حادثہ یوں رونما ہوا کہ آنے والے ہجوم نے واپس جانے والا راستہ بھی آنے کے لیے استعمال کر لیا۔ بڑے جمرات کو کنکر مارنے کے بعد واپس جانے والا راستہ مسدود کر دیا ایک وقت ایسا آیا کہ آنے اور واپس جانے والے آمنے سامنے ہو گئے پولیس کے انتظامی عملے نے لاکھ کوشش کی کہ واپس جانے والوں کو کسی طرح راستہ فراہم کر دیں لیکن جیسے آنے والوں کو جلدی اور بے صبری تھی ایسے ہی واپس جانے والوں کا عالم تھا پھر دونوں اطراف سے نکلنے کے لیے زور آزمائی شروع ہوتے ہی بھگدڑ مچ گئی، پھر کیا تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار بھاگم بھاگ جو لوگ جمرات سے آگے حرم اور عزیزیہ کی سمت نکل گئے وہ بلاشبہ خیریت سے رہے اور جو لوگ واپسی کے لیے ان ہی آنے والے لوگوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش میں رہے وہ بھی آنے والوں کے زور میں کچلی گئی اور لقمہ اجل بن گئی جو لوگ کناروں پر یا پلرز کی آڑ میں تھے وہ بھی اس بھگدڑ میں زخمی ہوئے موت انہیں چھوتی ہوئی

گزر گئی لیکن جو وہاں سے بھی خوف زدہ ہو کر نکلے، وہ ہجوم کی زد میں آ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بلاشبہ سعودی انتظامیہ نے اگر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جو انتظامات کیے تھے اگر ان میں کہیں جھول ہوتا تو صرف پچاس منٹ میں رمی دوبارہ شروع نہ ہوتی۔ پچاس منٹ میں میدان صاف کر دیا گیا اور رمی کے لیے حجاج آنے لگے تھے۔ گو خوفزدگی کا عالم تھا ڈرتے ڈرتے لوگ رمی کے لیے آ رہے تھے اگر حجاج کرام تھوڑا سا صبر کر لیں اور مزدلفہ سے واپسی پر کچھ دیر اپنے خیموں میں آرام کر کے رمی کے لیے نکلیں اور صبر اور تحمل سے رمی کے لیے نکلیں تو یقیناً ایسا بھیانک حادثہ واقعہ نہ ہو۔

بڑے دکھ کے ساتھ ایک بات میں یہاں کہنا چاہ رہا ہوں حج کا اہم ترین رکن وقوف عرفات ہے جہاں پہنچ کر آنے والے حج سے سرفراز ہوتے ہیں یہاں لوگ براہ راست اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جو اپنے بندوں کی شہہ رگ سے بھی قریب ہے ان کی ہر دعا خود سنتا ہے اور منظور کرتا ہے حاجی جب اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتا ہے تو اس کا مالک اس کا رب اسے اس کی خواہشات و توقعات سے بہت زیادہ عطا فرما دیتا ہے۔ افسوس کے اب بہت سے لوگ، حج کا سفر بھی تفریح طبع کے لیے کرتے ہیں جیسے پکنک پر آئے ہوں۔ عرفات میں ہی کسی کیمپ میں لوگوں نے وقوف عرفہ شروع ہوتے ہی ناچنا گانا شروع کر دیا خوشی سے دیوانے ہو گئے کہ ہم سب حاجی ہو گئے۔ اللہ سے مغفرت و حاجات مانگنے کے بجائے ان لوگوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ایسے حجاج کی وجہ سے ہی شاید ایسا عظیم سانحہ رونما ہوا ہو، اللہ تعالیٰ ان تمام حجاج شہدا کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات (بلا تحقیق) بیان کردے۔" (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

شروع اس ہستی کے نام سے جو بڑی غفور و رحیم قہار و جبار ہے لیکن ہم اس کی کریمی عفو اور درگزر والے پہلو پر زیادہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں اور وہ خود بھی زیادہ زور اسی پر دیتا ہے وہ خود فرماتا ہے کہ میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں، بھلا کوئی ماں اپنے بچے پر ظلم کرنا یا اس پر ظلم برداشت کر سکتی ہے تو ہمارا خالق ہے کیونکر برداشت کرے گا۔ مگر آج امت مسلمہ دنیا میں کیونکر خوار ہے، کیا ہمارا رب ہم سے ناراض ہے؟ کیا اس نے بنی اسرائیل کی طرح ہمیں بھی دھتکار دیا ہے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ خود ہمارے کرتوت ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دین حق اور کتاب ہدایت دی، جینے کا قرینہ دیا مگر ہم ہدایت لینے کے بجائے فرقوں میں بٹ گئے، ہم لوگ جس شاخ پر بیٹھے ہیں اس کو کاٹنے میں مصروف ہیں ایک دوسرے کو چند روپے کے لالچ میں گدھے کتے اور حرام جانور کھلانے میں مصروف ہیں ہم خود اپنے لیے عذاب تخلیق کر رہے ہیں، فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کر کے ذرا اپنا اپنا جائزہ لیجیے آخر ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں اپنے حال پر رحم کرنے کی توفیق دے۔

ہم قارئین کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے نئے افق کے نئے بلکہ پرانے انداز کو پسند کیا۔ ہم آپ قارئین کے تعاون سے نئے افق کو مزید دل کش بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اس ماہ ماضی کے کہنہ مشق لکھاری موجودہ دور کے نامور صحافی اور اینکر پرسن مرزا ناصر بیگ چغتائی صاحب نے ہمارے بے حد اصرار پر انگریزی ناول کا ترجمہ دیا ہے۔ جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ دوسرے ہمارے پیارے امجد جاوید نے قلندر ذات جلد ختم کر کے ایک نئی سلسلہ وار کہانی شروع کرنے کا عندیہ دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ کہانی قلندر ذات سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوگی۔

اب آیئے اپنے محبت ناموں بلکہ ہدایت ناموں کی طرف پہلا انعام یافتہ لولیٹر ہے رحیم یار خان سے محترم فلک شیر ملک کا آپ رقم طراز ہیں، جناب مشتاق قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی اور طاہر احمد قریشی صاحب سلام خلوص قبول کریں۔ ماہ اکتوبر کا اتنا زبردست شمارہ پیش کرنے پر آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ٹائٹل سے صفحہ 290 تک ہر تحریر اور ہر ہر سطر اپنے اندر ایک دلکش انداز لیے ہوئے ہے۔ دستک میں مشتاق صاحب نے بلدیاتی انتخابات کے بارے میں جو باتیں کی وہ فیصلہ تو عوام کرے گی مگر سیاستدانوں نے اپنا جھوٹا ڈرامہ شروع کر دیا ہے، بجری اور روڑی کے ٹرک آ جا رہے ہیں ایک آدھ کلومیٹر سڑک بنا کر پھر پانچ سال چھٹی۔ محبت ناموں میں ممتاز احمد کو مبارک اور میری غزل پسند کرنے کا شکریہ، ظہور صائم صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ریاض بٹ کا تبصرہ اور تحریر (نیکی کا دیا) زبردست تھے۔ اشفاق شاہین اور مقبول احمد صدیقی کے تبصرے بھی اچھے تھے پیاری بہن ناز سلوش ذشے صاحبہ چھبیس سال کی جوانی کی عمر میں ہی آپ کی ازدواجی زندگی میں کوئی مسئلہ ہو گیا مجھے دلی دکھ ہوا غم نہ کریں ان شاء اللہ جلدی فصل گل آئے گی غنچے پھول بن کر مہکیں گے آپ پری کو اچھی تربیت دیں اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ اقرا پڑھتے ہیں تو آخرت یاد آ جاتی ہے سفر طویل ہے اور توشہ بہت کم ہے۔ راجپوت اقبال

احمد کی (خودرو) ایک انوکھی تحریر تھی جس کے ہر موڑ پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ (تعاقب) قتل کی زبردست پلاننگ کی جیفرسن نے مگر دیکھنے والے ابھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ (قاتل حسینہ) پسند آئی نغمہ جو چڑیل کی شکل میں خون پیتی ہے مگر اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے جس سے وہ راکھ ہو گئی۔ (قلندر ذات) صحیح سمت میں رواں ہے۔ عمر فاروق ارشد کی (عشق نامراد) اچھی لگی دو ملاؤں میں مرغی حرام والی بات ہوئی ناں۔ فاروق ارشد صاحب پریشان نہ ہوں آپ کو انعام بھی مل جائے گا۔ ریاض بٹ کی (نیکی کا دیا) کی پہلے ہی تعریف کر چکا ہوں انہوں نے ڈبہ پیر جیسے ظالم لوگوں کو پکڑا۔ (رشتہ خون) آغاز الدین نے بہت خوب لکھا۔ جیک تو گیا مگر جنجر کو بچالیا (روپ بہروپ) میں جہانزیب (جانو) شاہ صاحب بن گئے ہیں اور وطن دشمن عناصر کے خلاف تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔ دلاور خان کے تمام ذخائر اسلحہ سمیت ختم کر دیے اور تاربین کے جنگل بھی جلا ڈالے۔ یہ قسط بھی اچھی رہی۔ مختصر فن پاروں میں جاوید صدیقی کی (واپسی) اچھے انداز میں لکھی گئی مختصر سی تحریر بھلی تھی۔ ساحل ابڑو کا (ٹوٹا ہوا تارا) مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا رونا پسند آیا نسیم سکینہ صدف نے (روبرو) میں حالات حاضرہ کا منظر بیان کیا ہے نفسیاتی کہانی کے علاوہ بھی ایک بات اس تحریر میں ہے کہ ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے کوئی آس پاس کی خبر نہیں رکھتا خواہ کوئی تخریب کار یا دہشت گرد ہی پاس کھڑا ہو میرے مشاہدے میں یہ بات آ چکی ہے کہ اگر کہیں خدانخواستہ کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ ہو جاتا ہے تو بجائے ایمبولینس کا بندوبست کرنے کے یا مریض کے زخموں پر پٹی رکھنے کے وہاں سے یہ کہہ کر کھسک لیتے ہیں (چل سانوں کی) زریں قمر نے ضرب عضب کے حوالے سے بہت خوب صورت انداز میں لکھا ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں زبردست ہیرے جواہرات تھے پڑھ کر مزہ آیا۔ بشیر احمد بھٹی کی (خوشخبری) پڑھ کر سکون ملا ایم جے قریشی کا انتخاب محسن نقوی کا کلام گویا موتی پروئے گئے تھے فائزہ عباس گوجرانوالہ کی (سات حکایتیں زندگی کی) بہت سبق آموز تھیں۔ خوشبوئے سخن میں ریاض حسین قمر کی غزل عمدہ تھی۔ اب اس ماہ کی سپرہٹ تحریر (فیصلہ عوام کا) پر کچھ تبصرہ۔ ابن عرب نے کمال کا لکھا ایک پرفیکٹ تحریر جس میں موجودہ سیاستدانوں کی نالائقی اور زبانوں کا حسین امتزاج شامل تھا۔ طنز و مزاح سے بھرپور شاہکار پڑھ کر مصنف کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں آخر میں دلی کے بانکے نے وہ کام کیا جو ایک اچھا کھانا کھانے کے بعد ایک اچھی سی چائے کرتی ہے۔ معیاری اور بھرپور رسالہ پڑھ کر دوبارہ آپ لوگوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا ہے کہ اگلا شمارہ اور بہتر ہو۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے بافضل اللہ ہنستے، مسکراتے اور خوشیاں بانٹتے ہوں گے۔ رب سوہنا! ایمان کی سلامتی صحت کی بادشاہی، تمام دلی نیک خواہشات پوری فرمائے اور اپنی نعمتوں اور رحمتوں کے سائے تلے ہمیشہ شاد و آباد رکھے آمین ثم آمین۔ دل غمگین بہت ہے، انسانی رویوں میں کتنا تضاد آ گیا ہے۔ دکھاوے کی عبادتیں، دکھاوے کی عیدیں، بے حسی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے انسان۔ ایک دوست تیرہ لاکھ کا جانور قربانی کے لئے لے آیا، محلے والے بڑی تعریفیں کر رہے تھے، اُس کی بلے بلے ہو رہی تھی اور اس کی ساجھی دیوار کے دوسرے گھر میں تین بیٹیاں کنواری بیٹھی تھیں، جن کے بالوں میں چاندی اُتر آئی تھی اور شادی نہ ہو سکی، کیونکہ جہیز کے لئے رقم تھی نہ دوسرے اخراجات کے لئے۔ ان کے دلوں پر کیا گزری ہوگی۔ جیتے جی مر گئی ہوں گی۔ وہ بھی اپنے رب سے فریاد تو کرتی ہوں گی۔ مرنے کے پلان بناتی ہوں گی۔ فکر طلب بات۔ یہ قربانی، دس ہزار، بیس ہزار کی بھی ہو سکتی تھی، باقی رقم سے کتنی بیٹیوں، بہنوں کی شادیاں ہو سکتی تھیں۔ یتیموں کے گھر کا چولہا جل سکتا تھا۔ بیماروں کا علاج ہو سکتا تھا۔ کسی کا قرض اُتارا جا سکتا تھا۔ نئے اُفق اکتوبر 2015ء عید سے پہلے مل گیا۔ یوں سمجھیں ہماری عید ہو گئی۔ سرورق پر بیٹھی دوشیزہ خوف اور دہشت پھیلاتی نظر آئی آنکھوں میں انتقام، حیرت میں ڈوبی، شکار کی تلاش میں، مجھے تو کوئی چڑیل ہی لگی۔ خوبصورت ٹائٹل کے لئے مبارکاں۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی نے خوب نقشہ کھینچا ہے۔ کاش! ہم اپنے ووٹ کا صحیح استعمال سیکھ

لیں۔سیاستدانوں کا کیا ہے، بیچارے آنکھوں سے اندھے، کانوں سے بہرے، لنگڑے ہوتے ہیں، ان کو عوام کے مسائل نظر آتے ہیں، نہ کسی کی فریاد سنائی دیتی ہے۔ان کو ایوانوں کی فضائیں بھلی لگتی ہیں، تجوریاں بھرنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔جب بھی الیکشن کا وقت آتا ہے، ہاتھ باندھے، چلے آتے ہیں، ان کی گاڑیاں دیہاتوں کا رُخ کرتی ہیں، کوئی مر جائے تو حاضر، کسی کی چوری ہو جائے، کوئی قتل ہو جائے، انصاف ان کی مٹھی میں ہوتا ہے.....عوام میں شعور وآگہی ہے لیکن ایک خوف ہے، ڈرسا ہے، سہمے ہوئے ہیں۔کاش! ان کے دلوں سے انسانوں کا خوف نکل جائے اور خوف خدا پیدا ہو جائے۔ہمارے عوام صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے اور اپنے ووٹ کا ٹھیک استعمال کرے تو اس ملک کی کایا بدل سکتی ہے۔کرپشن، لوٹ مار، دہشت گردی، مہنگائی ختم ہو سکتی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ کرپشن کے سارے طریقے عوام نے ہی ایجاد کیے ہیں اور روتے بھی یہی ہیں۔جن میں خود کو بدلنے کا شوق نہیں ہوتا اُنہیں زمانہ ذلیل وخوار کر دیتا ہے۔گفتگو میں عمران احمد نے خوبصورت بات کہی کہ تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے تحریر پر بات ہونی چاہیے، منصف کی ذات پر کیچڑ اچھالنا اچھا نہیں ہے۔یہ حسد، انا اور نفرت ہوتی ہے۔پیارے ہر دل عزیز ممتاز احمد صاحب کو صدارت کی کرسی مبارک ہو اور انعام بھی، ظہور احمد صائم، محمد اسلم جاوید، ریاض حسین قمر، ریحان عامر، عامر زمان عامر، عبدالغفار عابد، پرویز احمد دلو، فلک شیر ملک، اشفاق شاہین، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، خوبصورت تبصرے کر رہے تھے، ریاض بٹ حسن ابدال، پیارے کیسے ہیں؟ ممکن ہو تو رابطہ کیجیے۔ناز سلوش ذشے، آپ کے تبصرے نے رولا ہی دیا۔میری مانیں تو رب رحمان سے ناتہ جوڑ لیں، زمانے کے سارے غم بھول جائیں گی، وہ رب ہے، جس کا نام ''اللہ'' ہے، اپنے بندے کو دکھ تکلیف نہیں دیتا، ہم زمانے سے اُمیدیں وابستہ کر لیتے ہیں، اسی لیے دکھی، اُداس، مایوس ہوتے ہیں، آنسو نکلتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں۔یہی آنسو، رب رحمان کی یاد میں نکلیں تو دُنیا اور آخرت سنور جاتی ہے۔ادنیٰ سے بھائی کا مشورہ مان کر رب رحمان سے ناتہ جوڑ لیں، خوشیاں ہی خوشیاں ملیں گی۔ایڈیٹر بھائی، کیا خوبصورت بات کہی ہے کہ ''اللہ'' جس سے خوش ہوتا ہے اسے بیٹی عطا کرتا ہے۔دعا کیجیے گا، اللہ جی، مجھے بھی بیٹی جیسی رحمت سے نواز دے۔آمین۔اقراء میں طاہر قریشی نے کمال کر دیا۔کتنا خوبصورت جملہ تھا ''اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدے کا حکم دیا جو دراصل انسان کو نہیں اس روح کو سجدے کا حکم تھا جو روح الٰہی کا حصہ ہے'' اللہ تعالیٰ بے عقلوں کو عقل سے نوازیں انسان کتنا ناشکرا ہے، ہزار ہا نعمتیں پا کر بھی شکوے، شکایات کے انبار لگا رہا ہے۔افراتفری میں مارا مارا پھرتا ہے، روزی روٹی کے لئے اپنوں کے گلے کاٹتا پھرتا ہے، عزتیں پامال کرتا پھرتا ہے۔انسان یہ جانتے ہوئے بھی بے خبر ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جس سے ناراض ہوتا ہے، اُس کا رزق تنگ کر دیتا ہے، ہم انسان کی ناراضگی سے تو ڈرتے ہیں مگر رب رحمان کی ناراضگی سے نہیں۔وہ رحمان کتنا رحیم ہے، ہم اُس کی نافرمانی کرتے جاتے ہیں اور وہ ہمیں نوازتا جاتا ہے۔میرے اللہ جی! میں تجھ پہ قربان۔کہانیوں میں قاتل حسینہ میں خلیل جبار نے کمال کر دیا۔کالا جادو سے محفوظ رہنے کا گر بتا دیا۔اہل مسلم، اس پر عمل کر لیں تو ڈبہ پیروں سے جان چھوٹ جائے گی۔''جو لوگ باوضو رہتے ہیں ان پر کالا جادو اثر نہیں کرتا، بلکہ جادو کرنے والا خود ہی کالے علم سے ہلاک ہو جاتا ہے۔''عقل والوں کے لئے بہترین دولت ہے، اور کم عقلوں کے لئے ہزاروں کتابیں بھی لکھ دی جائیں تو عقلوں کے قفل نہیں کھلیں گے۔ویلڈن۔تعاقب میں انجم فاروق ساحلی نے خوب لکھا، مجرم خود تھانے والوں کو پریشان کرتا رہا اور مجرم کا یہ رُوپ پڑھ کر حیران رہ گیا۔نیکی کا دریا، ریاض بٹ نے کہانی کو جلدی ختم کر دیا۔تھانیدار نے مجرم کو کھل کے بے نقاب نہیں کیا، ایسا لگتا تھا جیسے تھانیدار اپنے عہدے سے واقف ہی نہیں ہے۔ریاض بھائی، حسن ابدال میں پہاڑی پر جو بابا قندھاری کا مزار ہے، اس بارے کچھ بتا سکتے ہیں۔رشتہ خوں، اچھی رہی، قلندر ذات پڑھی نہیں۔روپ بہروپ، میں محمد سلیم اختر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔کیا عمدہ لکھتے ہیں۔ان کی متعدد کہانیاں پڑھی ہیں۔سادہ اسلوب میں قاری کو شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ

ان کو سلامت رکھے آمین۔ اکتوبر کی سپر ہٹ کہانی، عشق نامراد عمر ارشد فاروق رہی۔ آج کے دور میں جہاں ہر طرف اُداسیاں، ہی اُداسیاں ہیں، اس تحریر نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ لحہ لحہ ہنساتی، مسکراتی تحریر نے متاثر کر دیا۔ میں ان ہاتھوں کو چوم لوں۔ وری گڈ، عمر ارشد فاروق صاحب، مزاح مزاح میں طنز کے کیا تیر چلائے ہیں۔ میٹھی چھری سے معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گریٹ یار، ویلڈن۔ مبارکاں۔ مختصر فن پارے، میں روبرو، نسیم سکینہ صدف اور جوابی حملہ اسرار احمد نے زبردست تھا۔ دونو تحریریں متاثر کن تھیں۔ ذوق آگہی، خوشبوئے سخن میں انعام حاصل کرنے والوں کو مبارکاں، ضرب عضب، شاندار رہی اور دلی کے بانکے میں مختصر تحریر نے بہت کچھ کہہ دیا۔ بے شک انسان اپنے لئے تو بہت کم جیتا ہے، نوے فیصد دوسروں کے لئے جیتا ہے۔ زبردست تحریر تھی۔ نئے اُفق سے دیرینہ وابستگی ہے، لیکن مصروفیت کی وجہ سے بہت کم لکھا، اب وعدہ کرتا ہوں کہ ریگولر حاضری ہوگی، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، وعدہ کرو تو پورا کرو، چاہے تمہاری جان چلی جائے۔ اب یہ ادارہ پر منحصر ہے کہ ہمیں آنکھوں پر بٹھاتے ہیں یا...... میں تو اتنا کہوں گا، جہاں پھول ہوں، وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں، ہمیں کانٹا ہی سمجھ کر اپنی محفل میں جوتوں پر جگہ عنایت فرما دیں۔ آخر میں دوستوں اور نئے اُفق سے دعاؤں کی اپیل کروں گا کہ رب سوہنے سے میرے لئے التجا کریں کہ وہ رحیم ذات مجھے رحمت عطا فرما دے، مجھے بیٹی عطا فرما دے۔ آمین ثم آمین!۔ والسلام!

☆ مجید احمد جائی جی آیا نوں آپ کی جگہ جوتوں میں نہیں ہمارے دل میں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جنت یعنی پھول سی بیٹی عنایت کرے آمین۔

صائمہ نور...... بہاول پور روڈ ملتان، السلام علیکم! اُمید کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم و فضل سے ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ دعا ہے کہ رب العزت اپنی رحمتوں، نعمتوں، سے مالا مال فرمائے، صحت و تندرستی، خوش مزاجی سلامت رکھے اور اپنے گھر خانہ کعبہ کی بار بار زیارت نصیب فرمائے، بے اولادوں کو نیک اولاد، بیماروں کو شفا یابی عطا فرمائے، پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دُور فرمائے۔ پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے۔ بدامنی، مہنگائی سے نجات عطا فرمائے اور اپنے نیکوکاروں میں شامل فرمائے، اللہ تعالیٰ، اپنی ادنیٰ سی بندی کی دعائیں قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین!۔ نئے اُفق ماہ اکتوبر 2015ء کا عید سے پہلے مل جانا، ہم غریبوں کے لئے مسرتوں کا باعث بنا۔ ہمارے گم صم چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، لب دعاؤں کے لیے کھل گئے۔ ہاتھ رب حضور اُٹھ گئے۔ بہت شکریہ نئے اُفق، تو نے ہماری عید میں رنگ بھر دیئے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لئے کتنی بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں، پھر بھی ہزاروں غموں پر لحہ بھر کی خوشیاں حاوی ہو جاتیں ہیں۔ حج ادا کرتے ہوئے منیٰ میں بھگدڑ سے سیکڑوں حاجی شہید ہو گئے، معمولی سی غلطی، کتنے بڑے نقصان سے دوچار کر گئی۔ اللہ تعالیٰ شہید ہونے والوں کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل جیسی دولت سے مالا مال فرمائے آمین۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ دیار غیر میں موت کا صدمہ یہ ننھی سی جان جھیل چکی ہے۔ میرے پیارے بابا جانی! اپنی اولاد کے لئے خوشیاں لانے گئے تھے اور وہی موت کے سپرد ہو گئے۔ ہم ان کے آخری دیدار سے محروم رہ گئے، یہی دکھ کھائے جاتا ہے۔ کاش! پاکستانی حکومت اس حوالے سے قانون سازی کرتی۔ دیار غیر سے میت پاکستان لانے کے لئے کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، ہم سے پوچھئے۔ خیر...... خود تو اُداس بیٹھے ہیں آپ کو کیا اُداس کرنا۔ سنایئے عید کیسی گزری، امید ہے خوب مزے اڑائے ہوں گے۔ ہماری عیدیں...... یتیموں کی بھلا کیا عیدیں ہوتی ہیں...؟ ماں باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو بھائی بھی نہیں پوچھتے، اوروں کا ذکر کیا کریں...... ہم تو بنا ماں باپ کے زندگی کو دھکا دے رہے ہیں، کبھی تو سانسیں لوٹ جائیں گی۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی، سوئی ہوئی عوام کو جگانے کی کوشش کر رہے تھے، کاش اب عوام ہوش کے ناخن لے اور عقل کے تالے کھول کر، دل میں خوف خدا رکھ کر اپنے ووٹ کا حق ادا کریں، ووٹ ضائع نہ کریں۔ مگر

مچھوں کو بتادیں کہ اب کی بار ہم جھوٹے وعدوں، کھوکھلے نعروں کی زد میں نہیں آئیں گے۔ گفتگو میں انکل ممتاز احمد کو انعام کی بہت بہت مبارک باد، ممتاز انکل اگر آپ پندرہ سال سے خاموش قاری ہیں تو ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ زندگی کی بائیس بہاریں نئے اُفق کے ساتھ ساتھ گزاردی ہیں اور کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی۔ ہے ناں حیران کن بات...... اب غم بڑھ گئے ہیں تو کاغذ قلم تھام لیا ہے۔ نئے اُفق کی مرضی، ردی میں ڈال دے، یا قدموں میں جگہ دے دے۔ زندگی کے کئی نشیب وفراز اس کے ساتھ دیکھے ہیں۔ اب اس دُنیا سے دل اکتا سا گیا۔ دل میں حسرت ہے کہ دم نکلے تو مسجد نبوی کے کسی کونے میں، کہو آمین۔ ریاض احمد قمر، ریاض بٹ، جاوید احمد صدیقی، اور ناز سلوش ذشے کے تبصرے جاندار تھے، نئے لوگوں میں عبد الغفار عابد، عامر زمان عامر۔ ریحان عامر، پرویز احمد دولو، خوب انٹری دے رہے ہیں۔ گفتگو کے صفحات بڑھادیں، ننھا سا مشورہ اگر قبول ہو تو۔ اقراء، اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں میں نیکی کا دریا ریاض بٹ، خوب لکھتے ہیں، ڈبہ پیر واقعی معاشرے میں ناسور بنے ہوئے ہیں۔ سیدھے سادے لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی باتوں میں آکر بیوقوف بن جاتے ہیں، خدا کو بھول کر خدائی پر مر مٹتے ہیں۔ قاتل حسینہ بھی غور وفکر کرنے والوں کے بہترین تحریر تھی۔ تعاقب مغربی کہانی اوپر اوپر سے گزر گئی۔ عشق نامراد، عمر ارشد فاروق نے کمال ہی کردیا، اس طرح کی تحریروں کی ضرورت ہے، آج کے اُداس دور میں لبوں پر مسکراہٹ پھیلانے صدقہ جاریہ ہی تو ہے۔ کھلکھلاتی تحریر نے طنز کے خوب تیر چھوڑے ہیں، خوب نشتر چلائے ہیں۔ سمجھنے والوں کے لئے بہت کچھ ہے اس میں۔ روپ بہروپ، اپنے سحر میں جکڑتی جارہی ہے۔ انسان کیسے کیسے روپ بدلتا ہے۔؟ چہرے پہ چہرہ سجائے لوٹتے پھرتے ہیں، رب نے انسان کو اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیجا تھا اور یہ خدا بنا پھرتا ہے۔ خالق کو بھول کر خلقت میں گم ہو گیا ہے۔ اب تو شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا پھرتا ہے، اس سے چھپتا پھرتا ہے۔ انسان...... انسانیت کی دھجیاں اڑا رہا ہے، جیسے اسے مرنا ہی نہیں ہے، آخر اس نے فنا تو ہونا ہی ہے۔ مختصر فن پارے، خوب رہے، ذوق آگہی، خوشبوئے سخن، چھائے رہے، ضرب عضب بہترین تحریر تھی، فیصلہ عوام کا...... خوب صورت تحریر۔ دلی کے بانکے، خوب رہی، بعض لوگ، پیدا ہی دوسروں کے کام آنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کے دن رات دوسروں پہ وار دیتے ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب رہتے ہیں۔ لیجئے! ہم نے نئے اُفق مکمل پڑھ لیا، کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیوں نے مزہ کرکرا ضرور کیا۔ انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا، انسان غلطیاں نہ کرتا تو انسان کہاں رہتا...... اب اس ادنیٰ سی بہن، بیٹی کو دیجئے اجازت، زندگی رہی تو نومبر کے تبصرے کے ساتھ حاضری ہوں گی...... اگر ادارے نے برداشت کیا۔ ورنہ سلام آخری ہے۔

☆ پیاری بہن خوش آمدید ہمیں خوشی ہے کہ آپ کو نئے افق پسند آیا۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے اکتوبر کا نئے افق منفرد ٹائٹل لیے ہوئے وقت پر مل گیا۔ اس بار سرورق ذرا روایت سے ہٹ کر تھا اس لیے اچھا لگا۔ دستک بھی الگ رنگ لیے ہوئے تھی۔ قریشی صاحب پھر تو واقعی اسی خاکروب کو ہی آگے لانا چاہیے۔ باقی آپ کی بات بالکل بجا ہے کہ نت نئے سیاسی مداری بلدیاتی انتخابات میں اپنی ڈگڈگی کے ساتھ میدان میں آن موجود ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، گفتگو کی محفل اس بار کافی جاندار تھی۔ مگر ہمارا تبصرہ کانٹ چھانٹ کر شائع کیا گیا تھا۔ ہمارے خیال میں تو کام کی ساری باتیں اڑادی گئیں اور باقی ملغوبہ زینت قرطاس بن گیا۔ خیر اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ریاض قمر بھائی آپ نے بالکل بجا فرمایا خوشبوئے سخن کے سسٹم میں کچھ خرابیاں کافی پرانی ہیں مگر آپ امید رکھیں ان شاء اللہ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تو اپنی محنت کاغذ پر منتقل کرکے بھیج دیتے ہیں۔ اگر اسے ضائع کردیا جائے تو کفارہ ادارے کے ذمہ ہی ہوگا کیا خیال ہے؟ ابن مقبول صاحب اور میرے بھولے بادشاہ بھائی آپ نے یاسر عرفات کو دلیر مجاہد قرار دیا تو مجھے عالم

اسلام کے متعلق آپ کی ناقص معلومات کا انتہائی افسوس ہوا۔ شاید آپ کو سوئس اور اسرائیلی بینکوں میں یاسر عرفات کے خفیہ کھاتوں کا علم نہیں، فلسطینی قوم کا جو سودا یاسر عرفات نے اپنی نام نہاد حب الوطنی کی آڑ میں کیا تھا اس کے نتائج آج تک وہ بے گناہ قوم بھگت رہی ہے یاسر عرفات اور جمال عبدالناصر کو عالم اسلام میں ہیرو بنانے والا بھی یہودی میڈیا تھا۔ کبھی اس پر تحقیق کر کے دیکھئے گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ابتدائی صفحات پر محترم قریشی صاحب کو غیر حاضر دیکھ کر دکھ ہوا خیر نئے صاحب بھی اچھی کہانی لے کر آئے تھے۔ سلسلے وار کہانیوں میں سلیم اختر صاحب کا ناول زبردست جارہا ہے انداز تحریر عمدہ اور کرداروں پر گرفت کافی مضبوط ہے دیگر تحریریں بھی عمدہ تھیں۔ کہانیوں کی فہرست میں ہمارا نام غلط لکھا گیا جس کی وجہ سے دل آزاری ہوئی۔ ان اہم چیزوں کا خاص خیال رکھا کریں۔ کیونکہ یہ میگزین کے معیار پر حرف لانے کا سبب بنتی ہیں۔ بہر حال ہمارے میگزین میں بہت ساری مثبت تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اللہ مزید ترقی دے آمین، اپنا مکمل ایڈریس لکھ رہا ہوں، انعام ارسال کر دیجیے گا۔ ناسازی طبیعت کے باعث تبصرہ ذرا مختصر ہے۔ تمام بہن بھائیوں سے اپیل ہے کہ میرے لیے خصوصی دعائے صحت کریں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا، والسلام۔

☆ عمر! اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے، بھائی کام کی زیادتی اور پرچا وقت پر مارکیٹ میں دینے کے چکر میں چھوٹی موٹی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں آپ کا نام غلط شائع ہوا ہم معذرت چاہتے ہیں۔

مہر پرویز دولو...... میاں چنوں۔ سلام مسنون، عیدالاضحی نمبر پر تبصرہ حاضر ہے۔ سب سے پہلے خطوط کا کالم گفتگو پڑھا بعد میں اتنا حوصلہ ہی نہ رہا کہ کوئی کہانی پڑھ سکوں۔ محترم ریاض بٹ صاحب میں بالکل وہی پرویز دولو ہوں جو آداب عرض ہیں آپ جیسے اور بھائی محمد اختر، جناب امجد جاوید اور جناب نسیم جاوید سید ادب کے ضخیم سرمائے کی سرپرستی میں اپنی علمی اور ادبی پیاس بجھاتا رہا ہے۔ آپ مفکرین ادب کی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد اچھے ادب کو پڑھنے کے قابل ہوا آپ ادب کا وہ سرمایہ ہیں جس کو پڑھنا لوگ اپنے لیے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس ماہ کا انعام یافتہ خط ممتاز احمد صاحب آف سرگودھا کا پڑھا اور پڑھنے کے بعد انعام یافتہ منتخب ہونے کی وجہ سمجھ آئی۔ کیونکہ اس میں کوئی ایسی علمی دریافت تو نہ تھی جس سے علم کے میدان میں کوئی بھونچال آیا ہو، سوائے اس بات کے کہ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو کہا حق کہا اور سچ کہا۔ مگر ستمبر کے شمارہ میں پرویز احمد دولو اور عبدالقادر صاحبان اس بات پر بہت برہم نظر آئے تو میں اپنے ان قابل احترام دوستوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کیا کسی کے ڈر سے کہ کوئی ناراض نہ ہو جائے یا کسی دنیاوی مفاد کے پیش نظر سچ بولنا چھوڑ دیا جائے کیا جیالوں کی ناراضگی کے ڈر سے حق بات کو چھپا دیا جائے مزید لکھا کیا ہمارے سیاستدان صادق اور امین ہیں۔ تو سن لیں مجھ سے سابق صدر پاکستان بیس کروڑ عوام کے نمائندہ جناب آصف علی زرداری صاحب کی ذات پر اچھالا گیا کیچڑ برداشت نہیں ہو سکا۔ میں اس رسالہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ اگر کوئی شخص موجودہ صدر پاکستان یا وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف صاحب کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنائے گا تو میں اس پر بھی بھرپور احتجاج کروں گا اور باقاعدہ ان کی ذات کے لیے کھڑا ہو کر دفاع کروں گا۔ ممتاز صاحب میں مدنی مصطفیٰ ﷺ کی ذات پر نازل ہونے والی آخری لاریب کتاب قرآن مجید پر مکمل ایمان رکھتا ہوں، اس کی آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ "اور میں جسے چاہوں عزت دوں" یہ بلند ترین عہدے اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کے حوالے کرتا ہے اور اس شخصیت کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی ہے جو اس کی اہل ہو۔ ممتاز صاحب ذرا وضاحت فرمائیں گے یہ سچ کی کون سی قسم ہے جو سابق صدر پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنانے کے بعد خاموشی کی چادر تان کر چین کی نیند سو گئی ہے۔ اگر ان صفحات پر یہ وضاحت دلیل اور ثبوت کے ساتھ کر دی جاتی کہ صرف سابق صدر پاکستان اچھا سیاستدان نہیں باقی سارے فرشتوں کی طرح پاکیزہ ہیں تو میں آج شرم سے منہ چھپائے پھرتا۔ ممتاز صاحب آپ نے لکھا ہے کیا ہمارے سیاستدان صادق اور

امین ہیں؟ اردو اصطلاع میں اس کا مطلب ہے کہ پورے پاکستان میں سارے سیاستدان صادق اور امین نہیں، یعنی بات صرف سابق صدر پاکستان تک محدود نہیں رہتی باقی سیاستدان بھی اس میں شامل ہیں۔ مگر افسوس دیگر سیاستدانوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا بلکہ بعد میں موضوع ہی بدل گیا ہے۔ میں نے اور عبدالغفار عابد نے اپنے آپ کو کسی پارٹی کے ساتھ کھڑا نہیں کیا ہے۔ ہمارا مقصد تھا نام لیے بغیر جمع کا صیغہ استعمال کیا جائے کسی بھی شخصیت کو ذاتی عناد کی بنا پر ٹارگٹ نہ کیا جائے ہمارے سارے سیاستدان عظیم ہیں۔ اگر آج اچھی حکمرانی کریں گے اگلے الیکشن میں دوبارہ چن لیے جائیں گے۔ آپ ایک طرف تو سب سیاستدانوں کے صادق اور امین ہونے پر سوالیہ نشان لگا رہے ہیں دوسری طرف ایک ہی شخصیت کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانے پر خوش ہو کر داد دے رہے ہیں۔

☆ مہر پرویز صاحب ہم نے دستک کے حوالے سے وضاحت کر دی تھی اور بحث ختم کر دی تھی آپ کے خط سے اندازہ ہوا کہ آپ کا غصہ ختم نہیں ہوا، محترم معاف دیں اپنے دوستوں کو، اب بس۔

نازیہ خانم ...... **لاڑکانہ۔** السلام علیکم، میری اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیشہ کیلئے اللہ کی رحمت آپ کے ادارے پر برستی رہے آمین ثم آمین۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ نئے افق میرے ہاتھوں میں ہے جواب تک زیر مطالعہ ہے مگر نئے افق کیلئے یہ میرا پہلا خط ہے اور زندگی کا تیسرا خط، شاید اس کے بعد کبھی نہ لکھنے کی جسارت کروں کیونکہ یہ نوجوان ادیب رائٹر سب کے سب بڑے نام کمانے والے ہوتے ہیں اس معاشرے میں اس کی بڑی عزت ہوتی ہے اگر اس کا فین اس سے کہانی کے بارے میں کچھ پوچھنا بھی چاہے تو وہ رائٹر جواب دینا تک گوارا تک نہیں کرتے کیوں، کیونکہ ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ ادب تخلیق کرتے ہیں، میں مانتی ہوں کہ شاعر ہو کہ ادیب، اہل قلم ہو کہ دانشوران کا معاشرہ میں بہت بڑا مقام ہے۔ ساری ساری رات جاگ کر اس کی کہانی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس رائٹر اپنے فین کا شکریہ تک ادا نہیں کرتے۔ اگر ادب کی دنیا میں جھانک کر دیکھا جائے تو ساحل ابرو نے بھی خوب نام کمایا ساحل ابرو نہ صرف ایک اچھے کہانی نویس وشاعر ہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ٹوٹا ہوا تارا بھی بہترین کہانی اور ضمیر کو جھنجوڑنے والی تحریر تھی۔ مگر اس کہانی میں بھی وہی کردار پڑھنے کو ملے جس کی کسک مجھے عرصہ پانچ سالوں سے ہے۔ جی ہاں ساحل میں آپ کو کافی عرصے سے پڑھتی آ رہی ہوں بہت سے ڈائجسٹوں میں آپ کو پڑھنے کا شرف حاصل ہوا مگر آپ کی ہر کہانی کے مرکزی کرداروں میں دو کردار ضرور ہوتے ہیں ہیرو اور ہیروئن کا باقی جو سپورٹ کیلئے کردار دیے جاتے ہیں وہ الگ بات ہے جو آگے چل کر ختم ہو جاتے ہیں جو مرکزی کردار ہوتے ہیں تو میرے خیال میں وہ کہانی کے اختتام تک چلتے ہیں ساحل آپ کی ہر کہانی کے اختتام پر ہیرو اور ہیروئن کو موت دی جاتی ہے یا پھر دونوں مر جاتے ہیں۔ ہیروئن تشنہ لب بن جاتی ہے اور ہیرو کی آرزوئیں بھی دل میں رہ جاتی ہیں یقیناً وہ اختتام سبق آموز اور معاشرے کا عکاسی بنتا ہے ہر کہانی کا اختتام چونکا دینے والا اختتام ہوتا ہے۔ ساحل یہ آپ کی مہارت ہے یا کوئی اور بات مگر آپ کیوں لکھتے ہیں اور کیسے لکھتے ہیں کہانی کے اندر اتنا درد اور عورت کے پاس آبرو، واہ جی واہ ساحل ہم مان گئے۔ آپ کی ہر کہانی ہمیں رلا دیتی ہے اللہ پاک آپ کی تخلیق میں اور پختگی دے ایم اے کی طلبا نازیہ خانم اور میری والدہ پروفیسر مہناز حسن کی طرف سے مبارک باد ہو۔ ادھر انکل محمد سلیم اختر بھی کسی سے کم نہیں جس کی قسط وار تحریر بہت ہی خوبصورت چل رہی ہے اور انکل کی تحریر حقیقت کے قریب ہوتی ہے۔ جس کا کردار ہمیں براہ راست موجودہ دور میں ملتا ہے۔ عامر زمان عامر کی تحریر ”کاغذی رشتے“ رشتوں کے لحاظ سے اچھی تھی۔ خوامخواہ ربط بنائی گئی آخر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ پلیز قریشی صاحب میرا پیغام ساحل ابرو تک ضرور پہنچانا اور خط پورے کا پورا شائع کرنا ورنہ بھروسہ چلا جائے گا بیٹیوں کا باپ سے، اللہ پاک نے آپ کو بہت عزت دی ہے اس عزت آبرو کو اپنے سامنے رکھ کر اس بیٹی کا خط شائع کرنا والسلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! 23 اگست 2015ء کی ایک نسبتاً گرم دوپہر کو ماہ اکتوبر کا پرچہ ملا اس بار سرورق بہترین ہے اور سرورق کے نیچے لکھا ہوا عید الاضحی مبارک آپ کے جذبات اور احساسات ہم قارئین تک پہنچانے کا باعث ہے خدا آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور غموں کی دھوپ سے ہمیشہ دور رکھے آمین ثم آمین۔ سب سے پہلے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی بہت خوب صورت نقشہ کھینچا ہے اس بندے نے جو ہمارے محلے، گلیوں اور بازاروں کی صفائی کرتا ہماری سیاست میں بھی بڑا گند ہے۔ اسے صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فرض ہمارا بھی ہے ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے بلدیاتی انتخابات میں جو سکہ بند لوگ زور آزمائی کررہے ہیں ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے ہمارے پاس موقع بھی ہے وقت بھی ہے ان میں مخلص اور اہل لوگوں کو منتخب کریں اب بڑھتے ہیں محفل کی طرف ممتاز احمد صاحب خوش آمدید آپ کا خط خوب صورت بھی ہے مدلل بھی ہے اور واقعی انعام کے قابل ہے آپ آتے رہیے گا۔ میری کہانی تیسر اراستہ پسند کرنے پر تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں ظہور عالم بھائی جو مشورہ ایڈیٹر صاحب نے دیا ہے اس پر عمل کریں دھیرج سے کام لیں اگر آپ کا کلام اچھا ہے تو ضرور شائع ہوگا۔ بھائی محمد اسلم جاوید بڑی لمبی جدائی دی آپ نے ہم تو آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں ریاض حسین قمر بھائی کیا حال چال ہیں۔ آپ اچھے ہیں اس لیے دوسروں کو بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ آپ کے خلوص کی میں دل سے قدر کرتا ہوں میری کہانی آپ کو اچھی لگی بہت شکریہ خط تو میں ہر ماہ لکھنے کی آرزو کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی رسالہ پڑھنے کا ٹائم نہیں ملتا، اس لیے تبصرہ رہ جاتا ہے۔ عامر زمان عامر آپ کا خط بھی اچھا ہے۔ عبدالغفار عابد بھائی آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں واقعی میں اس بات پر آپ سے متفق ہوں کہ تنقید برائے تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے اس طرح لکھنے والے کی تحریر میں بہتری آتی ہے نکھار پیدا ہوتا ہے جبکہ لکھاری کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ یا تو لکھنا چھوڑ بیٹھتا ہے یا پہلے سے بھی برا لکھنے لگتا ہے عمر فاروق ارشد بھائی آپ کی آمد سے دل خوش ہوجاتا ہے۔ آپ سالانہ پرچہ لگوالیں جھنجٹ سے بچ جائیں گے۔ میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ، مہربانی۔ پرویز احمد دولو بھائی کیسے ہو، سدا خوش رہو تبصرہ اچھا ہے میں نے جو بات آپ سے پوچھی ہے انہیں صفحات پر جواب کا منتظر رہوں گا۔ فلک شیر ملک صاحب آپ کو بھی میری کہانی پسند آئی جس کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور ہے اچھے لوگوں سے یہ دنیا کبھی بھی خالی نہیں رہی۔ یہی بات میں اپنی تحریروں میں اجاگر کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ بہرحال حوصلہ افزائی کرنے کا ایک بار پھر شکریہ۔ اشفاق شاہین آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ میری کہانی آپ کو اچھی لگی لیکن اس میں دلچسپی اور سسپنس کا فقدان تھا آپ کے خیالات سرآنکھوں پر صرف اتنی عرض ہے کہ یہ ایک سادہ کہانی تھی اس میں زیادہ رنگ آمیزی نہیں ہوسکتی تھی بہرحال آئندہ اور بھی خیال رکھوں گا ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب حسب معمول آپ کا خط اور تبصرہ سیدھا دل میں اتر گیا میری کہانی تیسر اراستہ پسند کرنے کا شکریہ۔ امید ہے آپ کا تعاون ہمیشہ شامل حال رہے گا۔ ناز سلوش ذشے بہن مایوسی گناہ ہے انسان کو کسی حال میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے خدا بزرگ و برتر آپ کی مشکلیں آسان کرے ننھی پری کو اپنے بھائی کی طرف سے بہت بہت پیار دینا۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف فاروق انجم ساحلی کی تحریر تعاقب خوب ہے۔ جب مدعی ہی مجرم نکلے تو...... اس بار خلیل جبار قاتل حسینہ لے کر آئے۔ حسینہ ویسے ہی قاتل ہوتی ہے چہ جائیکہ وہ چڑیل ہو۔ بہرحال اس کہانی میں ایک سبق پوشیدہ ہے جو اچھا لگا قلندر ذات بھی اچھی جارہی ہے عمر فاروق ارشد کی کہانی عشق نامرادان کے خطوط کی طرح مختلف رنگ لیے ہوئے ہے۔ بہت خوب آپ اچھا لکھتے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے جاوید احمد صدیقی صاحب کی کہانی واپسی پڑھی۔ بھائی اچھا موضوع چنا آپ نے اس طرح کے کاموں میں اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ تحریر سبق حاصل کرنے والوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہے آپ نے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ اسرار احمد کی جوابی حملہ بھی کیا خوب کہانی ہے ہر بندہ مختلف نظر آنے کے لیے مختلف بھیس بدلتا ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا میں کم

ازکم کوئی تو ایسا ہو، جو اسے پسند کرے پیار کے دو بول بولے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں گویا ایک گلدستہ سا پرویا گیا ہے نئے افق کی صورت میں اب آخر میں بات ہو جائے باقی سلسلوں کی ذوق آگہی میں شعور واقعی انعام کے قابل ہے۔ بشیر احمد بھٹی کی خوشخبری بھی قابل تحسین ہے باتوں سے خوشبو آئے انجم فاروق ساحلی کا عمدہ انتخابات ہے جاوید احمد صدیقی کا انتخاب بھی قابل تعریف ہے اس بار میرا انتخاب شامل اشاعت ہے لیکن میرے شہر کا نام حسن ابدال کی بجائے واہ کینٹ لکھ دیا گیا ہے۔ اب اجازت۔ والسلام۔

حافظہ لائبہ قریشی...... فورٹ عباس۔ سلام مسنون آپ کے ماہنامہ میں پہلی بار حاضر ہوئی ہوں میں لکھنے لکھانے کے متعلق زیادہ نہیں جانتی اور نہ ہی شوق ہے البتہ پڑھنے کا جنون ہے حاضری کی وجہ ایک نہایت ہی حساس معاملہ ہے، جس پر آپ نے نجانے کیوں غور نہیں کیا۔ اس ماہ ظہور احمد صائم صاحب کا خط شائع ہوا تھا جو بہت دھواں دھار تھا۔ یہ خط پڑھنے کے بعد مجھے شدت سے لگا کہ انداز تحریر محترم عمر فاروق ارشد کا ہے کیونکہ میں انہیں عرصہ دس سال سے پڑھ رہی ہوں مختلف جرائد میں عمر فاروق کے تبصرے اور دیگر نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے میں نے جب تحقیق کا دائرہ وسیع کیا تو حیرت انگیز معلومات ملیں وہ یہ کہ ظہور احمد صائم صاحب عمر فاروق ارشد کے قریبی دوست ہیں اور اسی دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ عمر فاروق ارشد سے نہ صرف تبصرے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کراتے ہیں بلکہ شاعری میں بھی یہی معاملہ اختیار کیے ہوئے ہیں مجھے محترم عمر فاروق ارشد پر بھی بہت افسوس ہے کہ وہ اس قدر گری ہوئی حرکت کے مرتکب ہوئے ہیں میں محترم ایڈیٹر صاحب کو یقین دلاتی ہوں کہ میری معلومات اور تحقیق کے ذرائع بہت ہی مستند اور قابل اعتبار ہیں میں یہ مطالبہ کرتی ہوں کہ ظہور احمد صائم صاحب کو ہمیشہ کیلئے نئے افق سے بلیک لسٹ کیا جائے اور عمر صاحب کو اس غیر اخلاقی حرکت میں معاون بننے پر شوکاز نوٹس جاری کیا جائے اور آئندہ کے لیے خبردار کیا جائے۔ والسلام۔

☆لائبہ جی خط لکھنے کا شکریہ، کسی اور سے تبصرے لکھوانا یا شاعری میں اصلاح لینا بری بات نہیں، لیکن یہ اخلاق اور کردار کی بات ہے کہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔۔ پلیز غصہ تھوک دیں اور معاف کر دیں ہاں آپ نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ نئے افق آپ کو کیسا لگا۔

ممتاز احمد...... سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ محترم القام جناب مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی، طاہر قریشی السلام علیکم، اپنے خط کی ابتدا اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ کریم ہم سب پر اپنے لطف و کرم میں اضافہ فرمائے آمین۔ سب سے پہلے میں آپ کا تہہ دل سے بے انتہا ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز انسان کو گفتگو میں نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ میرے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ پر مبنی خط کو انعام یافتہ قرار دے کر مجھے بہت بڑے اعزاز سے نواز کر میری حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی بہت شکریہ۔ نئے افق کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کیلئے رب کے حضور دعا گو ہوں اللہ کریم نئے افق سے جڑے ہر شخص کو سلامتی کے ساتھ صحت تندرستی جیسی عظیم دولت سے ہمیشہ مالا مال رکھے، آمین۔ گفتگو کے آغاز میں حدیث پاک اور اقرا نے بصارت اور روح کو تازگی بخشی، دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے سیاست دانوں کو فکر انگیز پیغام دیا، بہت خوب...... گفتگو میں ظہور احمد صائم نے نئے افق اور عمران صاحب کو اپنا سمجھ کر خوب شکوے کیے۔ یقیناً شکوے اپنوں سے ہی کیے جاتے ہیں تو گزارش ہے کہ ظہور صاحب کے تمام گلے شکوے دور کیے جائیں ریاض حسین قمر صاحب نے اچھا خط لکھا اور اپنے قیمتی خیالات سے گفتگو کو زینت بخشی، عبدالغفار عابد اور پرویز احمد دولو صاحبان اپنے تفصیلی خطوط اور سیر حاصل تبصروں سے گفتگو کی رونق کو بڑھا رہے تھے۔ ریاض بٹ صاحب کا خط بہت شاندار تھا۔ اشفاق شاہین صاحب کا تبصرہ جاندار تھا۔ اشفاق صاحب دریا کو کوزے میں بند کرنا خوب جانتے ہیں ابن مقبول جاوید احمد صدیقی نے تفصیلاً اور عمدہ خط لکھا۔ ناز سلوش خوش آمدید و یلکم آپ کی آمد سے محفل کی رونق دوبالا ہو گئی

ہے بھائی عامر زمان عامر صاحب سلام دو ماہ پہلے شائع ہونے والا آپ کا افسانہ ”کاغذی رشتے“ دل کو چھو گیا۔ اس بار شمارہ معمولی تاخیر سے ملا پھر عید الاضحیٰ کی آمد آمد تھی تو اس وجہ سے شمارہ زیر مطالعہ ہے مکمل پڑھ نہیں سکا تو جتنا پڑھا اس پر کچھ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ”خودرو“ زبردست کہانی رہی۔ ”تعاقب“ واقعی اچھی کہانی تھی۔ خلیل جبار خوب صورت کہانی بعنوان ”قاتل حسینہ“ لے کر آئے۔ ”عشق نامراد“ ہلکے پھلکے مزاح سے مزین بہترین کہانی تھی بہت پسند آئی۔ ”نیکی کا دریا“ ریاض بٹ حسب سابق ایک عمدہ اور لاجواب کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ کہانی اچھی تھی۔ نسیم سکینہ صدف کا افسانہ ”روبرو“ ایک مختصر اور اچھا افسانہ تھا۔ ذوق آگہی میں سب دوستوں کی تحریریں بہت شاندار تھیں۔ اشفاق شاہین کی انعام یافتہ تحریر شعور بہت زبردست رہی۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ خوشبوئے سخن میں تمام شعرا کا عمدہ کلام نئے افق کے صفحات کو اپنی خوشبو سے مہکا رہا تھا۔ اب اپنے خط کا اختتام کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ چند دنوں تک ایک کہانی ارسال کر دوں گا۔ اگلے ماہ ان شاء اللہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔ اللہ نگہبان۔

منشی محمد عزیز منے ...... وہاڑی ۔ برادر محترم السلام علیکم! آپ سے اگرچہ یہ میری پہلی قلمی ملاقات ہے (یا آپ اسے آدھی ملاقات کہہ لیں) لیکن نئے افق میرے لیے نیا نہیں ہے۔ صرف نئے افق نہیں بلکہ آنچل سے بھی تھوڑی بہت سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔ لیکن سچ پوچھیں تو عامر زمان عامر کے بعد بھائی ممتاز احمد آف سرگودھا کا بے پایاں خلوص اور بے لوث محبت مجھے اس محفل تک کھینچ لائی ہے۔ ارے واہ، شاء اللہ یہاں تو بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، عامر زمان، مہر پرویز احمد دولو، اشفاق شاہین کے علاوہ لمبے سے نام والے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحبان سب موجود ہیں۔ سبھی کو ہمارا عاجزانہ سلام پہنچے ان کے علاوہ جن دوستوں سے شناسائی نہیں ہے۔ ان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے۔ اکتوبر کا نئے افق 23 ستمبر کو ملا سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی کی دستک پر لبیک کہتے ہوئے ان کی ناصحانہ گفتگو سے مستفید ہوئے۔ گفتگو کے آغاز میں عمران بھائی نے قارئین سے بہت اچھی بات کہی ہے۔ دوستو! تبصرہ کہانیوں پر ہونا چاہیے لکھاریوں پر نہیں اور تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے نہ کہ تنقید برائے تنقید۔ نفرتوں کے اس دور میں ہم سب کو چاہیے کہ ہم خلوص اور محبت کو بڑھاوا دیں۔ ممتاز بھائی انعام کیلئے مبارک باد قبول ہو۔ ظہور احمد صائم داد دیتے ہیں آپ کی ہمت کی آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بس حوصلہ نہیں ہارنا، ریحانہ عامر، ہماری چھوٹی بھابی کو آپ نے ریحان عامر بنا دیا۔ بھائی یہ نقصان ہمیں قبول نہیں اور شاباش گڑیا جی اپنے میاں کے ساتھ یونہی اپنا قلم جاری وساری رکھنا۔ عامر میاں، آپ کے کاغذی رشتے تو پڑھ لیے۔ اب نئی تحریروں کا انتظار ہے بقر عید تو خیر سے گزر گئی۔ آپ کی کتاب کن مراحل میں ہے، دیگر دوستوں نے بھی خوب لکھا میرپور آزاد کشمیر سے ناز سلوش ذشے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے اور آپ کی ننھی پری کو دنیا کے کبھی دکھوں، پریشانیوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ اقرا میں قرآن مجید کی تعلیمات سے آگاہی ہوئی۔ انجم فاروق ساحلی کی تحریر تعاقب کا انجام حیرت انگیز تھا۔ یقین نہیں ہوا کہ کوئی قاتل اس حد تک بھی چالاکی کر سکتا ہے کہ اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے خود ہی جال بچھا دیا۔ قاتل حسینہ ایک چڑیل کی کہانی تھی جو سو انسانوں کا خون پی کر ہمیشہ کیلئے امر ہونا چاہتی تھی لیکن اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے اس کو انجام تک پہنچا دیا۔ صد شکر، عشق نامراد، عمر فاروق ارشد کی تحریر پڑھنے کے دوران اپنی ہنسی روک نہیں پایا۔ ویسے اس بات کا اندازہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب فضلو تہہ شدہ خط لے کر نیکی کے پاس گیا تھا۔ بہر حال ٹونی اور فضلو بے چارے دونوں ہی عاشق نامراد نکلے اور وہ زبردستی کا فراڈیا پیر حیرت خان بازی لے گیا۔ اس تحریر میں عمر فاروق صاحب نے آج کے نقلی پیروں کا بڑی خوب صورتی سے پردہ فاش کیا ہے۔ محمد سلیم اختر قلم کی دنیا میں ایک جانا پہچانا مستند اور معروف نام ہے۔ مختلف رسائل وڈائجسٹوں میں ان کی تحریر پڑھتا رہتا ہوں ان کی کہانیوں کا مجموعہ ”یہ دیا بجھنے نہ پائے“ بھی میرے پاس موجود ہے۔ بہر کیف روپ بہروپ ان کی ایک

بہترین تحریر ہے۔ مختصر فن پاروں میں جاوید احمد صدیقی کی ''واپسی'' ساحل ابڑو کی ٹوٹا ہوا تارا اور نسیم سکینہ صدف کی روبرو پڑھ چکا ہوں۔ ان میں مجھے تو ٹوٹا ہوا تارا بہترین لگی ہے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن بھی بہترین سلسلے ہیں۔ اگر آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو ان شاء اللہ لکھنے لکھانے کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ بلکہ کوشش کروں گا کہ سالانہ خریدار بن جاؤں، خط کے ساتھ کترنیں اور اپنی ایک غزل بھی حاضر خدمت ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

☆ منشی جی خوش آمدید، آپ کی شمولیت اچھی لگی، کہانیاں آپ کو پسند آئیں شکریہ آپ کی آرا ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ عزیز ساتھیوں اکتوبر کا شمارہ 18 اکتوبر کو اس وقت ملا جب فیکٹری میں کلوزنگ ہو رہی تھی اور عید کی مصروفیات بھی عروج پر تھیں۔ اس صورت حال میں پرچے کا مطالعہ اور پھر محفل گفتگو میں آپ لوگوں سے ہمکلام ہونا کافی مشکل مرحلہ تھا جب ارادے پختہ اور حوصلے جواں ہوں تو ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے اسی کی زندہ مثال میں اس وقت آپ کے درمیان ہوں اکتوبر کی محفل گفتگو میں بندہ ناچیز کے علاوہ 12 دیگر دوستوں نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ان میں صرف محترم ممتاز احمد صاحب کو میرے تبصرے سے اختلاف تھا شاید وہ میرے تبصرے کو غور سے نہیں پڑھ سکے اگر غور فرماتے تو وہ بھی ان 11 میں شامل ہوتے جو میرے موقف کی تائید کر رہے تھے۔ ممتاز بھائی میں نے کب کہا اور لکھا کہ سچ کو چھپا لیا جائے۔ میں نے تو مشتاق احمد قریشی سمیت نئے افق کے تمام لکھاری اور قارئین کو اپنی ناقص رائے دی تھی کہ نئے افق ہم سب کا مشترکہ خوشیوں بھرا آشیانہ ہے اس آشیانہ کو سیاست کی نفرت سے دور رکھا جائے۔ ہر کوئی ان کی کرپشن سے واقف ہے 980 ارب کی کرپشن میں تقریباً تمام سیاستدان شامل ہیں۔ روزانہ اخبارات اور ٹی وی ان کی کرپشن کی داستانیں چیخ چیخ کر بیان کر رہے ہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کسی کا نام لے کر اس کو ٹارگٹ نہ کیا جائے تاکہ ہم میں سے کسی کا دل نہ دکھے۔ اس بار بھی تو قریشی بھیا نے ان سیاستدانوں پر تنقید کی مگر کسی کا نام لیے بغیر یہی میں چاہتا ہوں اس آشیانے کی عزت آبرو بھی اسی میں ہے۔ روپ بہروپ اور قلندر ذات میں محترم سلیم اختر اور امجد جاوید بہت خوب صورت انداز میں ہمارے سیاستدانوں کا نام ظاہر کیے بغیر ان کی مفاد پرستیاں بیان کر رہے ہیں باہر کے ملکوں کی ایجنسیوں کے لیے کام کرنے والے وڈیروں اور جاگیرداروں کو ان سیاستدانوں کی مکمل سپورٹ حاصل ہے۔ نام لے کر سچ لکھنا ہے تو اس کے لیے اور پلیٹ فارم بہت ہیں خدارا اس ہاؤس کو سیاست کے گند سے پاک رکھا جائے۔ اس گھر میں تو ہم سب خوشیاں بانٹنے اور محبتیں تقسیم کرتے ہیں۔ ملک، معاشرے اور ریاستیں کچھ اصولوں اور ضابطوں کی محتاج ہوتی ہیں۔ انہیں نظر انداز کر دیا جائے تو اول خرابی اور پھر تباہی ہوتی ہے آغاز وہاں سے ہوتا ہے جب انسان خود کو عقل کل سمجھتے ہوئے الہامی قوانین معطل کر دے نئے افق کے بھی کچھ اصول اور ضابطے ہیں ان کی قدر کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ریاض بٹ کی تحریر ''نیکی کا دیا'' انسان کی ذاتی مفاد پرستیاں بیان کر رہی تھی۔ عظیم انسانوں کی یہ خوبیاں ہوتی ہیں کہ وہ اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگی جیتے ہیں کیونکہ انسانیت کو زندہ رکھنے کے لیے یہی عمل کارآمد ہے اسی عمل سے آخرت میں کامیابی نصیب ہوگی۔ انجم فاروق ساحلی اپنی تحریر ''تعاقب'' میں انسانی بے بسی کی نشاندہی کر رہے تھے۔ خلیل جبار کی کہانی بھی ہمارے لیے سبق آموز تحریر تھی۔ اس کے علاوہ باقی تحریریں بھی غور طلب تھیں۔ سسٹر ناز سلوش ذشے اس زندگی کا دوسرا نام امتحان گاہ ہے بہت خوب کہ آپ مایوسی کو ترک کر کے دوبارہ اس امید کے ساتھ جینا چاہتی ہیں کہ شاید اس جہاں میں کسی کے پاس میرے حصے کی خوشیاں ہوں سسٹر کوشش کرنے سے حالات کو اپنے حق میں بدلا جا سکتا ہے ان شاء اللہ آپ کے حصے کی خوشیاں آپ کو ضرور ملیں گی۔ جن دوستوں نے میری رائے سے اتفاق کیا ان کا شکریہ جنہوں نے اختلاف کیا ان کے لیے بے شمار دعائیں۔ سچے رشتے خوشیوں میں زینت اور پریشانیوں میں سہارا ہوتے ہیں آپ سب کی خوشیوں کا طلبگار۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ...... **راولپنڈی۔** اچھے عمران جی و اقبال بھٹی السلام علیکم! حسب معمول لشکارے مارتا پرکشش ٹائٹل والا میگزین مل گیا تھا عید کے بعد حاضر خدمت ہوں۔ ویسے ٹائٹل یہ بھی اور پچھلے بھی کسی قاری کو خوفناک لگے میرا خیال ہے انہوں نے بدذوقی کی انتہا کردی ہے۔ بھئی اب تو میچور ہو جاؤ۔ نئے سیٹ آپ کے ساتھ آپ کی کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔ جبھی تو کہنہ مشق اور مشہور زمانہ رائٹر جناب راجپوت اقبال احمد بھی تشریف لے آئے۔ یہی میگزین کی تبدیلی اور پھر پسندیدگی کی دلیل ہے۔ دستک کے حوالے سے صرف یہ بات ہی کروں گا کہ کاش یہ قوم کے خادم اپنے اندر صرف دلدار مسیح جیسی ہی خوبیاں اجاگر کرلیں تو بہت سے کام عوام کے ہوتے نظر آئیں۔ ہم کو نہ صرف بحیثیت قسم سدھرنا ہے بلکہ ایک ایک وجود کو بے انتہا تربیت، صبر، تحمل، بھائی چارہ اور نیک ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ گفتگو میں حدیث مبارکہ کہ کاش آج کے اکڑ خان، اپنے آپ میں ڈوبے تکبر کے پہاڑ تلے دبے لوگ ہوش میں آجائیں کاش۔ گفتگو میں سب سے پہلے یہ ہماری بیٹی ناز سلوش ڈشے کا خط پڑھا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا کہ واہ ری قسمت بیٹی پری کی وجہ سے بھی اور اللہ اور رسول کیلئے بھی جینے کی تمنا تم کرتی رہو، ہم لاکھوں قارئین کی مخلص، خاص اور درد میں ڈوبی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ قسمت کا لکھا تو کیا مٹانا مگر متزلزل نہ ہونے والے حوصلے سے تو بڑے بڑے فرعون ڈوب گئے۔ بڑی بڑی کٹھائیں سلجھالی گئیں۔ تمام روداد تو سر سے پیر تک جھنجوڑ دیتی ہے۔ صبر اور حوصلہ اور نماز سے مدد لو، خاص دعائیں ہماری تمہارے ساتھ ہیں ایک اللہ کے برگزیدہ انسان کا دیا ہوا وظیفہ حاضر ہے آزمودہ ہے اور ہزاروں لوگ فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ (رب موسیٰ و رب کلیم بسم اللہ الرحمان الرحیم) اٹھتے بیٹھے درود شریف پڑھ کر سیکڑوں میں ہزاروں میں پڑھتی ہیں۔ اللہ کے کلام کا معجزہ دیکھیں، ہاں یاد کرنے کا شکریہ اور بیٹی کی جگہ ہو ہمیشہ دعائیں دیں گے۔ آخر میں مدیر کا لکھا فقرہ ہی لکھوں گا کہ "آپ جیسی حالات کی نبض شناس مصنفہ حالات سے کیونکر ہار گئی۔" ریاض بٹ جی واہ واہ اس دفعہ کی کہانی تو پچھلی تمام تحریروں پر سبقت لے گئی۔ بہترین اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر ماہ تشریف لایا کریں یاد کرنے کا شکریہ، پرویز احمد دولو بھئی تبصرہ خوب تر تھا اور یہ ریاض بٹ جی کی بات کا جواب بھی دے دیں۔ ان کی واقفیت تو نکل آئی۔ عمر ارشد فاروق اچھا تبصرہ تھا اور کہانی آپ کی خوب تر تھی۔ ریاض حسین قمر جی لیجیے خوشبوئے سخن میں آپ کی حاضری لگ گئی۔ تبصرہ زبردست تھا آپ کی شاعری ہرگز بے وزن یا قافیہ اور ردیف کے بغیر ہرگز ہرگز نہیں ہوتی۔ ہاں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے میرا خیال ہے کہ مدیر محترم کا یہ کہنا کہ آپ سے تو ہمارا دل کا رشتہ ہے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے ممتاز احمد صاحب مبارک ہو انعام کی اور آیا کریں جناب۔ کہانیوں میں راجپوت اقبال احمد کی کہانی خود رو تو کتنے دن کے بعد بھی دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ بہت ہی بہتر اور کہنہ مشق ادیب تو ایسی ہی انمٹ اور نہ بھولنے والی کہانی لایا کرتے ہیں۔ ہمارے مدیر تو ان کو ہر ماہ قارئین کے لیے ضرور لایا کریں۔ منتخب نمک پاروں میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ سوائے ابڑو صاحب کے کہ وہ بہت زیادہ گہرائی میں لکھتے ہیں۔ میری کہانی شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ عوامی فیصلہ بہترین رہی۔ ضرب عضب تو غضب کی کہانی رہی۔ بہت ہی عمدہ اور ناقابل فراموش۔ روپ بہروپ پہلا سلسلہ جو دلچسپی سے زیر مطالعہ رہا۔ زبردست اور قابل تعریف۔ رشتہ خوں اچھا رہا۔ عشق نامراد درمیانہ مگر اچھی کاوش، قاتل حسینہ تو خلیل جبار نے بالکل ہی بے دلی اور بغیر کسی محنت سے لکھی ہے۔ انجم فاروق ساحلی بھی بڑی اچھی اور توجہ والی کہانی لائے ہیں ویل ڈن۔ ذوق آگہی میں اشفاق شاہین کو مبارک باد، میرا تعلیم شائع کرنے کا شکریہ اور خوشبوئے سخن میں میری نعتیہ ہائیکو شائع ہونے پر اللہ کا بے حد شکر گزار ہوں اور نوشین اقبال کا ممنون، اسی طرح ماں پر آزاد نظم کا شکریہ، امید ہے پسند آئیں گی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

یہ کائنات اور اس کا سارا نظام ایک ایسی مضبوط دلیل ہے کہ جس کی شہادت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کائنات جس کی تخلیق کا دعویٰ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کوئی دوسری قوت نہیں کرسکتی۔ انسان غور کرے تو اس ذاتِ عالی کو تسلیم کرنے اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی راستہ کوئی چارہ نہیں۔ سورہ لقمان کی اس آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ تخلیق کائنات اور اس دنیا کے بارے میں تفصیل سے آگاہ فرمارہا ہے تاکہ انسان اس پر غور کرے اور سوچے سمجھے کہ ذات باری تعالیٰ کیسی عظیم الشان خالق و مالک ہستی ہے۔

ترجمہ:۔اُسی نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا ہے، تم انہیں دیکھ رہے ہو اور اُس نے زمین میں پہاڑوں کو جما دیا ہے تاکہ وہ تمہیں جنبش نہ دے سکے، اور ہر طرح کے جاندار زمین میں پھیلا دیئے، اور اُس نے آسمان سے پانی برسا کر زمین میں ہر قسم کے نفس کے جوڑے اگا دیئے۔ (القمان۔۱۰)

تفسیر:۔آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کا بھرپور اظہار ہے، اللہ کی حکمت وتدبر اور دانائی کا اظہار ہے، اللہ تبارک نے صرف انسان کو ہی پیدا نہیں کیا بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کا وہی خالق ہے کائنات کا یہ سارا عظیم ترین نظام جس میں وسیع تر بے کنار آسمان جس کے نیچے سینکڑوں کہکشائیں محو رقص ہیں، ان ہی کہکشاؤں کی ایک کہکشاں کا ایک سیارہ یہ ہماری زمین ہے۔ یہ دیگر سیاروں کی نسبت بہت مختصر سی ہے لیکن یہ بھی انسان کے لئے وسیع اور طویل وعریض ہے کہ انسان اپنی مختصر عمر میں اس کی پوری طرح سیر نہیں کرسکتا۔ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ ساری کائنات کس قدر وسعت لئے ہوئے ہے، کیسے کیسے عجائباتِ عالم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اللہ نے اس زمین کی گردش کو متوازن کرنے کے لئے ہی اس زمین پر پہاڑوں کو جمایا ہے تاکہ انسان سہولت سے رہ سکیں۔ اس کائنات کے عجائبات میں زمین ایک حیرت انگیز عجوبہ ہے۔ اس زمین کے اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایک رنگا رنگ زندگی کو پھیلا دیا ہے۔ اللہ کی تمام مخلوقات جو جاندار ہیں ان کی حیات کے راز پر بھی اللہ نے ایسے پردے ڈال رکھے ہیں کہ اسے کوئی نہیں پاسکا، اس کی

بوقلمونی اور رنگارنگی تو بڑی چیز ہے' انسان تو حیات کی سادہ ترین صورت کو بھی نہیں پا سکا ہے' اللہ نے لاتعداد اقسام کے چرند' پرند اور دیگر جانور پیدا فرمائے ہیں۔ انسان ان کی اقسام سے بھی پوری طرح آشنا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے جس نے قسم قسم کی حیات اور جاندار پیدا کیے ہیں اور عمدہ عمدہ چیزیں پیدا کر اور اگائی ہیں۔ آسمانوں سے پانی برسا کر ان کی حیات و پرورش کا بندوبست کیا ہے' بارش کے بعد۔ مین سے مختلف اقسام اور شکل وصورت کی نباتات اگاتا' اور ایک عجیب نظام کے تحت ایک چھوٹے سے بیج سے پودا' پھول اور پھر درخت بنا دیتا ہے۔ اور پھولوں کے اندر مختلف رنگ بھر دیتا ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے ایک نمو اور افزائش کا ایک عجیب وغریب نظام اپنی تمام مخلوقات میں رکھ دیا ہے ان میں نر مادہ تخلیق فرما کر ان کی نسل وافزائش کا خود کار نظام قائم کر دیا ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کا تو لیدی نظام واضح ہے' ایسے ہی نباتات میں بھی یہ نظام موجود ہے' اسکی تصریح قرآن حکیم میں کی گئی ہے اور اس آیت میں بھی موجود ہے۔ یہ سب کچھ انسان کو خالقِ کائنات کی عظیم تو توں کا ادراک اور فہم عطا کرنے کے لئے ہے تاکہ وہ ان پر غور وفکر کرے اور سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کتنی قوت واقتدار والی ہے' کتنے اختیار وحکمت والی ہے' انسان جب اللہ کے احکام وہدایت پر فکر کرتا ہے تو اس کا ایمان پختہ اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اکثر لوگ بحث مباحثہ کرتے ہیں لیکن دلائل فطرتِ الٰہی کو نہیں سمجھتے اور اس عظیم ترین کائنات کے ہوتے ہوئے بھی عقیدہ توحید پر یقین نہیں رکھتے' حالانکہ کائنات کا یہ سارا نظام اور اس کا ایک ایک ذرہ چیخ چیخ کر اللہ کی وحدانیت کا اعلان کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اللہ اس کائنات کا خالق ہونے کے ناطے اس کل کائنات کا تنہا مالک ومختار ہے۔ اس حصے کا بھی جسے اس نے اپنی قدرت واختیار سے انسانوں کے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس حصے کا بھی جسے انسانوں کے لیے مسخر نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس زمین وآسمان اور اس کے درمیان موجود ساری مخلوق کے لیے غنی ہے وہ تو اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ اس کا علم بے پناہ بے حد وحساب ہے اس کی قدرت بے انتہا ہے' اس کی مشیت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے وہ اپنی تمام مخلوقات پر قادرِ مطلق ہے۔ تمام اختیارات اسی کو حاصل ہیں جن میں کوئی دوسرا کسی طرح نہ شریک ہے نہ ہو سکتا ہے۔

❖

بے نام چہرہ

ناصر بیگ چغتائی

مرزا ناصر بیگ چغتائی آج کل صحافت کے میدان میں این بی سی کے نام سے مشہور ہیں، انتہائی سنجیدہ اور بردبار شخصیت کے مالک مانے جاتے ہیں اور ہیں بھی لیکن ہم انہیں اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ کھلنڈرے نوجوان اور یونیورسٹی میں بائیں بازو (ترقی پسند) کے سرگرم کارکن کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انہوں نے صحافت کا آغاز روزنامہ مساوات کراچی سے کیا۔ اسی دوران موصوف ماہ نامہ نئے افق اور ماہنامہ نیا رخ سے وابستہ ہوئے اور محترم اظہر کلیم کی سرپرستی میں بڑی شاہکار کہانیاں قارئین کو دیں۔ ان کے لکھنے کا سلسلہ 1988ء تک جاری رہا۔ اس دوران وہ روزنامہ امن چھوڑ کر جب جنگ، جیو اور پھر اب تک سے وابستہ ہوئے تو لکھنے لکھانے کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔آج کل آپ بول چینل سے وابستہ ہیں مگر ہم آج تک یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ آپ صحافی اچھے ہیں یا لکھاری۔ اس ماہ انہوں نے بے حد اصرار پر ایک خوب صورت تحریر انگریزی ناول کا ترجمہ عنایت کیا ہے اسے پڑھ کر آپ خود کہہ اٹھیں گے الیکٹرانک میڈیا نے ہم سے کتنا خوب صورت لکھاری چھین لیا ہے۔

اک حسینہ کا فسانہ پر درد، اس نے بچپن میں اپنے والدین کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔

میری زندگی کے چیستان کا آخری حصہ بالآخر سامنے آ ہی گیا۔ ایک عرصے سے اس چہرے کے چھپے ہوئے نقوش بالکل واضح ہو چکے ہیں۔ وہ چہرہ اب مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے میرے خدا...... میری مدد کر...... مجھے حوصلہ دے اس کا ادراک ہونے سے کتنا دکھ ہوا ہے۔ یہ دکھ، یہ غم، یہ کسک اور یہ کرب شعور کے کسی دور افتادہ گوشے میں نقاب اوڑھ کر چھپ چکا تھا لیکن اس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتی اور اب یہ دکھ، یہ کرب اور یہ غم پوری شدت سے حملہ آور ہوا ہے۔ معمے کے آخری خانے کو کامیابی سے بھرنے کے بعد جس طمانیت اور فتح مندی کا احساس ہوتا ہے معمہ حل کرنے کے بعد بھی میں اس سے محروم ہوں اور اس کی جگہ چبھنے والے غم، نفرت، بے یقینی اور دیوانگی اور جنوں نے لے لی ہے۔

مجھے اپنی کہانی بلکہ اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے اپنے غم کو سپرد قلم کر دینا چاہیے حالانکہ میں جانتی ہوں کہ اس کوشش میں میرا دل خون کے آنسو روئے گا لفظوں کے لیے قلم، روشنائی نہیں بلکہ میرا لہو استعمال کرے گا داغ...... خون کے آنسوؤں سے بھی نہیں دھل سکیں گے اور اس کہانی کو لکھنے کے بعد میں یہی سوچتی رہوں گی کہ آخر مجھے کب سکون ملے گا میں بیس سال کی طویل مدت کے بعد اس چہرے کو پہچان چکی ہوں خدایا اس چہرے کو میرے سامنے سے ہٹا لے۔

میری بصارت چھین لے تاکہ میں اس منحوس چہرے کو نہ دیکھ سکوں اور مجھے اتنا حوصلہ دے کہ میں اس خبیث اور مکروہ شخص کو فراموش کر سکوں۔

......☆☆☆......

''اوہ ڈیئر اب وہاں جانے سے کیا حاصل ہوگا اس جگہ سے کچھ نہیں ملے گا پھر دوسری عمارتیں بھی تو موجود ہیں جن کا سامان برائے فروخت موجود ہے۔''

مس میبل نے اپنی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے ایک بار پھر میری ورسائل روانگی پر اعتراض کیا۔ اس کے لہجے میں میرے لیے محبت اور میرے سفر سے متعلق خدشات تھے وہ سنہرے فریم کی عینک کے شیشے اس طرح صاف کر رہی تھی جیسے وہ کیچڑ سے آلودہ ہوں اور اس کی گود میں بیٹھی ہوئی بلی اولیور کچھ اس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے وہ بھی میرے اس سفر کی افادیت سے متفق نہ ہو۔

''نہیں مس میبل۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے یوں بھی تو وہاں واپس جانا ہے سچ پوچھیں تو میں وہاں بہت عرصے قبل ہی جانے پر غور کر رہی تھی۔ اگر اس مرتبہ نہ گئی تو پھر شاید کبھی نہ جا سکوں۔ میں نہیں چاہتی کہ خیالوں کے سائے اور واہموں کے بھوت زندگی بھر میرا تعاقب کرتے رہیں میں وہاں ضرور جاؤں گی مس میبل ممکن ہے اس طرح میں یہ معلوم کر سکوں کہ اس شب کیا ہوا تھا اور ان دونوں کا قاتل کون ہے؟''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' مس میبل نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس شب کے حقائق معلوم کرنا تمہارا حق ہے۔''

پھر نوادرات کی دکان میں مکمل خاموشی چھا گئی حتیٰ کہ بلی اولیور بھی گم صم سی ہو گئی۔

یہ میری قسمت کا ایک اور کھیل تھا میں نے محض اتفاق سے اٹلانٹا کے ایک اخبار میں اشتہار دیکھا اور فروری کے یخ بستہ موسم کے باوجود فوراً سفر کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مس میبل دمے کی مریض تھیں لہٰذا وہ اس سفر میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے بغیر وہ نوادرات کی اس چھوٹی سی دکان میں تنہا رہ جائیں گی لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی خیالوں

کے سائے اور واہموں کے بھوت زندگی بھر میرا تعاقب کرتے رہے تھے اور یوں بھی مجھے یقین تھا کہ میں واپسی پر دکان کے لیے بہت سے نوادرات لے کر آؤں گی۔

''میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گی مس میبل۔'' میں نے دھیرے سے کہا تو وہ تشویش سے سر ہلاتی ہوئی مجھے دیکھتی رہیں اور بلی اپنے پیر چاٹنے میں مصروف ہو گئی۔

......☆☆☆......

ونڈ شیلڈ پر وائپرز کی کلک کلک اس موسیقی سے ہم آہنگ ہو رہی تھی جو مس میبل کی اسٹیشن ویگن کا ریڈیو نشر کر رہا تھا میں جارجیا کی سنگ سرخ والی پہاڑی سے چھ گھنٹے قبل روانہ ہوئی تھی اور ون شپ کا علاقہ میلوں پیچھے رہ گیا تھا اب میں ورسائل کے قریب اور فلوریڈا کی دلدلوں سے زیادہ دور نہیں تھی حالانکہ گاڑی کی رفتار مسلسل بارش کے باعث سست رہی تھی لیکن اس دوران میں مجھے سوچنے کا کافی وقت مل گیا تھا میں یہ سوچتی رہی تھی کہ آخر میں کیا کر رہی ہوں؟ کیا میں اس جگہ دوبارہ جا سکتی ہوں جہاں سے میرے غموں کا آغاز ہوا تھا اور جہاں میری آنکھوں نے دکھ درد کے جان لیوا مناظر دیکھے تھے؟

بارش نے ایک بار پھر تیز ہو کر پر گولیوں جیسی بوچھار کی تو میں خوفناک خیالوں سے کانپ گئی۔ شاید کانپنے کی وجہ سردی بھی رہی ہو لہٰذا میں نے ہیٹر کھول دیا اور اپنے جسم و دماغ تک گھس آنے والی سرد لہر کو فنا کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ یہ لہر تو میری رگ و پے میں گھس کر خون کے ساتھ مل کر دوڑنے لگی تھی۔ ورسائل بہت قریب تھا اور ورسائل کے قریب ہی وہ عمارت تھی جس کا نام اسٹار پیلس تھا آہ کتنے برس بیت گئے۔

میں اپنے والدین کے ساتھ 1952ء میں کولمبس سے اسٹاف پیلس منتقل ہوئی تھی اور ہم نے دو سال بہت خوشیوں میں گزارے تھے پھر میری ساتویں سالگرہ کی صبح طلوع ہوئی جو رات میں ڈھل گئی تو میں اپنے والدین سے محروم ہو گئی اس شب میری ماما اور پاپا مر گئے اور اب میں بیس بعد بھی میرے ذہن میں اس منحوس رات کی ایک ایک بات محفوظ اور زندہ ہے میں اس خوف کو آج بھی اچھی طرح محسوس کرتی ہوں جو چوبیس سال پہلے اس رات لاشیں دیکھ کر محسوس ہوا تھا۔

لیکن انہوں نے میرے بیان پر یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ انہیں سمجھا سکوں لیکن وہ میری کسی بات پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔ میرے بہت کچھ کہنے کے باوجود انہوں نے سر ہلاتے ہوئے یہی کہا تھا کہ ''یہ ابھی بچی ہے خوف کی شکار ہے۔ بے چاری سے ماں باپ بھی تو جدا ہو گئے ہیں یہ صدمہ اتنی سی بچی کی جان بھی لے سکتا ہے۔''

لیکن میں جانتی تھی کہ میری آنکھوں نے کیا دیکھا تھا اور میں آج بھی وہ منظر فراموش نہیں کر سکی ہوں۔

اب کسی کے خلاف کچھ کرنا فضول ہوگا کیونکہ شاید وہ تمام مہربان اور شفیق پڑوسی مر کھپ گئے ہوں گے جنہوں نے اس سرد رات اور بارش زدہ ماحول میں آخری رسوم میں شرکت نہیں کی۔ ان کی عدم شرکت کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ قصور اس کا تھا اور اس سے ان کی مراد ماں رینا سے تھی وہ یہ بہانہ بنا کر کہ میری ماں ہی ذمہ دار ہے اپنے گھروں کے گرم کمروں میں دبکے رہے مگر ان کی سرگوشیاں جاری رہیں اور وہ ایک دوسرے سے یہ کہتے رہے کہ میری ماں اسی کی مستحق تھی وہ میری ماں اور میرے باپ کی خاطر بھی تدفین میں نہیں آئے۔ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے

تھے اور وہ سب مردہ لوگوں پر بھی بہتان تراشی میں فخر محسوس کر رہے تھے۔

زوردار بارش کے دوران پادری جیکسن نے چند لفظ کہے اور لاشیں پہلو بہ پہلو قبر میں اتار دی گئیں بالکل اسی انداز میں جس انداز میں وہ ایک دوسرے کے قریب کمرے میں پڑی ہوئی۔ ملی تھیں خاک و خون میں غلطاں اور جب میں نے پہلی بار مما کی لاش کی طرف دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے میری ماں کی سرد اور بے جان آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں پھر پاپا نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔

اور میں خوفزدہ ہو کر الماری میں چھپ گئی تھی میں نے اندر سے الماری کا کنڈا بھی چڑھا لیا تھا تا کہ وہ مجھے بھی قتل نہ کر ڈالے میں الماری کے سوراخ سے بار بار جھانکتی رہی مگر منظر تبدیل نہ ہوا میں نے مدد کے لیے چیخنے کی کوشش کی لیکن میری آواز نہیں نکلی میں نے پاپا کو بلانا چاہا لیکن وہ ساکت رہے اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بہت دیر بعد ہیلن نے مجھے تلاش کر لیا تو ان کی گداز اور شفیق گود میں چھپتے ہی مجھے عجیب سا سکون ملنے لگا۔ اس سکون کی وجہ سے میرے آنسو بہنے لگے میں روتی رہی لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا میں انہیں یہ بتا ہی نہیں سکی کہ میری آنکھیں کیا دیکھ چکی ہیں لہٰذا انہوں نے جس بات پر چاہا یقین کر لیا وہ سب بہت مکروہ لوگ تھے۔ انتہائی خبیث اور گنہگار لوگ لیکن ان لوگوں کے ہجوم میں صرف آنٹی ہیلن کی ایک شخصیت ایسی تھی جس نے مجھے سہارا دے رکھا تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے لہٰذا تدفین کے بعد انہوں نے ان مکروہ لوگوں کی بستی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور مجھے ساتھ لے کر جارجیا کے علاقے ایتھنز میں چلی آئیں۔

☆☆☆

شاید میں اسٹار پیلس پہنچ کر یہ اندازہ لگا سکوں کہ وہ بے نام چہرہ کس کا تھا میری سوچ کے دھارے کسی سیلابی نالے کی طرح تند ہونے لگے تھے۔ تب ہی میں نے سائرن سنا عقب نما میں سرخ بتی بھی نظر آ گئی میں نے فوراً اسپیڈومیٹر پر نظر ڈالی اور سمجھ گئی کہ یہ سائرن مجھے روکنے کے لیے بج رہا ہے۔ شاید میں نے سوچوں کے دھارے میں بہتے ہوئے ایکسی لیٹر پر بھی دباؤ بڑھا دیا تھا۔

اسٹیشن ویگن کے رکتے ہی پیٹرول کار تر چھی ہو کر سامنے آ گئی اور ایک پولیس والا اتر کر میری طرف آنے لگا۔

"میں تیز رفتاری پر معذرت خواہ ہوں آفیسر۔" میں نے فوراً کہا۔

"کوئی بات نہیں خاتون، ذرا لائسنس اور کاغذات تو دکھائیں۔"

کاغذات دیتے وقت مجھے صرف یہ خدشہ تھا کہ کاؤنٹی پولیس مجھے تیز رفتاری کے الزام میں جرمانے کا ٹکٹ تھما دے گی اور میں سفر جاری رکھوں گی لیکن مسئلہ اچانک ہی پیچیدہ ہو گیا۔

"اوہ...... آپ کا نام کینڈا اونیل ہے جبکہ گاڑی مس میبل کے نام پر رجسٹرڈ ہے خاتون۔"

میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش مگر وہ بڑا ہٹ دھرم ثابت ہوا۔

"میرے ساتھ اسٹیشن تک چلیں تا کہ ہم یہ تصدیق کر سکیں کہ یہ کار چوری کی نہیں ہے رفتار کم ہی رکھیے یہاں حد رفتار 25 میل ہے۔"

ورسائل یہاں سے کئی میل دور تھا میں جھنجلائے ہوئے انداز میں سست روی سے ڈرائیو کرتی اور سوچتی رہی کہ آج سے بیس سال قبل بھلا یہ کون سوچ سکتا تھا

کہ اونیل کی بیٹی کینڈرا جو پائیں باغ میں اچھلتی کودتی رہتی ہے ایک روز پولیس کی حراست میں ورسائل میں داخل ہوگی اس سوچ کے تحت میں مسکرانے لگی یہ عجیب سی صورت حال تھی۔

پندرہ منٹ بعد ہم ورسائل کے مضافات میں داخل ہوئے تو میرے ذہن سے جالے صاف ہونے لگے۔ یہ علاقہ بیس سال بعد بھی ویسا ہی تھا جیسا میں نے دیکھا تھا تاہم مضافاتی علاقے میں چند ہوٹلوں کا اضافہ ضرور ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ دو سینما گھر بھی نظر آرہے تھے۔ لیکن پہلے کی طرح اب بھی بٹلر اسٹریٹ کا چوک شہر کا مرکزی بازار بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں کونوں پر مختلف بینکوں کی وہی عمارتیں نظر آرہی تھیں جو بیس سال قبل میں نے دیکھی تھیں۔

میری منزل...... کاؤنٹی جیل شاہراہ سے ہٹ کر گوداموں کے عقب میں تمباکو کے کھیتوں سے قدرے پرے تھی تمباکو کے گوداموں کی قطاریں دور دور تک نظر آرہی تھیں مجھے آنٹی ہیلن پھر یاد آنے لگی۔ وہ ایک روز مجھے تمباکو کا نیلام دکھانے کے لیے یہاں لائی تھیں اور حال کی طرح اس وقت بھی یہاں مردوں کا بے ہنگم ہجوم لگا ہوا تھا۔

کاؤنٹی جیل کی قدیم عمارت پر نظر پڑتے ہی مجھے ابتدائی تعلیم کا زمانہ یاد آگیا ہماری ٹیچر مسز پارک ہمیں یہ دکھانے کے لیے جیل لائی تھیں کہ جے فار جیل کا اصل مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میری عمر چھ سال سے زیادہ نہیں تھی اور جب میں نے جیل کے پھاٹک پر نظر ڈالی تو میں بچپن کے زمانے میں واپس چلی گئی پھاٹک کے اوپر ایک بڑے پتھر میں 1883ء کے ہندسے کھدے ہوئے تھے۔

میں گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔ پونے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اسٹیٹ

شک، ایک نفسیاتی بیماری

بے شک، شک کا کوئی علاج نہیں دراصل یہ انسان کا ایک خود ساختہ رویہ ہے جو منفی سوچ و فکر سے پیدا ہو کر اندر ہی اندر نمو پاتے ہوئے ایک تناور درخوت بن جاتا ہے۔ ہم تو جانتے ہی ہیں کہ ایک درخت کو اکھاڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مشکل کا لفظ تو بہت ہی نرم ہے اپنے ارد گرد کبھی دیکھا ہے کسی شخص نے ایک تناور درخت کو اپنے ہاتھوں سے اکھاڑا ہو؟ اسے اکھاڑنے کے لیے ایک کرین جتنا زور طاقت چاہیے، کس انسان کے پاس اتنی طاقت ہے اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ اسے بالکل چھوٹی عمر، یعنی جب اس کی حیثیت ایک خاردار جھاڑی جتنی ہو، اس وقت اسے اپنے جسم سے اکھاڑ دیں، کیا آپ کو معلوم ہے اس بیماری نے کیسے آپ میں جنم لیا، جس طرح آپ کی پیدائش آپ کے ماں، باپ کے ملاپ کی وجہ سے ہوئی بد قسمتی سے انہی یا جن لوگوں نے آپ کی پرورش میں حصہ لیا ان سے آپ کو یہ معتدی مرض لاحق ہوا۔ شک بد اعتمادی کا دوسرا نام ہی تو ہے یہ شک بھائی پر، بہن پر، خاوند پر، بیوی پر، اولاد پر، والدین پر اور ماں باپ پھر یہ منحوس سلسلہ آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا اکثر اوقات انسان ان لوگوں پر شک کر رہا ہوتا ہے جن سے وہ شدید محبت کرتا ہے اللہ کے فرمان کے مطابق حسن ظن سے کام لیتے ہوئے آپ کسی حد تک آہستہ آہستہ اس بیماری سے چھٹکارہ پاسکتے ہیں۔

زین الدین ...... کراچی

ایجنٹ ڈین سے ملنے کے لیے جو وقت مقرر کیا تھا وہ ایک گھنٹے قبل گزر گیا تھا اور مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ کسی کو صرف میری حماقت کے باعث انتظار کرنا پڑ رہا ہوگا۔

ڈین سے فون پر ہی میں نے ساری تفصیلات طے کرلی تھیں اور وہ مجھے اسٹار پیلس میں رکھا ہوا قدیم سامان دکھانے پر رضامند ہوگیا تھا تاکہ میں مس میبل کی دکان کے لیے اس کی بولی لگا سکوں۔

اندر پہنچتے ہی مجھے سیلن کا بوکا احساس ہوا جیل کے بیرونی حصے میں ملگجی تاریکی اور سیلن کی وجہ سے بڑا پر اسرار ماحول تھا اور ایک راہ داری سے اوپر جاتی ہوئی لکڑی کی سیڑھیاں اس ماحول کو مزید پر اسرار بنا رہی تھیں۔ پولیس والا مجھے انہی سیڑھیوں سے پہلی منزل پر لے گیا اور پھر مجھے ایک کمرے پر نیم پلیٹ نظر آئی۔

"شیرف جے ڈی بلیک شپ"

شیرف کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی اور کمرہ کسی مدفن کی طرح ویران تھا فون رکھ کر وہ ہماری طرف پلٹا تو میری یادوں کے سائے چھٹتے چلے گئے اور میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔

اب مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا لوگ اسے شیرف جے ڈی کہا کرتے تھے وہ بہت بدنام تھا لوگ کہتے تھے کہ جیل میں داخل ہونے والی کوئی عورت وہ بوڑھی ہو یا بچی شیرف کی وحشیانہ جبلت سے بچ کر واپس نہیں آ سکی۔

یہ وہی شیرف تھا جس نے پپا اور مما کے مرنے کی تفتیش کی تھی۔

"اس نے بیس برس قبل جو کچھ کہا تھا وہ ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر، میں بھی تمہاری اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ قتل اور پھر خودکشی کا کیس ہے۔"

اس وقت شیرف کے ہاتھ میں وہی خون آلود چاقو تھا جو ہمارے کچن میں گوشت کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ "یہ کیس مزید تفتیش طلب نہیں بوڑھے فریڈ نے خودکشی کر کے خود کو قانون کے چنگل میں آنے سے بچا لیا ہے ڈاکٹر، لیکن اگر یہ عقل مند ہوتا تو خودکشی نہیں بلکہ اپنے دفاع میں قتل کا جواز پیش کر سکتا تھا پورا قصبہ جانتا ہے کہ اس کی بیوی دوسرے مردوں کے ساتھ رنگ ترنگ میں رہتی تھی مگر اس عورت نے کبھی میری طرف توجہ نہیں دی۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا تھا اور میں آہستہ آہستہ رونے لگی تھی اس کے جملے مجھے بہت گندے اور بدبودار لگ رہے تھے

......☆☆☆......

"جے ڈی ہم نے اس نوجوان خاتون کو حد رفتار توڑتے ہوئے پکڑا ہے۔" پولیس والے نے مسکراتے ہوئے کہا؟ "اس کے کاغذات بھی کسی دوسری عورت کے نام پر ہیں۔"

شیرف جے ڈی کچھ دیر تک چیونگم چباتا مجھے گھورتا رہا۔

اس کی عجیب نظروں سے میں بے چین ہونے لگی اور میں نے نظریں جھکا لیں۔ "تم اتنی تیز رفتاری میں کہاں جا رہی تھیں ننھی بلبل۔" اس نے آنکھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں ورسائل ہی آ رہی تھی شیرف۔" میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں ون شپ میں مس میبل کی دکان پر ملازم ہوں سفر کے لیے انہوں نے مجھے اپنی اسٹیشن ویگن دی ہے۔ جس کی تصدیق تم فون پر کر سکتے ہو، ان کا نمبر......!"

"ذرا صبر سے کام لو شہری گلاب۔" اس نے ایک ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے ٹوک دیا پھر دوسرے ہاتھ میں

پکڑے ہوئے سگار کا رخ میری طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم اپنی سڑکوں پر اندھا دھند ڈرائیونگ کی بہر حال اجازت نہیں دے سکتے۔ میں تم پر پچاس ڈالر جرمانہ کرتا ہوں۔''

میں نے فوراً چیک بک نکال لی لیکن اس نے مجھے قلم کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

''نا...... چیک نہیں نقد رقم چاہیے یا پھر۔'' اس مرتبہ سگار کا رخ اوپر کی طرف تھا کوٹھریوں کی طرف۔

''لیکن میرے پاس اتنی نقد رقم نہیں۔'' میرے اس جواب پر اس کی سور جیسی ننھی ننھی آنکھیں میرے وجود کو ٹٹولنے لگیں میں خوفزدہ ہو گئی میں سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے مجھے اس کے بارے میں مختلف باتیں یاد آنے لگیں جو میں نے بچپن میں سنی تھیں اور جن کی اہمیت اب واضح ہو رہی تھی۔

''تم جا سکتے ہو۔'' شیرف نے اپنے پیلے دانتوں میں سگار دباتے ہوئے پولیس مین سے کہا۔

''اس کیس کو میں سنبھال رہا ہوں۔''

میں نے لپک کر پولیس مین کا بازو تھام لیا۔

''نہیں...... ایک منٹ کے لیے رکو میں ورسائل میں ایک شخص سے واقف ہوں جو جرمانے کی نقد ادائیگی کر دے گا مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دی جائے میں اسٹیٹ ایجنٹ ڈین سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ ٹھیک کہتی ہے جے ڈی۔'' پولیس مین نے میرے خوف کو محسوس کرتے ہوئے۔

''مسٹر ڈین علاقے کے انتہائی معزز شخص ہیں۔''

''اوہ...... میں بھی اس سے واقف ہوں۔'' شیرف نے کچھ اس طرح بل کھا کر کہا جیسے وہ شکار کو صاف بچتے دیکھ رہا ہو۔

''تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے لڑکی؟''

''میں اسٹار پیلس کے سامان کی خریداری کے لیے آئی ہوں۔''

اس مرتبہ شیرف نے میرے لائسنس کو بغور دیکھا اور پھر اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑنے لگیں۔

''کینڈرا اونیل...... اوہو...... یاد آ گیا تمہارے باپ نے اپنی بیوی کو قتل کر کے خودکشی کر لی تھی اور تم بالکل گنگ ہو گئی تھیں اور پھر تمہاری خالہ تمہیں یہاں سے کہیں دور لے گئی تھی...... اوہ اس وقت تم بالکل پاگل لگ رہی تھیں مگر اب......'' وہ ایک بار پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا اور میں دل ہی دل میں یہ عزم کر کے رہ گئی کہ میں اس کی ساری قابلیت کا پول کھول کر اصل مجرم کو بے نقاب کر دوں گی۔

ڈین، میرے فون کے چند منٹ بعد ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے نقد جرمانہ ادا کیا اور یہ ضمانت لی کہ میں آئندہ تیز رفتاری سے گاڑی نہیں چلاؤں گی۔ شیرف نے مجھے رہا کرتے ہوئے کچھ طرح گھورا جیسے پچھتا رہا ہو، اس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ڈین سے بھی نفرت کرتا ہے ڈین نے میرے لیے اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر جیل کے پھاٹک کی طرف دیکھا۔

''تم اپنے استقبال پر بہت خوش ہوئی ہو گی کینڈرا، میرا خیال ہے کہ جلد لوگ تمہارے بارے میں باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔'' اس کے لہجے میں مسخرا پن تھا لیکن وہ حقیقت بیان کر رہا تھا ورسائل ایسی جگہ تھی جہاں نو وارد اور خاص طور سے نو وارد عورت فوراً موضوع بحث بن جاتی ہے۔

''موضوع بحث۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں تو یہاں برسوں تک بحث کا موضوع بنی رہی ہوں ڈین۔'' اس پر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے

لگا اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا لہٰذا میں ہنس پڑی فی الوقت میں کسی انکشاف کے موڈ میں نہیں تھی۔

''چلو چھوڑو اب چلیں۔''

''کہاں؟''

''اسٹار پیلس۔''

''ضرور چلیں گے لیکن پہلے تم کچھ کھا پی تو لو سات بج رہے ہیں تمہیں جیل میں گزرنے والے وقت کے بعد کچھ پینے کی بھی ضرورت ہے، ہم راستے میں رک کر ڈنر لیں گے روز کا ڈنر ہاؤس زیادہ اچھا تو نہیں لیکن وہ کھانا بہت لذیذ پکاتی ہے۔''

''ضرور۔'' میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ پاپا میری انگلی پکڑ کر روز ہاؤس لے جایا کرتے تھے جہاں میں ڈھیروں آئس کریم کھاتی رہتی تھی۔

''اوہ ڈین، میں روز کے بنائے ہوئے واٹر سینڈوچ ضرور کھاؤں گی۔''

''واٹر سینڈوچ، تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کے سینڈوچ کا نام۔''

''بس ایسے ہی معلوم ہو گیا۔''

''ہوں، چلو میری گاڑی کے پیچھے پیچھے رہنا کھانے کے بعد میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا کمرہ تلاش کر دوں گا۔''

''نہیں ڈین، میں اسٹار پیلس ہی میں رہوں گی۔''

''تنہا؟'' وہ ایک بار پھر حیرت سے مجھے گھورنے لگا۔

''ظاہر ہے اس کا مالک تو مر کھپ گیا۔''

☆☆☆

روز ڈائننگ ہاؤس میں لوگ ہمیں چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے مگر میں ان سے بے نیاز ڈین سے باتیں کرتی رہی۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا وجیہہ آدمی تھا اس کی وضع قطع سے امارت جھلک رہی تھی اور اس کے چہرے پر لڑکپن کے آثار اب بھی موجود تھے حالانکہ اس کی عمر بتیس سال سے کم نہیں تھی میں اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوئی کیونکہ اس کے ہر جملے سے ظرافت ٹپکتی تھی۔

مجھے پتا نہیں کہ میں اسے کیسی لگی۔ میری نیلگوں سیاہ زلفیں میری کمر تک جھول رہی تھیں مجھے مما سے ورثے میں بنفشی آنکھیں ملی تھیں جن کی بھویں اور پلکیں کسی مصنوعی تراش خراش کی محتاج نہیں تھیں۔ میرے چہرے پر میک اپ نہیں تھا صرف ہلکی سی لپ اسٹک تھی اور میں ڈھیلے ڈھالے لباس کے باوجود اپنے حسن کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ میرا لباس شہری لڑکیوں کی طرح مختصر اور چست نہیں تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' ڈین نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

''یہی کہ تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا جس پر وہ خفیف سا ہو گیا۔

''نہیں کینڈرا میں کوئی غلط بات نہیں سوچ رہا ہوں مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ تم میرے لیے بالکل اجنبی ہو لیکن یہ بھی کہہ دوں کہ اس پہلی ملاقات میں مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا ہے کہ بعض لوگ اجنبی ہونے کے باوجود اجنبی نہیں ہوتے۔''

اسی لمحے روز نے گرما گرم اسٹیک کی قاب ہمارے سامنے رکھ دی۔ کھانے کے بعد کافی کی چسکی لیتے ہوئے ڈین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''رات کے نو بج رہے ہیں کینڈرا اگر ہم فوراً روانہ ہو جائیں تب بھی دس بجے تک ہی اسٹار پیلس پہنچ سکیں گے میرا خیال ہے کہ تم یہیں کسی ہوٹل میں رک جاؤ پھر آرام کے بعد صبح میرے ساتھ ہی وہاں چلنا۔''

بیڈ پر لیٹنے کا تصور بہت فرحت بخش تھا کیونکہ میں تھکی ہوئی تھی اور شیرف سے ملاقات کے بعد تو اس تھکن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ اتنے قریب پہنچ کر میں اسٹار پیلس دیکھے بغیر سو نہیں سکوں گی۔"

"پلیز ڈین مجھے وہاں پہنچا دو۔"

"لیکن وہاں کی بجلی منقطع ہو چکی ہے، نہ تو ٹیلی فون ہے اور نہ ہی کمرے گرم رکھنے کا کوئی انتظام اور پھر......!"

"بولو ڈین خاموش کیوں ہوگئے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم مجھے پاگل سمجھنے لگو گی لیکن میں یہ بتانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ اسٹار پیلس پر سایہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ برسوں قبل ایک شخص نے وہاں اپنی بیوی کو قتل کر کے خودکشی کر لی تھی اور ان دونوں کی روحیں کسی غیر کو عمارت میں رہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں روحوں کے وجود پر یقین رکھنے والے کو پاگل کہا جاتا ہے اور مجھے تو اس وجہ سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں مکان فروخت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کینڈرا یقین کرو کہ جن لوگوں نے بھی وہاں رہنے کی کوشش کی وہ کسی نہ کسی افسوسناک اور دہشت ناک واقعہ کی وجہ سے رات ہی نکل آئے۔ اسی باعث میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہاں رات گزارنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔"

اس کی تشویش بھری باتوں سے مجھے بڑا لطف آیا وہ بڑی اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا۔

"ڈین......!" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جن لوگوں کو غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ بقول تمہارے ان روحوں کے لیے غیر تھے لیکن میں اسٹار پیلس میں کئی سال قبل رہ چکی ہوں تم نے جو کہانی سنائی ہے وہ جزوی طور پر درست ہے ممکن ہے اسٹار پیلس پر ان دونوں کی روح کا قبضہ ہو لیکن قتل اور خودکشی کی کہانی درست نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ کسی نے دہرے قتل کا ارتکاب کیا تھا میں عینی گواہ ہوں اور میں اسٹار پیلس میں رہ کر اس رات جس کرب سے گزر چکی ہوں اس کے سامنے اب کوئی درد یا دکھ بے وقعت ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مرنے والے میرے والدین تھے ڈین چلو، اب چلتے ہیں۔"

ڈین ساکت رہ گیا پھر اس نے بل ادا کر کے میری طرف دیکھا اور میں عجیب سے احساس کے تحت اٹھ کھڑی ہوئی میں اسٹار پیلس واپس جا رہی تھی۔

وہیں، جہاں میں نے یہ خونی منظر دیکھا تھا۔

اسی جگہ جہاں میرے ماں باپ کی خون آلود لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

بارش کی وجہ سے ہماری گاڑیوں کی رفتار سست رہی اور ہم ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اسٹار پیلس پہنچ گئے اسٹیشن ویگن جب کیچڑ سے گزرتی ہوئی احاطے میں داخل ہوئی تو میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

یہی وہ احاطہ تھا جس میں آنٹی ہیلن میری انگلی تھام کر مجھے ٹہلایا کرتی تھیں اسی احاطے میں میں بیر چنتی ہوئی آنٹی سے کھیلتی رہتی تھی۔

میری آنکھوں میں وہ بچی گھوم گئی جو دو چوٹیاں باندھ کر ننگے پیر اس احاطے کی قالین نما گھاس پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتی رہتی تھی وہ سرخ بیر بہت شوق سے کھاتی تھی لیکن پھر جب وہ یہاں سے لے جائی گئی تو اس نے بیروں کو دوبارہ ہاتھ تک

نہیں لگایا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر اسٹیشن ویگن ڈین کی کار کے ساتھ ہی کھڑی کردی، میری گاڑی کے اوپر اسی قدیم شاہ بلوط کی بانہیں پھیل گئیں جس کے نیچے میں اپنی گڑیا کو لوریاں دیا کرتی تھی۔ اس بوڑھے درخت کی جڑیں اب بھی زمین پر ابھری ہوئی تھیں وہ پہلے کی طرح اب بھی زندہ لگ رہا تھا۔ یہ بوڑھا درخت بالکل اسی طرح ہمارے خاندان میں شامل تھا جس طرح پاپا، ماما اور آنٹی شامل تھیں۔ لیکن ان کے برعکس یہ ابھی زندہ تھا اور اس کی بانہیں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے میری طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

ڈین نے اپنی ہیڈ لائٹس کھلی چھوڑ دیں اور ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکالنے لگا۔

میں گاڑی سے اتر کر فرنٹ پورچ کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی اور پھر اپنی بلی جارجی یاد آ گئی میں بلی کو گود میں بھر کر شاہ بلوط کی چھاؤں میں بیٹھی رہتی تھی بلی کا نام آنٹی ہیلن ہی نے رکھا تھا شاہ بلوط کے ارد گرد گزوں دور تک سرخ گلاب کھلے رہتے تھے جنہیں توڑنے کی آنٹی نے کبھی اجازت نہیں دی تھی وہ کہتی تھیں کہ پھول توڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ماں سے اس کا بچہ چھین لیا جائے یا تم سے کینڈی بلی چھین لی جائے۔

آنٹی ہیلن دن بھر میری دیکھ بھال کرتی تھی اور جب میں سو جاتی تو وہ دھوپ کے باوجود ان پودوں کی نگہداشت کرنے لگتی تھی۔

اسی پورچ میں پھولوں کی ایک بھینی بھینی خوشبو رچی بسی رہتی تھی کہ لوگ یہاں بیٹھنے میں پہل کیا کرتے تھے اور جب مما مجھے ڈانٹ کر بھگا دیتی تھیں تو آنٹی مجھے گود میں لے کر پائیں باغ لے جایا کرتی تھیں۔

''کینڈرا۔'' ڈین کی آواز مجھے میلوں دور سے سنائی دی مگر میں چونک پڑا۔ ''چلو ٹارچ مل گئی ہے۔''

داخلی سکون کی کیفیت محسوس کرتے ہی دو چوٹیوں والی لڑکی اور بلی دونوں غائب ہو گئے اور پھر جونہی میں نے ایک قدم بڑھایا تو داخلی سکون کی جگہ اضطراب اور خوف نے لے لی۔

ڈین نے اسکرین ڈور کھولا تو چرچراہٹ کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔ ایسا لگا جیسے برسوں سے بند یہ دروازہ مداخلت بے جا پر برہم ہوا اور پھر جب میری نظر اندر پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرا گھر خود بھی احتجاج کر رہا ہو۔

دروازے کے کھلتے ہی میں کانپنے لگی۔

''کتنا بھپکا ہے اندر۔'' ڈین نے کہا۔ ''میں نے ایک چوکیدار تو رکھا ہوا ہے لیکن کبھی گھر کے اندر کی صفائی پر توجہ نہیں دی کیونکہ یہ فضول ہی لگتا تھا میں خود بھی صرف ایک دو مرتبہ یہاں آیا تھا کیونکہ سچ پوچھو مجھے اس مکان میں داخل ہونے سے خوف آتا ہے۔''

''تم مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''وہ تو تم بھی ضد کی پکی ہو۔'' وہ بھی ہنسنے لگا۔

''ہاں اور میں تمہاری مدد سے یہاں کا ماحول بہتر بنا کر اسے قابل رہائش بھی بنا لوں گا سب سے پہلے تو ہمیں روشنی اور حرارت کی ضرورت ہے۔''

ڈین نے ٹارچ کی روشنی کی لکیر ادھر اُدھر گھمائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم ڈرائنگ روم میں ہیں اور پھر وہ روشن لکیر آتشدان پر پڑی تو میں حیرت سے اچھل پڑی۔ آتشدان میں لکڑیوں کے ٹکڑے اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے صرف ماچس دکھانے کے منتظر ہوں کچھ ایسے جیسے کسی کو ہمارے آنے کی اطلاع مل چکی ہو ہم نے تیزی سے تینوں خواب گاہوں کا جائزہ لیا اور پھر کچن سے کھانا پکانے والا اسٹوو مل گیا۔

ہم نے آگ روشن کر لی اور چند ہی ساعتوں میں اندر کی خنکی اور سیلن ختم ہوگئی۔ آگ کے شعلوں کی روشنی سے ماحول بڑا دوستانہ ہوگیا اور مجھے ایسا لگا جیسے درودیوار مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔

''ڈین تمہارا چوکیدار بہت ذہین آدمی ہے تم اس کی تنخواہ میں اضافہ ضرور کرنا دیکھو نا تیل کے لیمپ میں تیل بھی ہے اور آتشدان میں لکڑیاں بھی ہیں۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے کینڈرا میں نے اس شخص کو چار پانچ روز سے نہیں دیکھا اور میری طرح اسے بھی تمہاری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔''

میں نے سچ کہا تھا ہر کمرے کے آتشدان میں لکڑیوں کے ٹکڑے اور ہر آتشدان کے اوپر تیل سے بھری ہوئی لالٹینیں موجود تھیں۔ میں نے چھوٹی خوابگاہوں میں دوبارہ جا کر دیکھا ان پر دھلی ہوئی چادریں پڑی تھیں اور ان پر ایک شکن بھی نہیں تھی۔

لیکن ان کی خواب گاہ میں بڑے کمرے میں نہ تو کوئی لالٹین موجود تھی اور نہ ہی آتش دان میں لکڑیاں۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ قتل ہوئے تھے۔

میں نے کمرے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد تفصیلی جائزہ صبح تک کے لیے اٹھا رکھا۔

کچھ دیر بعد ڈین میرے سوٹ کیس لے کر آیا تو بڑا برہم تھا۔

''یہ کیا حماقت ہے کہ تم یہاں تنہا رہو گی۔'' اس نے غصیلے انداز میں کہا۔

''میں دوسرے بیڈروم میں کیوں نہیں سو سکتا۔''

''نہیں ڈین۔'' میں ہنس پڑی۔ ''میں مانتی ہوں کہ یہ پچاس کی دہائی نہیں اور لوگ فراخ دل ہو گئے ہیں لیکن میں یہ بھی نہیں بھول سکتی کہ اس علاقے کا نام ورسائل ہے یہاں تو تمباکو کی فصلیں بھی سرگوشیاں کرتی ہیں افواہیں پھیلاتی ہیں یہاں کے لوگوں کی زبانیں ہاتھ ہاتھ بھر لمبی ہیں تم فکر مت کرو میں ڈرے بغیر سو جاؤں گی۔''

ڈین نے خفگی کے عالم میں تمام کھڑکیاں اور دروازے ٹھونک بجا کر دیکھے اور پھر مجھے تلقین کرنے لگا کہ میں اندر سے دروازہ ضرور بند کرلوں۔

''سنو دروازہ اچھی طرح بند کر کے تم فوراً سونے کے لیے لیٹ جاؤ گی میں صبح سویرے بیدار نہیں ہوتا لیکن اب صورت حال بڑی مختلف ہے میں صبح اٹھ کر سیدھا یہاں آؤں گا۔''

اور پھر میں تنہا رہ گئی مگر تنہا کیوں میرے ساتھ تو یادوں کی پرچھائیاں تھیں اور آنکھوں میں وہی منظر تھا۔

میں سامان کا جائزہ لینے لگی اور سب سے دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ میرے خاندان کا بیشتر سامان اب بھی جوں کا توں موجود ہے۔ پاپا کا پائپ ایک آتش دان کے قریب رکھا ہوا تھا آتشدان کے اوپر جنگلی پھولوں والی ایک پینٹنگ جھول رہی تھی جس کے نیچے میری ماں کے دستخط تھے ''اینا پیم بروک اونیل۔''

سب کچھ ویسا ہی تھا زمانہ بدل گیا تھا پلوں کے نیچے سے پانی گزرتا رہا تھا۔

میں صرف ایک لالٹین روشن رکھ کر اپنے کمرے میں گئی یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں آنٹی ہیلن کے ساتھ سوتی تھی۔

میں بستر پر لیٹی تو ایسا لگا جیسے آنٹی ابھی آ کر میرے گال چومے گی دعا مانگے گی اور مجھے سینے سے لگا کر سلانے کی کوشش کرے گی۔

میں سو گئی لیکن میری نیند میں ماضی کے خواب در آئے اور میں کروٹیں بدلنے لگی پھر معاً مجھے خواب میں ہلکی موسیقی سنائی دی آنٹی ہیلن کا میوزک بکس وہی نغمہ

محبت سنا رہا تھا میوزک بکس ڈریسر پر رکھا رہتا تھا اور جب میں ڈانٹ کھا کر آنٹی کے پاس آتی تھی تو وہ میوزک بکس میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔

جونہی میری آنکھ کھلی، موسیقی کی آواز بھی تھم گئی میں کانپ کر رہ گئی۔ سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی نادیدہ خوف کی وجہ سے کھڑکی کی کھلی درزوں سے صبح کاذب کی ملگجی روشنی نظر آرہی تھی مگر کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے لالٹین جلائی اور روشنی ہوتے ہی جسم کی کپکپاہٹ ختم ہوگئی میں کہنیوں کے بل لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی جو ادھ کھلی کھڑکی سے صاف نظر آرہا تھا آسمان پر جلد ہی اندھیرا چھٹنے لگا صبح ہونے والی تھی۔

ابھی میں دوبارہ سونے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک کھڑکی میں کسی کا چہرہ نظر آیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آرہا یہ کس کا چہرہ ہے، میں خوف کی شدت سے بے حال ہو کر سوچنے پر مجبور ہوگئی یہ کوئی مرد ہے یا عورت، مجھ میں ہلنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے دل پر کوئی گھونسے مار رہا ہو، پھر میری چیخ نکلی اور بند کمروں کی دیواروں سے سر پھوڑنے لگی۔ میں اٹھنے اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ وہ چہرہ کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ وہی چہرہ تھا۔ انہی لوگوں میں ایک تھا جن کے بارے میں آنٹی ہیلن نے مجھے خبردار کیا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بھاگنے لگی لیکن چہرہ پھر بھی میرا تعاقب کرتا رہا اب وہ ہر کھڑکی میں نظر آرہا تھا میں فرنٹ ڈور کی طرف دوڑنے لگی تاکہ کار تک پہنچ سکوں لیکن فرنٹ ڈور جام تھا۔ میں نے کنڈی کھولنے کی کوشش میں اپنی انگلیاں فگار کرلیں لیکن دروازہ نہ کھلا میں نے آگ کریدنے والی سلاخ اٹھائی لیکن پھر یہ دیکھ کر میں جامد ہوگئی کہ میرے ہاتھ میں آہنی سلاخ نہیں بلکہ خون آلود چاقو ہے۔ چیخ میرے حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھاتی چلی گئی۔

☆☆☆

میری آنکھ ڈرائنگ روم کے صوفے پر کھلی، میرے اوپر ایک ہلکی تو شک پڑی ہوئی تھی جو میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لی یہ توشک آنٹی ہیلن نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی میں نے اس پر ہاتھ پھیرا اور پھر آنٹی کے پرشفقت تصور سے مسکرانے لگی پھر اچانک مجھے یاد آگیا کہ میں کس مرحلے سے گزر چکی ہوں۔

میں توشک لپیٹ کر اٹھ بیٹھی میری نظریں آتشدان پر جم گئیں جس کے ننھے ننھے شعلے کسی معصوم بچے کے لپکتے ہوئے ہاتھوں کی طرح لگ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے آنٹی ہیلن آتشدان کی آگ کرید رہی ہیں پھر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کی دیکھ بھال کر رہی ہیں اور میں باسکٹ پکڑے ہوئے ان کے ساتھ بیر جمع کر رہی ہوں۔

آنٹی ہیلن صرف میں اور وہ اس معمے کی جزوی حقیقت سے آگاہ تھیں اب وہ گزر چکی ہیں اور صرف میں زندہ ہوں۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور چیستان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرنے کی جستجو کرنے لگی۔ مجھے علم تھا کہ اس کے کئی ٹکڑے غائب ہیں میرے ذہن کے بعض دروازے اس طرح بند تھے کہ کوشش کے باوجود میں انہیں کھولنے میں ناکام رہی تھی اور مجھے یاد تھا کہ آنٹی ہیلن بڑی محبت سے کہتی تھیں۔ نہیں بیٹی اب بھول جاؤ زیادہ سوچو گی تو پریشان ہو جاؤ گی صرف خدا جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ تمہیں پریشانی سے بچانے کے لیے اس چہرے کی شناخت کرانا نہیں

چاہتا خدا پر بھروسہ رکھو میری بیٹی۔"
ممکن ہے، آنٹی صحیح کہتی ہوں شاید سوال کا جواب حاصل کرنا میری بساط سے باہر تھا۔
میری آنکھیں اب بھی بند تھیں اور اسی حالت میں مجھے لکڑیوں کے جلنے کی آواز کے علاوہ ایک اور آواز سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کوئی چل رہا ہو میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں تو شک گر گئی کھڑکی کے فریم میں ایک شخص کھڑا تھا اور اس کے عقب میں سورج طلوع ہو رہا تھا اس کے نقوش واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے میں خوف اور دہشت کی وجہ سے ساکت بیٹھی رہی۔
"میں آپ کو خوفزدہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں خاتون۔" اس چہرے کے لب ہلنے لگے۔
"مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں کوئی مقیم بھی ہے۔ میں نے دھواں دیکھا اور پھر لالٹین کی روشنی دیکھی تو میں سمجھا کہ شاید آگ لگ گئی ہے لیکن آپ مجھے کھڑکی میں دیکھ کر خوفزدہ ہو گئیں میں معذرت خواہ ہوں۔"
"تو...... تو وہ تم ہی تھے۔" اس کی معذرت سن کر میری ہیجانی کیفیت ختم ہونے لگی۔ "کیا ڈین نے تمہیں کو چوکیدار رکھا ہے۔"
"جی ہاں خاتون میں کھیت کے اس پار جھونپڑی میں رہتا ہوں ہوا چلنے کی وجہ سے میں نے دھوئیں کی بو محسوس کی اور میں اس خوف سے بھاگا چلا آیا کہ آگ نہ لگ ہوئی میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں لیکن اگر مجھے آپ کی موجودگی کا علم ہوتا تو اس طرح اچانک جھانک کر آپ کو خوفزدہ نہ کرتا ویسے نہ جانے کیوں مجھے یہ یقین تھا کہ آئندہ چند روز میں کوئی نہ کوئی یہاں ضرور رہنے کے لیے آئے گا لہٰذا میں نے اپنے آپ سے کہا کہ لنک بستر ٹھیک کر دو اور آتش دانوں میں لکڑیاں رکھ دو تاکہ جو کوئی بھی آئے اسے پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"
"لیکن تمہیں کسی کی آمد کا یقین کیوں تھا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں اس یقین یا احساس کی کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا خاتون۔ اس عمارت میں بعض ایسے واقعات ہوئے ہیں یا بعض ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔"
میں اثبات میں سر ہلانے لگی۔ خون آلود چاقو کی موجودگی، جو میں نے کچھ دیر قبل اپنے ہاتھ میں دیکھا تھا وضاحت طلب تھی اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص باتوں باتوں میں اپنا نام بھی بتا دیا ہے۔
لنک، میں نے سوچا اور پھر میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔
"سن...... سنو...... تم لنک فیلر تو نہیں ہو۔" میرے لہجے میں جذبوں کی حدت تھی اور لفظ معاً کانپنے لگے تھے۔
"جی ہاں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
"اوہ تم مجھے نہیں پہچان سکے۔" میری آواز رندھ گئی۔
"میں کینڈرا اونیل ہوں میں اور تم ایک ساتھ کھیل چکے ہیں، میں یہیں رہتی تھی۔"
لنک کے سپاٹ مگر توجوان چہرے پر اچانک ہی حیرت مسرت اور خوشی کے جذبات اُمڈ آئے وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔
اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آنے لگی اور پھر اس نے بڑی خوشی سے اچھل کر کہا۔
"کینڈرا۔" اس کے لہجے میں بے یقینی کی کیفیت تھی اس نے ایک دو قدم آگے بڑھائے تو میں نے اسے لنگڑاتے ہوئے دیکھا میں جس دس سالہ لنک کو یہاں چھوڑ گئی تھی اس میں ایسا کوئی نقص نہیں تھا اس

کے بھورے بال الجھے ہوئے تھے، چہرے پر ہلکی داڑھی تھی اور شاید حوادث زمانہ کے باعث اس کے چہرے پر عمر سے کہیں زیادہ پختگی آ گئی تھی۔ اس کی چمک دار کالی آنکھوں میں میرے لیے وہی تجسس تھا جو بچپن میں نظر آتا تھا لیکن بچپن کے برعکس اب وہ کالی آنکھیں قدرے اداس بھی تھیں۔

ہم بچپن کے ساتھی تھے۔

وہ میرے دونوں ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کئی بار نرم اور دھیمی آواز میں میرا نام لیا اور پھر داڑھی کے باوجود اس کے چہرے پر وہی پرانی دوستانہ مسکراہٹ نظر آنے لگی۔

''کینڈرا۔ میں تو یقین کر بیٹھا تھا کہ تم اب کبھی ملو گی اوہ میرے خدا تم تو شعلہ جوالا بن گئی ہو میری نظروں میں تو وہی بدصورت سی چڑچڑی لڑکی بسی ہوئی تھی جو بات بے بات لڑتا......!''

''لنک......!'' میں نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا مجھے ایسا لگنے لگا جیسے خاندان کا کوئی بھولا بسرا رکن اچانک ہی سامنے آ گیا ہو۔'' تم ورسائل میں کیا کر رہے ہو، تم تو کالج کی تعلیم مکمل کر کے دنیا بھر کی تفریح کے پروگرام بناتے رہتے تھے لاکھوں میں کھیلنے کے منصوبے تو ہر وقت تمہارے ذہن میں رہتے تھے۔''

''ہاں......!'' اس نے آتشدان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ضروری نہیں کہ...... ہر منصوبہ پورا ہی ہو جائے۔''

''تو کیا تم بیس سال سے ورسائل ہی میں ہو۔''

''ہاں......لیکن کچھ عرصہ کے لیے محاذ پر بھی چلا گیا تھا وہ زبردستی ویت نام لے گئے تھے جہاں ایک گولے نے میری ٹانگ کو چاٹ لیا مجھے واشنگٹن لایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے مجھے نقلی ٹانگ لگا دی پھر میں واپس یہیں آ گیا۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں بچپن کے خوابوں کو یاد کر کے رو پڑی اور مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ ان دنوں لنک مجھے روتی شکل کہتا تھا لہٰذا میں نے فوراً آنسو پونچھ لیے اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس سکوت کو لنک ہی نے یہ پوچھ کر توڑا کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو میں نے اسے گزرے ہوئے بیس برسوں کی مختصر سی تفصیل بتا دی کہ میں نے کس طرح آنٹی ہیلن کی علالت کے باوجود ایتھنز میں تعلیم حاصل کی اور پھر کس طرح میں نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد اسے چھوڑا اور مس میبل سے کس طرح ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے مستقل اپنے ساتھ رکھ لیا۔

''ثابت یہ ہوا کہ دنیا گول ہے کینڈرا......!''

''ہاں ہم جہاں سے جدا ہوئے تھے وہیں پہنچ گئے ہیں۔''

''یہی بات ہے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ورسائل دوبارہ آؤ گی تم ایسے حالات میں یہاں سے گئی تھیں کہ خیر چھوڑو ماضی کو بعض یادیں بڑی تلخ اور خاردار راستوں کی طرح ہوتی ہیں لیکن کینڈرا میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم یہاں کیسے آ گئیں۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اگر وہ بچپن میں میرے سامنے کبھی رویا ہوتا تو...... تو میں اسے روتی شکل کہہ کہہ کر خوب پریشان کرتی لیکن اب بات مختلف تھی میں اس کے آنسوؤں کی حدت سے بچنے کے لیے آگ کو گھورنے لگی پھر جب اس نے خود پر قابو پا لیا تو میں نے اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں آج بہت خوش ہوں لنک تمہیں پا کر مجھے

آنٹی کی موت کے بعد پہلی بار خوشی نصیب ہوئی ہے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے خاندان میں صرف تم ہی زندہ بچے ہو۔ تم بچپن میں بھی ہمارے خاندان ہی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔"

اس نے جھک کر گرم جوشی سے ...... میں کندھوں پر ڈال دی اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا پرانے اور بچپن کے جذبے اب بھی ہماری آنکھوں میں تھے لیکن اب ان میں کچا پن نہیں تھا پختگی تھی یہ جذبے دو بچوں کے نہیں دو بالغوں کے تھے وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ باہر سے کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ لنک نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ڈین لدا پھندا کمرے میں داخل ہو گیا۔

"ناشتہ۔" اس نے چلا کر کہا اور میں ہنس پڑی پھر معاً ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر پڑیں۔ ڈین نے سرسری طور پر لنک کو دیکھا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"اوہ تم نے باڈی گارڈ بھی رکھ لیا ہے کینڈرا؟" اس کے لہجے میں لنک کے لیے ناپسندیدگی تھی اور لنک بھی اسے ناپسند انداز سے گھور رہا تا۔

"ہاں...... ڈین تم اسے باڈی گارڈ کہہ سکتے ہو یہ میرے بچپن کا رفیق اور دوست ہے اور بچپن میں بھی مجھے درختوں سے گرنے کیچڑ میں پھسلنے اور زمین پر ٹھوکر کھانے سے بچاتا رہا ہے۔"

"نہیں......!" ڈین نے حیرت سے اچھل کر کہا۔

"تو تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

"ہاں اور ہم بچپن کی طرح اب پھر گہرے دوست بن گئے ہیں ڈین۔"

اس دوران لنک بالکل خاموش رہا شاید اس کی وجہ احساس کمتری ہو۔ وہ بہرحال ڈین کا ملازم تھا۔

میں اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلی گئی میں نے جینز اور ایک ڈھیلا ڈھالا سوئٹر پہنا اور سوچنے لگی کہ کچن میں وہ دونوں کیا کر رہے ہوں گے۔ میں واپس آئی تو خدشے کے عین مطابق ماحول کشیدہ تھا۔ لنک نے ناشتہ الگ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے بڑی سختی سے کہا کہ وہ ناشتہ ہمارے ساتھ ہی کرے گا۔ وہ مجبور ہو گیا مگر میں یہ محسوس کرتی رہی کہ اپنے آجر کی موجودگی میں وہ کتنا بے چین اور کتنا اداس ہے میں نے ماحول کی کشیدگی دور کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

"ڈین، میں اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہتی ہوں تم اپنے دفتر سے مس میبل کو فون کر کے میرا پیغام دے دینا کہ اسٹاف پیلس کا سامان خریدا جا سکتا ہے ہم اتنے بڑے مکان کا سامان عام طور پر پانچ سو ڈالرز میں خرید لیتے ہیں کیا اس مکان کا مالک اس معاوضے پر مطمئن ہو جائے گا؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ اسے بھی اس سے زیادہ کی امید نہیں ہوگی کیونکہ سامان کو چھانٹنے، نکالنے اور منتقل کرنے میں بہت زیادہ دشواری پیش آئے گی میں اس بارے میں اس سے بات کر لوں گا۔"

لنک کی نظریں پلیٹ پر جمی رہیں، میں اس کو نارمل کرنے پر مجبور ہو گئی۔

"سنو لنک کیا تم دوچھتی اور سائبان کے سامان کو چھانٹنے میں میرا ہاتھ بٹا سکو گے میں کسی کی مدد کے بغیر یہ کام نہیں کر سکوں گی۔"

لنک کے سخت گیر چہرے پر اچانک نرمی نمودار ہونے لگی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ناشتے کے بعد ہم سامان چھانٹنے کے لیے تیار ہو گئے اور ڈین یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ بجلی کی فراہمی اور ٹیلی فون کنکشن کی بحالی کے لیے جا رہا ہے۔ اس کے جاتے ہی لنک نے سکون کی لمبی سانس لی۔

''بڑا عجیب آدمی ہے۔'' اس نے کہا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈین کے لیے لنک کی نفرت کم ہو گئی ہے

''چلو، اب کام شروع کردیں۔''

''ہاں لیکن پہلے میں تم سے اسٹار پیلس کے واقعات کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔

''ماضی کو دفن رہنے دو کینڈرا۔'' یہ کہتے ہوئے لنک کا چہرہ ست گیا۔'' ماضی کی راکھ کو کریدنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا ہم سب جانتے ہیں کہ کیا ہوا تھا اور بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ انہیں اس واقعے کی وجہ بھی معلوم ہے۔''

''لیکن لنک لوگ جو چاہیں کہیں میں تو اس وقت خود موجود تھی لہٰذا میں لوگوں کی بکواس پر ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں کرسکتی بس یوں سمجھ لو کہ میں سب کچھ دیکھنے کے بعد کوئی بات بھول نہیں سکتی۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے کمرے میں کوئی خواب دیکھ کر خوف کی وجہ سے بیدار ہوگئی تھی۔ آنٹی ہیلن اس وقت بستر پر نہیں تھیں لہٰذا میں ہمیشہ کی طرح بسورتی ہوئی پاپا اور مما کے کمرے کی طرف چل دی۔ میں جب بھی خوفزدہ ہوکران کے کمرے میں جاتی تھی تو وہ مجھے اپنے درمیان سلا لیا کرتے تھے لیکن جب میں ان کے بند دروازے پر پہنچی تو میں نے بعض غصیلی آوازیں سنیں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی بول رہا تھا میں نے مما کو روتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''تمہارا وعدہ تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' پھر پاپا کی آواز سنائی دی۔

''ہمیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا میں جانتا تھا کہ ہم غلط کررہے ہیں اوہ نہیں۔'' وہ چلانے لگے تھے پھر میں نے کسی کے گرنے اور چیخنے کی آواز سنی تھی پھر ایک آواز سنائی دی تھی۔

''تم نے اسے قتل کردیا تم پاگل ہو، نہیں...... اوہ۔''

پھر کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد قدموں کی آہٹ دور ہونے لگی۔ اس وقت تک میں دروازے کو دھکا دے کر کھول چکی تھی۔ میں نے صرف مما کو گرتے ہوئے اور ایک ہیولے کو کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا اسی لمحے اس ہیولے نے پلٹ کر میری طرف بھی نظر ڈالی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ بہت اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ لیکن لنک یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں کچھ دیر بعد ہی مجھے کچھ یاد نہیں رہا میں اس چہرے کو اچھی طرح پہچانتی ہوں لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ کس کا چہرہ تھا۔ یہ چہرہ بیس سال سے میرا تعاقب کرتا رہا ہے۔ مجھے گھورتا رہا ہے اب مجھے ہر حال میں اس چہرے سے نقاب اٹھانا ہے۔ لنک مجھے سوفیصد یقین ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا مگر کیوں مجھے اس کا جواب بھی درکار ہے۔''

اس دوران لنک کی پلکیں تک نہیں جھپکیں تو تم کو یہ علم تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے مگر تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں؟''

میری عجیب حالت ہوگئی میں نے آنکھوں میں چوری چھپے آجانے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ذہنی طور سے بالکل مفلوج ہوگئی تھی میں بتانا چاہتی تھی مگر میری زبان ہلنے سے انکار کردیتی تھی۔ اس کیفیت سے آنٹی ہیلن پریشان ہوگئیں اور پھر مجھے یہاں سے لے گئیں انہیں بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا جتنا میں نے انہیں کچھ عرصہ بعد بتایا تھا لیکن صحت مند ہونے کے بعد بھی میں اس چہرے کو شناخت نہیں کرسکتی اور نہ ہی مجھے یہ یاد آیا کہ وہ کس کا

چہرہ تھا۔ وہ بھی تمھاری طرح یہی کہا کرتی تھیں کہ بیتی ماضی کی راکھ کومت کریدو، اگر کوئی چنگاری ملی بھی تو خود کو جلالوگی تمہارے باپ تو اب آنے سے رہے لیکن لنک میں قاتل کو پہچان کر دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میرا باپ بے قصور تھا اس نے قتل نہیں کیا اور میری ماں بھی بے گناہ تھی اسے پاپا سے بہت محبت تھی لوگ بکواس کرتے ہیں وہ بے وفا نہیں تھی۔"

یہ کہہ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور لنک نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا میں آنسوؤں سے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں کو تھپکیاں دیتا ہوا محبت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"دل کو ہلکا کرلو میری روتی شکل۔"

کچھ دیر بعد وہ مجھے کچن میں لے آیا اور مجھے آرام دہ کرسی پر بٹھا کر اس نے کافی بنائی اور پھر کپ میرے سامنے رکھ کر اس نے میری آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کینڈرا تم جو چاہو پوچھ لو اگر میرے علم میں کچھ ہوا تو میں ضرور بتاؤں گا۔"

اس وقت میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ ذہن میں بے شمار سوالات تھے اور میں ان سے پہلا سوال منتخب کرنے کی کوشش سے دوچار تھی۔

"کیا قتل کے بعد کوئی اچانک ورسائل سے روانہ ہوا تھا لنک۔"

"نہیں۔" لنک نے کچھ دیر تک ذہن پر زور دینے کے بعد جواب دیا۔

"فرد جرم لکھی جانے کے بعد شریف بلیک شپ اور اس کے بعض ساتھی دلدلی علاقے میں شکار کرنے کے لیے ضرور گئے تھے لیکن تین چار روز بعد ہی واپس آگئے تھے پھر آنٹی ہیلن اور تمہارے چلے جانے کے بعد اس واقعہ پر چہ میگوئیاں بھی بند ہوگئی تھیں اور لوگ ایسے بن گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، قتل سے پہلے بہر حال یہاں مختلف افواہیں اڑتی رہتی تھیں لیکن ان دونوں کی موت کے بعد کسی نے بھی ان کی بڑھ چڑھ کر برائی نہیں کی کیونکہ یہاں کے لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مرنے والے کی برائی کر کے وہ اس کی روح کو انتقام لینے کے لیے مجبور کردیں گے۔"

یہ بڑی عجیب بات ہے قاتل کو علم تھا کہ میں اسے دیکھ چکی ہوں اور اس کے باوجود بھی اگر وہ ورسائل میں رکا رہا تو یہ اس کے اعصاب کی قوت کا مظاہرہ تھا۔

"وہ افواہیں کیا تھیں لنک؟"

"کینڈرا۔" اس نے نظریں جھکالیں۔

"دیکھو...... میں بھی اس وقت بچہ ہی تھا لہٰذا بڑی عمر والے لوگ میرے سامنے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔"

"لیکن تم مرفی میں کام کرتے تھے لنک وہاں تو لوگ ضرور باتیں کرتے ہوں گے۔"

"ہاں۔" اس نے ٹیبل کلاتھ پر اس طرح انگلیاں پھیری جیسے مٹی ہٹا رہا ہو۔ "لیکن وہاں کسی نے کبھی تمہاری مما کا ذکر نہیں کیا وہاں آنے والے بالعموم مردوں کے بارے میں گفتگو کرتے تھے کہ کس کی کس سے شناسائی ہے۔"

میں نے سکون کی ایک لمبی سانس لے کر سوچا کہ لنک مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ خواہ سچائی کے اظہار سے میرے اپنے احساسات ہی کیوں نہ مجروح ہوجائیں۔

"لیکن بعض عورتیں بہت زبان دراز اور شکی مزاج تھیں کینڈرا۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اپنی ماں ایما اور ڈالٹی کے درمیان ہونے

والی گفتگو سنی تھی وہ تینوں کچن میں تھیں اور میں باہر کام کر رہا تھا لیکن ان کی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان کا موضوع تمہاری مما تھیں اور وہ تینوں یہ کہہ رہی تھیں کہ اینا ہر وقت بنی سنوری رہتی ہے اور مردوں کو بے حجابی اور چاہت بھری نظروں سے دیکھتی ہے کسی بھی نوجوان سے بے تکلف ہونے میں جھجک محسوس نہیں کرتی اور پھر وہ کہنے لگیں کہ تمہارے پاپا کو اینا کی لگام کھینچ لینی چاہیے ورنہ کوئی بڑا اسکینڈل ضرور جنم لے گا انہوں نے اس شک کا بھی اظہار کیا تھا کہ اینا اور جیک کے درمیان معاشقہ چل رہا ہے تم جیک کو بھولی تو نہیں ہوگی وہی جو تمہارے باغ کی گھاس کاٹنے پر ملازم تھا وہ تمہاری مما سے چھوٹا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ وہ عورتوں کا بڑا دلدادہ تھا لیکن میں نے کبھی ان عورتوں کی باتوں پر یقین نہیں کیا جن میں میری ماں بھی شامل تھی۔ یہاں کی عورتیں تمہاری مما سے صرف ان کے حسن کی وجہ سے جلتی تھیں۔ وہ تمہارے پاپا اور اینا کی شادی پر بھی بہت جز بز ہوئی ہوں گی اور ان کا خیال تھا کہ...... کہ...... تمہارے پاپا کو آنٹی ہیلن سے بڑی محبت تھی۔"

اس کے ان انکشافات نے مجھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے میرے چہرے پر کرب کے آثار دیکھنے سے بچنے کے لیے منہ موڑ کر چھت کو گھورنا شروع کر دیا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"چلو...... اب دو چھتی کی صفائی شروع کر دیں۔"

"نہیں لنک۔" میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا حالانکہ اس وقت میرا دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"میں وضاحت چاہتی ہوں یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میری ماں دوسرے مردوں میں دلچسپی لیتی تھی اور پاپا آنٹی ہیلن سے محبت کرتے تھے۔"

"سنو، میں کچھ نہیں جانتا لیکن لوگ کہتے تھے کہ تمہارے پاپا تمہاری مما سے عمر میں بڑے تھے اگر تم پوری کہانی معلوم کرنا چاہتی ہوں تو دادی ایما سے ملو۔"

"اوہ کیا وہ ابھی زندہ ہیں اب تو ان کی عمر نوے سال سے بھی زیادہ ہوگی۔"

"ہاں گزشتہ ماہ چرچ میں اس نے اپنی سالگرہ منائی تھی ویسے اب وہ کسی کام کی نہیں رہی۔ اپنے پورچ میں آرام کرسی پر بیٹھی رہتی ہے کبھی کبھی گزرے ہوئے دنوں کی باتیں کرتی ہے پیم بروک خاندان سے بھی اس کا دور پرے کا رشتہ ہے تمہاری مما بھی پیم بروک تھیں۔"

"ایما......!" میں اس کے بارے میں سوچنے لگی اور پھر مجھے ایک ایسی بوڑھی عورت یاد آ گئی جو پائپ پیتی تھی جس کی آنکھیں بہت تیز اور چمکیلی تھیں مجھے یاد آ گیا کہ ایما کو پیم بروک خاندان دو مرتبہ عاق کر چکا ہے میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں لنک کے ساتھ کھڑی ہو کر کھڑکی سے باہر سائبان کی سمت میں دیکھنے لگی یہ وہی سائبان تھا جہاں میں اور لنک گھنٹوں گڈے گڑیوں سے کھیلتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں اس سائبان میں بڑی رونق رہتی تھی فارم ہاؤس سے آنے والی آوازیں گونجتی رہتی تھیں اور کچن سے آنے والی خوشبو کے باعث میری بھوک بڑھتی رہتی تھی۔ پھر اچانک آنٹی ہیلن مجھے تلاش کرتی ہوئی نظر آتی تھی تو ہم دونوں گھاس کے ڈھیر میں چھپ جایا کرتے تھے اور آنٹی ہیلن اس ڈھیر کے قریب کھڑی ہو کر کچھ بڑبڑاتی تھیں اور یہ کہہ کر چلی جاتی تھیں کہ دونوں اپنے کپڑے گھاس میں ستیاناس کر لیں گے۔

سائبان کے سامنے والے احاطے میں مرغیاں کڑکڑاتی ہوئیں دانا چگتی رہتی تھیں لیکن اب یہ

سائبان اور یہ احاطہ ویران تھا۔ اس کے پھول، پودے اور گھاس مرجھا چکی تھی، مکان، اپنے مکینوں کی جدائی کے بعد بیوگی کا سیاہ لباس پہن چکا تھا۔

"تمہیں چیونٹیاں یاد ہیں کینڈرا۔" اس نے اچانک پوچھ لیا اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی اس وقت چیونٹیوں کے بارے ہی میں سوچ رہی تھی ہاں مجھے چیونٹیوں کی وہ لمبی قطاری اچھی طرح یاد تھی جو احاطے کے ایک کونے سے نکل کر سائبان کے ایک کونے میں سوراخ کے اندر تک چلی جاتی تھی۔ چیونٹیاں دو قطاروں میں چلتی تھیں ایک قطار سائبان کی طرف جانے والی چیونٹیوں کی ہوتی تھی تو دوسری احاطے کی طرف وہ بڑے منظم انداز میں ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح دوڑتی ہوئی نظر آتی تھیں کہ ان کے درمیان فاصلہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔

احاطے میں اگر کسی جانور کو آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت تھی تو وہ بلیاں تھیں، آوارہ بلیاں جن کو دیکھ کر میری پالتو بلی میاؤں میاؤں کرنے لگتی تھی اور آنٹی ہیلن ماں اور پاپا کی موجودگی سے بے نیاز کہہ جاتی تھیں کہ جارجی کو اندر لے جاؤ ورنہ یہ بھی آوارہ ہو جائے گی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز لنک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھولوں کا ہار بنانے لگا تھا اور میں روٹھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ پھر جب ہار بن گیا تھا تو وہ دوزانو ہو کر میرے پاس بیٹھ کر بولا تھا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔ میں خوشی سے اچھل پڑی تھی اور پھر اس نے وہ ہار میرے گلے میں ڈال دیا تھا۔

"لنک......!" میں نے معاً اسے آواز دی۔ "تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"کی تھی۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"میری شادی بلڈا سے ہوئی تھی لیکن جب میں ویت نام گیا تو اس نے طلاق حاصل کر لی تھی۔"

"اوہ۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکی لیکن میں نے اس کی پرکشش آنکھوں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ اب وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں میں گڑبڑا کر رہ گئی۔

"چلو اب کام شروع کر دیں میں مس ببیل سے یہ وعدہ کر کے آئی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ دو ہفتوں میں واپس آ جاؤں گی لیکن جس سست رفتاری سے کام کر رہی ہوں اس طرح تو دو مہینے میں بھی کام مکمل نہیں ہوگا۔ پہلے پورے گھر کا چکر لگا لیتے ہیں تاکہ سارے سامان کی فہرست بنا سکیں پھر مطلوبہ سامان ایک جگہ رکھ کر اسے دن شپ لے جانے پر سوچیں گے یہاں اب بھی میرے خاندان والوں کی ذاتی مصرف کی چیزیں موجود ہیں فرنیچر بھی وہی ہے آنٹی ہیلن کے بعد یہ مکان کس نے خریدا تھا لنک۔"

"کسی نے بھی نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ شاید وہ میری کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"قتل کے بعد تو لوگ اس طرف آتے ہوئے بھی ڈرتے تھے پھر آنٹی ہیلن نے اسے کبھی فروخت کرنے کا ارادہ نہیں کیا کئی سال تک خالی پڑا رہا اور پھر اچانک ٹیکس کے واجبات کی وصولی کے لیے اسے نیلام کرنے کا اعلان ہوا کسی دور دراز علاقے میں رہنے والے جوڑے نے اسے کوڑیوں کے مول خرید لیا شاید ان کو یہ علم نہیں تھا کہ یہاں دو قتل ہو چکے ہیں۔ پھر جب یہ خاندان یہاں آیا تو اس کو کرب کے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ اس جوڑے کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں ابھی انہیں یہاں رہتے ہوئے ایک ہی مہینہ ہوا

تھا کہ سب سے چھوٹی لڑکی تالاب میں گر کر ڈوب گئی۔ دوسرے سال ان کی فصل خراب ہوگئی اور وہ ٹیکس ادا نہیں کر سکے لیکن انہوں نے جلد ہی سنبھالا لے لیا۔ تاہم ابھی دوسری فصل کٹ کر گودام میں رکھی ہی گئی تھی کہ اچانک آگ لگ گئی جس میں فصل کے علاوہ ان کے ڈھور ڈنگر بھی جل گئے ان کے سب سے بڑے بیٹے کو اس کے فوراً بعد شہر میں بہت اچھی نوکری مل گئی تو اس نے پہلی تنخواہ سے ایک گھوڑی خریدی، ایک روز رات کے وقت نہ جانے کس طرح گھوڑی رسی تڑا کر بھاگ نکلی لڑکے نے اس کا پیچھا کیا تو دلدل میں دھنس گیا۔ اس کی لاش تک نہیں ملی اور پھر اس حرماں نصیب خاندان نے عمارت فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ عمارت آسیب زدہ ہے لیکن پھر اچانک شوہر نے فیصلہ بدل دیا تاہم عورت ضد کی پکی تھی وہ اپنے بچوں کو لے کر چلی گئی اس کا شوہر دس سال بعد بھی اسی علاقے میں رہا تھا لیکن ایک روز جب وہ اپنی بندوق صاف کر رہا تھا تو اچانک گولی چلنے سے وہ بھی مر گیا اور......!"

"پلیز۔" میں نے گھبرا کر لنک کی آستین پکڑ لی۔ "اگر میں بھوت پریت پر اعتقاد رکھتی تو فوراً یہاں سے بھاگ جاتی۔"

پھر ہم نے کام میں مصروف ہو کر وقتی طور پر سب کچھ بھلا دیا۔

میں نے ایک چھوٹی الماری سب سے پہلے کھولی جس میں کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

"دیکھو لنک۔" میں نے ایک ٹرانسپیرنٹ پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم ایسی رکابیوں میں اسٹیک کھاتے تھے نا اب یہ پلیٹیں نوادرات میں شامل ہوگئی ہیں اور ان کی بہت اچھی قیمت ملتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹ بک میں ان کی تعداد لکھی اور پھر کافی سیٹ کو گھورنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"یہی کہ...... مجھے ماضی سے کتنا پیار ہے۔"

"اوہ......!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تمہیں بچپن کی ہر بات یاد ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اپنی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر لنک نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اسے بچپن کی ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے۔

☆☆☆

ہم کام میں منہمک رہے مجھے ایسا لگا جس خاندان نے نیلام میں مکان حاصل کیا تھا وہ اپنا سامان لایا ہی نہیں تھا یہاں کی ہر چیز میرے اپنے خاندان کی تھی اور میرا خاندان سترہویں صدی عیسوی میں آئرلینڈ سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا میرے اجداد...... نہیں میری ماں کے اجداد نے یہاں زمینیں خریدی تھیں اور پھر ایک عمارت بنوائی تھی جو آنٹی ہیلن کے یہاں سے جانے تک پیم بروک خاندان ہی کے قبضے میں رہی تھی۔

ایک ایک چیز سے میری یادیں وابستہ تھیں بچپن کی یادیں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چیز ایک لنگر ہے جس سے میں بندھی ہوئی ہوں یا جس نے مجھے برسوں بعد ایک بار پھر ساحل پر لنگر انداز کر دیا ہو۔

میں جانتی تھی کہ زیادہ قیمتی سامان دوچھتی میں ہوگا۔

لیکن پہلے ہم نے کمروں کا جائزہ لیا اور سہ پہر ہونے پر جب میں لنک کے ساتھ آخری کمرے میں ان کی خوابگاہ میں داخل ہوئی تو میرا دل دھڑکنے لگا یہ وہی کمرہ تھا جہاں میری ماں اور پاپا تین سال تک

ساتھ رہے تھے اور جہاں...... میں نے ان کی لاشیں دیکھی تھیں۔

میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کمرے میں لنک داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہے لیکن جب اس نے مجھے بے دھڑک اندر جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی خاموشی سے چلا آیا۔

''آتشدان میں آگ تو جلا دو لنک یہاں بڑی خنکی ہے۔'' میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے اسے کام سونپ دیا ویسے یہ حقیقت تھی کہ ان کی خوابگاہ میں دوسرے کمروں کی بہ نسبت زیادہ خنکی تھی۔

میں سانس روک کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔

شاید نیلام میں خریدنے والے لوگوں کو علم ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں کچھ ہوا ہے۔ انہوں نے اسے بند ہی رکھا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر میری ماں کا نقرئی کنگھا رکھا ہوا تھا۔ ایک پینٹنگ جھول رہی تھی جس پر اینا اونیل، کے دستخط صاف نظر آ رہے تھے پھر معاً میری نظر آئینے پر پڑی میری بنفشی آنکھیں خود مجھے گھورنے لگیں میں...... میں کینڈرا اونیل کو نہیں...... اینا اونیل کو دیکھ رہی تھی میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی ہونے لگی میں نے اپنی زلفیں کھول لیں جو پھیل کر کولہوں تک لہرانے لگیں وہ بھی اس طرح اپنی زلفیں کھولے گھومتی رہتی تھی میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ کر اس کی ایک ایک چیز کو چھوا یہ میری اس ماں کا سامان آرائش تھا جس نے کبھی مجھے ان چیزوں کو چھونے نہیں دیا تھا ہاتھی دانت کے پاؤڈر بکس میں پاؤڈر اب بھی موجود تھا اس کی مخصوص مہک اب بھی برقرار تھی میں نے نرم و ملائم پف کو اپنے رخساروں پر ملا، ناک پر ملا پیشانی نے پر لگایا اس کی گہری سرخ لپ اسٹک

طلائی کیس میں موجود تھی جسے میں نے بھی استعمال کیا میں بالکل اسی کے انداز میں احتیاط سے لپ اسٹک لگانے لگی میں اسے ایسا کرتے ہوئے سیکڑوں بار دیکھ چکی تھی اس کا سینٹ اب بھی رکھا ہوا تھا میں نے کانوں پر لوؤں کے نیچے لگایا گردن پر لگایا وہ بھی ایسے ہی کیا کرتی تھی اور پھر میں اس کے کنگھے سے بال سنوارنے لگی۔

پھر میں نے دوبارہ آئینے کی طرف دیکھا میں اینا اونیل بن چکی تھی۔

اینا مجھے گھورنے لگی۔

اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

میں نے اپنی انگلیوں کو بھگو کر اپنی بھویں ٹھیک کیں تو وہ مسکرانے لگی۔

''فریڈ ڈیئر ذرا کنگن تو دینا۔''

ایک طویل قامت باریش شخص آئینے میں اینا کے ساتھ نمودار ہوا لیکن اس کے ہاتھ میرے اپنے شانوں پر تھے۔

''کینڈرا کیا کہہ......!'' اس نے ایک جھٹکے سے مجھے آئینے سے دور کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں گہری نیند سے بیدار ہو رہی ہوں۔

''لنک؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے مجھے فریڈ کیوں کہا کینڈرا؟'' اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا میں جواب نہ دے سکی یہ میرے پاپا کا نام تھا میں نے لپک کر ٹشو پیپر بکس سے کئی ٹشو نکالے اور جنونی انداز میں میک اپ صاف کرنے لگی میں نے دوبارہ آئینے کی طرف دیکھا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور پاؤڈر کی تہہ میں لکیریں بناتے ہوئے سرخ ہونٹوں تک پہنچ رہے تھے۔ میں اینا کا چہرہ صاف کرنے کے لیے باتھ روم

میں بھاگ گئی۔ میں اینا نہیں کینڈرا تھی لنک نے باتھ روم سے میری سسکیاں سنیں اور جب اندر آیا تو میں سنک پر جھکی رو رہی تھی۔

"پریشان مت ہو کینڈرا، میں یہاں موجود ہوں میں پہلے ہی جانتا تھا کہ اس کمرے میں آنے سے کچھ نہیں ہوگا چلو یہاں سے نکلو۔"

میں اس کے سینے پر سر رکھ کر آئینے والے چہرے کی یاد مٹانے لگی۔ پتہ نہیں، میں نے اینا کے سنگھار کا سامان کیوں استعمال کیا تھا میں نے آئینے میں اپنے بجائے اس کا چہرہ کیوں دیکھ لیا تھا کیا میں اس بند کمرے کو کھول کر اس کی روح کو قید سے آزاد کر بیٹھی تھی اپنی ماں کی روح کو.......

"لنک تم آج رات یہیں رہو گے ورنہ میں...... میں!"

اس نے میرے گیلے بالوں کی لٹ کو چھوتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے اب تم کھانا تیار کرو اور اس دوران میں اپنی جھونپڑی سے سامان لے آؤں مجھے صرف پانچ منٹ لگیں گے اس دوران تم اس کمرے کی طرف دیکھو گی بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں پژمردہ انداز میں ہنس پڑی۔ تمہاری غیر موجودگی میں اس کمرے کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گی۔"

میں اس کے ساتھ فرنٹ ڈور تک گئی اور پھر اسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ اوجھل نہیں ہو گیا میں باہر ہی بیٹھ گئی کیونکہ اندر جانے کے خیال ہی سے دل گھبرانے لگا تھا۔

فروری کی اس چاندنی رات میں، میں ہوا کے جھکڑوں کو محسوس کرتی رہی جو شور بھی مچا رہے تھے۔ پھر معاً مجھے اس بدنصیب خاندان کا خیال آنے لگا جس نے مکان نیلام میں خرید کر تباہی خرید لی تھی۔

میں نے اس خیال کے کرب سے بچنے کے لیے خوش گوار باتوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آنٹی ہیلن کا خیال ہی خوش گوار تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے جگر گوشے کی طرح پالا پوسا تھا وہ مجھے رات کو سونے سے پہلے کہانی ضرور سناتی تھیں اور پھر ان کی سنائی ہوئی ایک ایک کہانی مجھے یاد آنے لگی اور میں لاشعوری طور پر ہنسنے لگی۔

تبھی لنک واپس آ گیا۔

"یہ تبسم بہت خوش آئند تبدیلی ہے کینڈرا مگر اکیلے ہی اکیلے مسکرا رہی ہو، بڑی کنجوس ہو۔" میں اس کی آواز سن کر اچھل پڑی اور پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میرے ہنسنے کی کیا وجہ تھی وہ بھی ہنسنے لگا کیونکہ اس نے بھی بچپن میں یہی کہانیاں سنی تھیں۔

وہ داڑھی صاف کر کے آیا تھا اس کے بال اب الجھے ہوئے نہیں تھے کپڑوں پر کوئی دھبہ نہیں تھا اور وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"کھانا کیا پکایا ہے عورت۔" اس نے بڑے پیار سے پوچھا اور میں جھوم اٹھی اب مجھے کوئی خوف نہیں تھا اس کی موجودگی میں ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔

......☆☆☆......

میں صاف ستھرے بیڈ پر لیٹ گئی اور پھر میں نے بچپن کی وہی حرکت کی جو آنٹی ہیلن نے مجھے سکھائی تھی میں نے دونوں ہاتھوں سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اب میں سوتی ہوں میں خدا سے التجا کرتی ہوں کہ وہ میری روح کی حفاظت کرتا رہے اور دعا کرتی ہوں کہ خدا کل کا دن میرے لیے روشن کر دے خدا ہر ایک پر اپنا کرم کرے آمین۔"

میرا سر تکیے پر تھا اور کشیدگی کی بجائے بڑی راحت محسوس کر رہی تھی۔

پھر خواب شروع ہو گیا۔

پہلے تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میری روح جسم سے الگ ہو رہی ہے میں نے خود کو بستر پر سوتے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد میرے جسم کی تصویر دھندلا نے لگی ایسا لگا جیسے خواب آؤٹ آف فوکس ہونے لگا ہو لیکن نہیں...... بیڈ اب بھی واضح طور پر نظر آ رہا تھا یہی کیفیت فرنیچر کی بھی تھی پھر میں اپنے وجود سے الگ کھڑی ہو گئی اور بیڈ پر جسم کا دوہرا خاکہ دھندلانے لگا دھندلاتا چلا گیا۔

اگر چہ اب کمرے میں میرے دو وجود تھے لیکن سوچ اور فکر کی لہریں اس وجود سے نکل رہی تھیں جو بڑے عزم کے ساتھ دروازے کی طرف جا رہا تھا میرا وہ وجود جو متحرک تھا جانتا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔

میرا رخ ان کی خواب گاہ کی طرف تھا۔

میں نے دروازے کو کھولا تو وہاں اینا کو دیکھ کر حیرت زدہ نہیں ہوئی لیکن وہ میری موجودگی سے باخبر نہیں ہوگی۔

اینا نے وارڈ روب کھول کر ریشمی پھولدان گاؤن نکالا اور اپنے خوب صورت شانوں پر ڈال لیا پھر وہ کمر کی دوڑی احتیاط سے باندھنے کے بعد اسٹول پر بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی جب اس نے اپنی زلفوں میں کنگھا کیا تو وہ چمکنے لگیں۔

آئینے میں خود کو دیکھنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔

اس نے کمرے میں رکھی ہوئی واحد موم بتی اٹھائی اور پھر اس طرح ہال کی طرف بڑھنے لگی جیسے اس کے قدم زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

مجھے احساس ہوا کہ وہ بہت غصے میں ہے یا کسی خاص کام کو پورا کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

موم بتی کی روشنی میں وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گئی اس کا چمکدار گاؤن اس طرح لہرا رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر اڑ رہا ہو۔

میں اس کا تعاقب کرتی رہی۔ وہ ہال سے ڈرائنگ روم اور پھر ڈائننگ روم میں گئی، پھر وہ لنک کے کمرے میں جا کر موم بتی کی روشنی میں اسے گھورنے لگی لیکن پھر جب لنک نے کروٹ بدلی تو وہ ایک طرف ہٹ گئی اس کے بعد اس کے قدم میرے کمرے کی طرف اٹھنے لگے اس نے اندر جا کر بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی کو نظر انداز کر دیا کچھ ایسے جیسے وہ سمجھ رہی ہو کہ یہ صرف جسم ہے وہ کچھ تلاش کرنے لگی اس نے ہر دراز کھول دی اور ہر دراز کا سامان بکھیر ڈالا۔

''اوہ وہ پہلی بار بولی۔

''یہیں ہونی چاہیے وہ کہیں اور چھپا ہی نہیں سکتی تھی اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے وہ وعدہ خلاف نکلی اس نے معاہدے پر عمل نہیں کیا مگر اس نے کہاں چھپا دی؟''

اس کے ایک ایک لفظ سے پریشانی ٹپک رہی تھی، ہم کمرے سے نکل آئے لیکن اس سے قبل ہم دونوں نے ایک ساتھ بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا وہ اب بھی سو رہی تھی لیکن بے چین تھی۔ اس کے تاثرات تبدیل ہو چکے تھے وہ بار بار کروٹ لے کر آ ہیں بھر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سلوٹیں تھیں اضطراب تھا۔

ہم اسے چھوڑ کر باہر آ گئیں۔

اس کا رخ اب دو چھتی کی طرف تھا۔

ہم نے آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھیں لیکن پرانی سالخوردہ سیڑھیوں پر ہمارے پیر پڑنے کے باوجود بھی کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

تاریک دو چھتی میں موم بتی کی وجہ سے دھندلی روشنی پھیلنے لگی وہ بڑی تیزی سے سامان الٹنے پلٹنے لگی۔

"اوہ......!" اینا پھر دانت پیس کر بولی۔

"وہ اسی جگہ اس کے خط پڑھتی تھی اسے یہ گمان تھا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم......لیکن میں نے بھی ایک ایک خط پڑھ لیا تھا بے چاری ہیلن وہ تو صرف دوستانہ رویہ رکھتا تھا مگر ہیلن یہ سمجھ بیٹھی کہ وہ اسے دیوانہ وار چاہتا ہے وہ تو صرف مجھ پر عاشق تھا۔ ہیلن کو روز اول ہی سے یہ احساس کر لینا چاہیے تھا اوہ...... ممکن ہے اس نے اپنے خطوط کے ساتھ صندوق میں چھپا دیا ہو۔"

مگر وہاں کوئی صندوق موجود نہیں تھا لیکن ایسے آثار ضرور تھے جیسے یہاں کبھی کوئی چوکور چیز رکھی گئی تھی۔

"نہیں......!" اینا کانپ اٹھی۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ مجھے ہر صورت میں ڈائری پر قبضہ کر لینا چاہیے، ڈائری...... ڈائری...... ڈائری یہ لفظ اب میری سماعت پر ہتھوڑے مار رہے تھے صبح کے سورج کی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ سر میں درد ہو رہا تھا دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور میں آنکھیں پھاڑے چھت کو گھور رہی تھی۔

پھر کوئی چیز بیڈ سے پھسل گئی میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور پھر چیختے چیختے رہ گئی۔

یہ اینا کا وہی پھولدار گاؤن تھا۔

میں نے اسے خوف و دہشت کے عالم میں ایک طرف اچھال دیا میں نے اس سے پہلے کبھی یہ گاؤن نہیں دیکھا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ اسے بڑا پسند کرتی تھی۔ یہ یہاں کس طرح آیا میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچا اور اس مرتبہ میری چیخ نکل ہی گئی۔

کمرے کی حالت ابتر تھی درازیں کھلی پڑیں تھیں اور ان کا سارا سامان فرش پر بکھرا ہوا تھا کیا اینا کی روح واقعی یہاں آئی تھی؟

کیا وہ خواب نہیں تھا۔

میں شدت خوف سے کانپنے لگی اور میں نے کمبل کے اندر منہ چھپا لیا پھر جب کمبل کی گرمائی سے میری حالت بہتر ہوئی تو میں سوچنے لگی اسے کس چیز کی تلاش تھی میں نے یہ سوال اپنے ذہن سے کیا اور پھر فوراً یاد آ گیا کہ وہ ڈائری کو ڈھونڈ رہی تھی اسے خطوط کی بھی تلاش تھی جو ڈائری کے ساتھ کسی صندوق میں رکھے ہوئے تھے لیکن صندوق...... وہ چھتی میں نہیں تھا اس کی جگہ خالی تھی وہاں گرد و غبار سے صاف ایک چوکور نشان بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ سب خواب تھا میں نے خود کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹتے ہوئے خود سے کہا تو پھر گاؤن کہاں سے آ گیا یہ سوال بھی خود میرا ہی تھا۔

میں کمبل پھینک کر اٹھ بیٹھی۔ ابھی پوری طرح سورج طلوع نہیں ہوا تھا لیکن میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اب میں نے اگر آنکھیں بند کیں تو خواب اسی جگہ سے دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ جہاں اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا میں نے عجلت میں نائٹ گاؤن اتار کر سوئٹر پہنا اور جونہی آئینے کی طرف دیکھا تو میرا جسم کانپنے لگا میری آنکھوں کے سامنے کالے دھبے ناچنے لگے۔

"لنک......!" میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں لڑکھڑانے لگی مگر ہزار خواہش کے باوجود بھی بے ہوش نہیں ہو سکی آئینے میں نظر آنے والے عکس کا خوف مجھے جامد کر گیا وہ عکس مجھے اس وقت بھی گھور رہا تھا جب لنک اپنی مصنوعی ٹانگ کے باوجود نہ جانے کس طرح دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اس نے پہلے مجھے اور پھر کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کی طرف دیکھا اور پھر...... پھر مجھے گرنے سے قبل ہی سنبھال لیا۔ "کیا ہوا کینڈرا...... بولو...... بتاؤ کیا ہوا۔"

"وہ...... یہاں موجود تھی۔" میں نے سر سراتے

ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''کون؟''
''اینا۔'' یہ کہہ کر میں اس کی بانہوں میں جھول گئی۔
مجھے یاد نہیں کہ لنک نے مجھے کس طرح سنبھالا کس طرح بیڈ پر لٹایا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب میری آنکھیں کھلیں تو میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور لنک کولڈ کریم سے میرے گلے اور گالوں پر مالش کر رہا تھا۔ شاید وہ اس میک اپ کو اتار رہا تھا جو میں نے گزشتہ شب ان کی خواب گاہ میں کیا تھا اور جو میری کوشش کے باوجود صاف نہیں ہو سکا تھا۔
یادداشت بحال ہوتے ہی میں پھر کانپنے لگی اور میں نے احساس تحفظ کے لیے لنک کے دونوں ہاتھ تھام لیے اس کا جسمانی لمس ہی مجھے اس خوف سے بچا سکتا تھا۔ مجھے پرسکون ہونے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران لنک مجھے تسلیاں دیتا رہا پھر جب میری کیفیت بہتر ہوگئی تو اس نے بکھرا ہوا سامان جمع کر کے درازوں میں بھرنا شروع کردیا اس دوران میں تکیے پر سر ٹکائے اسے خواب کے بارے میں بتاتی رہی۔ میں نے اسے ریشمی پھولدار گاؤن اٹھا کر دکھانے کے لیے کروٹ بدلی اور گاؤن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں ایک دفعہ پھر سن ہو کر رہ گئی۔
خواب میں، اینا جو موم بتی لے کر ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اب وہی موم بتی میرے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔
لنک خاموشی سے گاؤن اور موم بتی کو دیکھتا ہوا میری باتیں سنتا رہا اور پھر جب میں خاموش ہوگئی تو اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔
''کافی پیو گی؟'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتی ہوئی اس کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ ہم دونوں اس ٹھنڈے کمرے سے گرم کچن میں آگئے اور چند ہی منٹ بعد جب میں نے گرما گرم کافی

کی چسکی لی تو میرے اعصاب کی تڑخ اور کشیدگی میں اچانک کمی ہوگئی۔
"کینڈرا......!" لنک نے دھیرے سے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ تم اس گھر میں محفوظ نہیں ہو۔"
"ہاں مجھے بھی ڈر لگنے لگا ہے لیکن لنک مجھے چند روز یہاں رہنا پڑے گا کیونکہ ابھی کام مکمل نہیں ہوا ہے۔ اگر میں سامان لیے بغیر ون شپ چلی گئی تو مس بیبل کو بڑی مایوسی ہوگی۔" میں نے کافی کا کپ دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے جواب دیا۔
"ممکن ہے کل رات کے واقعہ یا خواب کی ایک وضاحت بھی ہو میرا مطلب ہے کہ میں جب چھوٹی سی بچی تھی تو عام طور پر نیند کی حالت میں چلتی پھرتی رہتی تھی لیکن پھر جب میں آنٹی ہیلن کے ساتھ یہاں سے چلی گئی تو یہ کیفیت بھی ختم ہوگئی تاہم گزشتہ شب ممکن ہے کہ مجھ پر پھر اسی مرض کا دورہ پڑا ہو اور اس کی وجہ وہی ماحول وہی مکان اور کمرے ہوں جن کے باعث میں اس مرض میں مبتلا ہوئی تھی جہاں تک اینا کے میک اپ کا سوال ہے تو میں اس کی بھی نفسیاتی وجہ پیش کرتی ہوں جب میں چھوٹی سی تھی تو مجھے اینا کے میک اپ کا سامان بہت اچھا لگتا تھا لیکن اینا نے کبھی مجھے اپنی کوئی چیز چھونے تک کی اجازت نہیں دی۔ کبھی کبھار میں اینا کے قریب کھڑی ہو کر اسے میک اپ کرتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی لیکن ایک مرتبہ جب میں نے پرفیوم کی بوتل کو ہاتھ لگانا چاہا تو اس نے مجھے تھپڑ مار دیا اس کا جملہ مجھے ابھی تک یاد ہے اس نے کہا تھا کہ تم میری کسی چیز کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤ گی ممکن ہے کل رات میں نے جو میک اپ کیا وہ بچپن کی اسی خواہش کا ردعمل ہو۔"
"چلو ٹھیک ہے میں یہ بھی مانے لیتا ہوں کہ تم نے نیند کی حالت میں گاؤن اور موم بتی بھی نکالی لیکن کیا تمہیں خطوط اور ڈائری کی موجودگی کا پہلے سے علم تھا۔"
"نہیں۔" میں نے ذہن پر بار بار زور دینے کے بعد جواب دیا۔
"سنو، کینڈرا میں ماہر نفسیات نہیں ہوں۔" لنک نے پرتفکر انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تم نفسیات کا سہارا لے کر خود کو بہلا رہی ہو تمہیں یاد ہے میرے داخل ہوتے ہی تم نے کیا کہا تھا؟"
"نہیں مجھے یاد نہیں۔"
"تم نے کہا تھا وہ یہاں موجود ہے پھر میں نے نام پوچھا تو تم اتنا کہہ کر بے ہوش ہوگئی تھیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تم اس کی روح کو دیکھ رہی تھیں۔"
لنک کا چہرہ ڈھلا سا گیا اور میں بھی خوفزدہ ہوگئی مجھے واقعی اینا نظر آئی تھی۔
"تم روح اور بدروح کی موجودگی کے قائل ہو لنک۔" اس مرتبہ میں نے بڑے کمزور لہجے میں پوچھا۔
"میں کسی چیز کا قائل نہیں لیکن صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کل رات اینا او نیل اس مکان میں موجود تھی اور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں تم اپنی ماں سے زیادہ محبت نہیں کرتیں۔"
اس کا یہ تبصرہ کسی تھپڑ کی طرح لگا۔
"نہیں میں اس سے محبت کرتی تھی لنک۔"
"میں نے کبھی تمہیں اس کی گود میں نہیں دیکھا کینڈرا مجھے یاد ہے کہ تم اسے ممی یا مما نہیں بلکہ ہمیشہ اینا کہا کرتی تھیں اور اس کے برعکس تم نے کبھی اپنے والد کو فریڈ نہیں کہا ہمیشہ پاپا کہتی تھیں۔ اس کی وجہ کیا تھی؟"
"یہ اینا ہی کی ہدایت تھی کہ میں اسے مما نہ کہوں۔"
"لیکن تم اسے مما کہنا چاہتی تھیں یا نہیں؟" یہ بڑا

عجیب سا سوال تھا جس کا جواب دینے سے قبل میرا ذہن ماضی میں ٹھوکریں کھانے اور میرے حلق میں پھندے سے پڑنے لگے۔

"نہیں......" میں نے بمشکل جواب دیا اور اس کے ساتھ پھندے بھی غائب ہوگئے۔

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے کبھی مجھے مما نہیں کہنے دیا وہ آنٹی سے بہت مختلف تھی اس نے کبھی مجھے کوئی کہانی نہیں سنائی ایک بار جب میں نے اسے پاپا کی موجودگی میں مدر کہا تو وہ سنجیدہ ہوکر بولی تھی مجھے اینا کہا کرو کینڈرا میں اتنی کم عمر ہوں کہ ایک بچی کی ماں لگتی ہی نہیں اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ ماں کی حیثیت سے الرجی محسوس کرتی تھی اور یقیناً اسی باعث وہ ممتا کا اظہار بھی نہیں کرسکتی تھی لیکن آنٹی ہیلن اس سے بہت مختلف تھیں انہوں نے میری زندگی میں اس خلا کو پر کردیا جو اینا کو بھرنا چاہیے تھا میری آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی لیکن اس مرتبہ آنسو نہیں آئے۔

"کچھ بھی ہو آنٹی ہیلن تمہاری حقیقی ماں نہیں تھیں۔"

"میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے وہ پرانے زخم کھول رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اینا تمہیں بوجھ سمجھ کر پیار نہیں کرتی تھی شاید اسے تم سے نفرت بھی تھی اور ممکن ہے کہ اس کی روح تمہیں دیکھ کر سلگ اٹھی ہو اور اس کا مقصد یہ ہو کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔"

"یہ سب حماقت کی باتیں ہیں لنک۔" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں دو کام لے کر یہاں آئی ہوں پہلا یہ کہ نوادرات خرید کر لے جاؤں اور دوسرا یہ کہ اپنے والد کے نام پر لگا ہوا دھبہ مٹا دوں تاکہ لوگ انہیں قاتل نہ سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے کینڈرا فی الوقت میں شکست تسلیم کرلیتا ہوں لیکن صرف اس شرط پر کہ اب جب تک تم یہاں ہو میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا میں تمہیں تحفظ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس کی آنکھوں میں صرف پیار اور خلوص نظر آیا تو میں تمام غم بھلا کر جھوم اٹھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے دل و دماغ میں جلترنگ بج اٹھے۔

"کینڈرا۔" اس کی سرگوشی کسی حسین پکار کی طرح لگی "مجھے تم سے محبت ہے۔"

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی بس میرے آنسو بہہ نکلے اور وہ انہیں پونچھنے لگا۔

☆☆☆

دوچھتی کی سیڑھیاں گزشتہ شب کی طرح خاموش نہ رہیں اور جونہی ہم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو سارا زینہ زور زور سے احتجاج کرنے لگا یہ آواز سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ کل میں نے زینے پر چڑھنے کا خواب ہی دیکھا تھا وہ حقیقت نہیں تھی میں صرف ایک موم بتی کی روشنی میں یہاں رات کے وقت ہرگز نہیں آسکتی تھی۔ لیکن اینا...... ہاں، اگر وہ روح تھی تو وہ ضرور آسکتی تھی ویسے بھی مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں جس سے اینا کبھی ڈری ہو۔

لنک نے اپنے مضبوط کندھوں اور ہاتھوں کی مدد سے زنگ آلود دروازے کو بمشکل کھولا جبکہ خواب میں یہ دروازہ بڑی آسانی سے کھل گیا تھا۔

دوچھتی میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور ایک طرف روشن دان نما کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

"لنک......!" میں نے اس کا بازو تھام لیا۔

"خواب میں اینا اسی کھڑکی کے قریب صندوق تلاش کررہی تھی۔ جو اسے نہیں ملا تھا میرا خیال ہے کہ

صندوق آنٹی کی ملکیت تھا لیکن مجھے ایٹھنز میں آنٹی کے سامان میں بھی کوئی صندوق نہیں ملا تھا۔"

ہم کاٹھ کباڑ سے بچتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھ گئے اور سب سے پہلے لنک ہی وہاں تک پہنچا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں ہے کینڈرا۔"

میں پل بھر میں اس کے قریب پہنچ کر فرش کو گھورنے لگی۔

وہاں گرد و غبار سے صاف ایک چوکار نشان بنا ہوا تھا۔

جیسے کوئی وزنی چوکور چیز یہاں سے اٹھا کر لے جائی گئی ہو۔

"اب بولو کینڈرا تم نے جو منظر اور واقعات بیان کیے تھے وہی سچے ثابت ہو رہے ہیں اگر تمہیں اینا نے صندوق کے بارے میں نہیں بتایا تو پھر کس نے تمہیں اطلاع دی تھی کہ صندوق دوچھتی میں ہے اور وہاں صندوق کی جگہ خالی نشان ہے۔"

"میں روحوں پر یقین نہیں رکھتی لنک۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا وہ یقیناً یہ ثابت کرنا چاہ رہا تھا کہ رات کو میں نے خواب نہیں دیکھا مجھ پر جو کچھ بھی گزری وہ حقیقت تھی۔

"تمہیں اب حقیقت پر یقین کر لینا چاہیے۔"

"نہیں یہ بتاؤ کہ کیا میرے آنے سے قبل کوئی اور اس مکان میں آیا تھا۔"

"نہیں، لیکن کیونکہ میری جھونپڑی خاصی دور ہے لہٰذا کوئی بھی چوری چھپے داخل ہو سکتا تھا۔"

"ممکن ہے، ڈین کو صندوق کے بارے میں کوئی علم ہو کیوں نہ ہم اس سے بات کر لیں۔"

"ڈین۔" لنک کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ کر مسکرانے لگی۔

"اس سے تم ہی بات کر لو تو بہتر ہے میں یہیں رہوں گا۔"

یہی زیادہ بہتر تھا کیونکہ یقیناً میرا وجود ان دونوں کے درمیان وجہ عناد بن سکتا تھا اور میں نہ جانے کیوں ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں دیکھنا چاہتی تھی میری دلی خواہش یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کا احترام کریں اور بس۔

میں لنک کو خدا حافظ کہہ کر اسٹیشن ویگن میں نکل گئی مگر عقب نما دور تک چغلی کھاتا رہا کہ لنک ڈیوڑھی پر کھڑا ہوا گاڑی کی طرف ہی دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

ڈین مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل گیا۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کر سکی کیونکہ ان آنکھوں سے محبت صاف جھلک رہی تھی۔ پھر جب اسے یہ علم ہوا کہ لنک رات کو بھی مکان ہی میں سوتا ہے تو اس کے چہرے پر غصے کے واضح تاثرات ابھر آئے جنہیں میں نے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے مدعا بیان کیا۔

"صندوق۔" اس نے کافی کا کپ میرے سامنے رکھتے ہوئے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر اس کے ماتھے سے شکنیں دور ہو گئیں۔

"ہاں مجھے یاد ہے ورجل سرگس اسے لے گیا تھا اس کی دادی ایما کا دعویٰ ہے کہ وہ تمہارے پیم بروک کی عزیزہ ہے تمہاری آمد سے چند روز قبل ورجل میرے پاس آیا تھا۔ اس کے مطابق صندوق ایما کی ملکیت تھا لہٰذا میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا صرف اتنا پوچھا کہ اس میں کیا تھا اس نے بتایا کہ ایسے کاغذات تھے جن کا تعلق سرگس خاندان کے شجرہ نسب سے ہے اگر اس صندوق میں تمہارے کام کی کوئی چیز ہو تو ایما سے مل لو۔"

"ضرور۔" میں نے فوراً ایما سے ملنے کا فیصلہ کر لیا

اور وہ بڑی محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہ گیا کیونکہ میں نے تو بچپن ہی میں لنک کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب ڈین کی گرم جوشی اسی فیصلے کو کمزور کرنا چاہتی تھی مگر...... میں جانتی تھی اگر میں نے فیصلہ بدلا تو لنک ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائے گا۔

......☆☆☆......

بوڑھی ایما سے ملاقات کامیاب ثابت نہیں ہوئی نوے سالہ ایما اپنی بوڑھی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی اور یوں مجھے واپس آنا پڑا ناکام و نامراد ایما نے کسی صندوق یا کاغذات کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا اسے ڈائری کا بھی کوئی علم نہیں تھا میں نے اس کی ایک بات نوٹ کی تھی کہ ڈائری کا نام سنتے ہی ایما کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے چمک اٹھی تھیں اور جب میں نے آنٹی ہیلن کا حوالہ دیا تھا تو اس کے بوڑھے اور پلپلے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے شاید یہ یادوں کے رنگ تھے وہ آنٹی ہیلن سے بہت محبت کرتی تھی اس نے دوران گفتگو مجھ سے کہا تھا "گڑے مردے مت اکھیڑو جو مر گئے انہیں مرا رہنے دو کیونکہ اب ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا۔"

پھر جب اس نے میری زبانی یہ سنا کہ لنک میرے ساتھ ہی رہ رہا ہے تو اس کی آنکھیں بجھ گئیں اور وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اپنی سادہ لوح ماں کی طرح کوئی غلطی مت کر بیٹھنا۔"

میں کچھ نہیں سمجھ سکی کیونکہ اسے تو اینا سے نفرت تھی اور وہ اینا ہی کو سادہ لوح کہہ رہی تھی۔

......☆☆☆......

ایما سے ملاقات کے بعد مجھے بہر حال سکون حاصل نہیں ہوا کیونکہ ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ صندوق کس کے پاس ہے لیکن مجھے اس بات پر سو فیصد یقین تھا کہ ایما سب کچھ جانتی ہے مگر بتانا نہیں چاہتی۔

اس رات مجھے کوئی خواب نظر نہیں آیا اور میں سکون کی نیند جی بھر کر سوتی رہی لیکن مجھے نیند کی حالت میں بھی یہ ضرور یاد تھا کہ میں اسٹار پیلس میں ہوں اسی عمارت میں جہاں میرے والدین کا قتل ہوا تھا۔

لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اگلی صبح ایما کی ہدایت پر ور جل کیا کرنے والا ہے۔

......☆☆☆......

"ناشتہ لاؤ پیاری لڑکی۔" لنک ورزش کرنے کے سے انداز میں اور جماہی لیتا ہوا کچن میں داخل ہوا تو میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پیارا نظر آرہا تھا ہم نے ناشتہ ختم کیا اور ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہم نے پولیس سائرن کی آواز سنی اور گھبرا کر فرنٹ ڈور کی جانب بھاگنے لگے پولیس کار دھواں اڑاتی ہوئی ہمارے ہی احاطے میں داخل ہو رہی تھی میں دم بخود رہ گئی۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہونے لگا اور جب میں نے منحوس صورت شیرف کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا تو مجھے متلی سی ہونے لگی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا بلا اجازت گھر میں گھس آیا۔

"آہ...... تو تم دونوں پکڑے ہی گئے۔" اس نے سگار دانتوں سے ہونٹوں تک منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" لنک کے چہرے پر غیظ و غضب کے تاثرات ابھرنے لگے اور میں بھی غصہ سے کھول اٹھی لیکن ہم واقعی اس کے منفی انکشافات کا مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے۔

"مس کینڈرا۔" شیرف نے پر ہوس نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ اسٹار پیلس میں کوئی غیر قانونی حرکت ہو رہی ہے۔"

"ہم کسی غیر قانونی حرکت میں ملوث نہیں شیرف۔" اس مرتبہ میں نے جواب دیا یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ شیرف نہ صرف جاہل مطلق ہے بلکہ وہ جو قانونی اصلاحات استعمال کرتا ہے اسے اس کے معنی بھی معلوم نہیں ہوتے۔ اس کا کام تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی معلوم ضابطے کے تحت مقدمہ بنا کر ٹاؤن کمیٹی کے اٹارنی کو مطلع کر دے اور بس۔

"ہم۔" اس نے لفظ ہم پر خاص زور دیا اور پھر مسکرانے لگا اس کی یہ مسکراہٹ خباثت سے بھری ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اور لنک دونوں ایک ساتھ اس عمارت میں مقیم ہو۔"

میں غصے سے تلملا کر رہ گئی۔

"شیرف۔" میرے اندر کی پڑھی لکھی لڑکی نے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اس عمارت میں لنک اور میں رہ رہے ہیں تو میرا جواب اثبات میں ہے اور اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم یہاں رہتے ہوئے کسی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں تو یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔"

"میں وارنٹ لایا ہوں۔" شیرف کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا شاید پہلے کبھی کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

"کس کی رپورٹ پر؟"

"اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں تم دونوں پر غیر فطری آوارگی کا الزام لگایا گیا ہے۔"

"کیا؟" مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا اس اصطلاح کے معنی مجھے اچھی طرح معلوم تھے لہٰذا میں حیرت اور نفرت سے شیرف کو گھورنے لگی خود شیرف کا ایک نائب بھی ندامت سے فرش کو گھورنے لگا۔

"سنو شیرف۔" میں نے غرا کر کہا۔ "لنک کو دیکھو یہ مرد ہے اور اگر یہ ثبوت حاصل کرنا ہے کہ میں عورت ہوں تو کسی عورت کو بلوا لو اور کیونکہ اس عمارت میں رہ کر ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں رہے ہیں لہٰذا یا تو وارنٹ دکھاؤ یا پھر چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ تم سارے ملک میں کسی کتے کی طرح بدنام ہو جاؤ گے۔"

اسی لمحے عقب سے تالیوں کی آواز سنائی دی میں جو غصے میں بپھری ہوئی تھی حیران ہو کر دیکھنے لگی ڈین نفیس ترین سوٹ میں ایک انتہائی معقول اور پڑھے لکھے شخص کے ساتھ تالیاں بجا رہا تھا۔

"واہ...... کینڈرا...... شیرف کو علم ہو گیا ہو گا کہ تم اس علاقے کی ان لڑکیوں میں شامل نہیں ہو جو ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور اب ملو میرے بہترین دوست سے اس علاقے کے بہترین وکیل ہرب گورونف گورڈن، اب معاملہ سنبھال لو۔"

"ذرا وارنٹ تو دکھانا شیرف۔" گورڈن نامی اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے دو وارنٹ دیکھنے ہیں پہلا گرفتاری کے لیے اور دوسرا گھر میں داخل ہونے کے لیے۔"

شیرف نے گھبرا کر صرف ایک وارنٹ جیب سے نکالا اور گورڈن کی طرف بڑھا دیا جس نے ایک سرسری نظر ڈال کر فوراً واپس کر دیا۔

"مس کینڈرا درست کہتی ہیں یہ وارنٹ کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ لنک اور کینڈرا دونوں ہی مرد نہیں۔ اب میرا خیال ہے کہ مس کینڈرا ضابطہ اڑتیس کی شق نمبر پندرہ کی ذیلی شق نمبر ۱۳ بی کے تحت تم پر مداخلت بے جا، شق نمبر ۱۳ اے اور زیڈ کے تحت دشنام طرازی ایک سو انیس الیف کے تحت سکون درہم برہم کرنے ایک سو نو کی شق نمبر ڈی کے تحت گھر میں گھس کر دھمکی دینے اور......!"

اس سے پہلے کہ گورڈن قانون کی پوری کتاب

کے ضابطے شیرف کے خلاف استعمال کرتا شیرف اپنے ساتھیوں سمیت تیزی سے فرنٹ ڈور کی طرف بڑھا اور بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غالباً کار بھی دوسرے یا تیسرے گیئر میں اٹھائی جو جلدی ہی گرد و غبار میں گم ہوگئی۔

ہمارے قہقہے پرانی عمارت کے در و دیوار کو لرزانے لگے پھر میں نے جب ان لوگوں کے سامنے کافی رکھی تو مجھے میرے سوال کا جواب پوچھے بغیر ہی مل گیا۔

"کل میں یہ رپورٹ درج کرانے کیلئے تھانے گیا تھا کہ اسٹار پیلس سے ایک صندوق غائب ہے لہٰذا وہیں مجھے اس سازش کا علم ہوا جو تم دونوں کے خلاف بنائی جا رہی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے لنک کی طرف سپاٹ انداز میں دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"وہاں ایما کا پوتا ورجل موجود تھا اور اس نے یہ شکایت کی تھی کہ تم دونوں اسٹار پیلس میں اخلاق باختہ حرکتیں کر رہے ہو، میں فوراً سمجھ گیا کہ ایما کسی نہ کسی طرح تمہیں یہاں سے چلے جانے پر مجبور کرنا چاہتی ہے تم مجھے کل ہی بتا چکی تھی کہ وہ صندوق کے وجود ہی سے ناواقف ہے اب میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اس صندوق میں یقیناً ایسی چیز ہے جو ایما تمہیں دینا نہیں چاہتی۔"

......☆☆☆......

ان کے چلے جانے کے بعد بھی لنک خاموش رہا تو میں اس کی آزردگی کی وجہ سمجھ گئی وہ ڈین کو دیکھ کر ایک بار پھر رقابت کی آگ میں جل اٹھا تھا۔

"ارے......لڑکے......!" میں نے اسے برسوں پہلے کی طرح آواز دی۔

"کسی سے اتنا حسد مت کیا کرو۔"

"میں......!" وہ تلملا کر بولا اس کے چہرے پر جلن کے آثار دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ رقابت اور حسد میرے لیے لنک کی محبت کا ٹھوس ثبوت تھی۔ میرے پاس ہے ہی کیا کینڈرا وہ بہت امیر آدمی ہے اور میں صرف ایک نوکر ہوں۔"

"تمہارے پاس ایک ایسی چیز ہے جو ڈین کے پاس نہیں۔"

"وہ کیا؟"

"کینڈرا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر یہ سنتے ہی اچانک مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں۔

غلط فہمی کا غبار ڈھل گیا تو وہ سکون سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں صندوق واپس چاہیے؟"

"ہاں......کیوں نہیں......لیکن......!"

"بس فکر مت کرو مل جائے گا میں ورجل سے بہت اچھی طرح واقف ہوں اور مجھے اس کی ایک ایسی کمزوری کا بھی علم ہے جسے سن کر تم حیرت زدہ رہ جاؤ گی۔"

"وہ کیا؟" میں نے تجسس سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

"وہ شادی شدہ نہیں اور عورتوں سے ڈرتا ہے۔"

"اوہ......!" میں ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔

"ایک مرتبہ دو عورتوں نے اسے جنگل میں گھیر لیا تھا وہ اس طرح بھاگنے لگا جیسے کوئی ناکتخدا لڑکی غنڈوں میں پھنس گئی ہو، پھر شور کی آواز سن کر شیرف بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے جو منظر دیکھا وہ بڑا حیرت ناک تھا ورجل تڑپ رہا تھا اور وہ دونوں عورتیں اسے نوچ کھسوٹ رہی تھیں۔ شیرف نے بہر حال اسے بچا لیا۔"

"دھت تیرے کی۔" میں نے صوفے پر دھپ

مارتے ہوئے کہا۔
"مگر ورجل کو ڈرانے سے کیا فائدہ ہوگا؟"
"مجھے یقین ہے کہ اسے صندوق یا کاغذات کا علم ضرور ہوگا اور وہ ان دونوں عورتوں کو دیکھ کر سب کچھ اگل دے گا۔"
میں ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی لیکن میں نے لنک کے منصوبے پر کوئی اعتراض نہیں کیا مجھے تو ڈائری اور خطوط سے دلچسپی تھی۔

......☆☆☆......

اسی روز سہ پہر کو ڈین اور گورڈن دونوں پھر آ دھمکے۔
"تمہیں اسٹار پیلس کی تاریخ سے دلچسپی تھی نا۔" ڈین نے لنک کی موجودگی کے باوجود محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں، گورڈن کو پھر لے آیا ہوں، یہ تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔"
"اوہ، شکریہ گورڈن، میں ہر اطلاع کے عوض معقول......!"
"بکواس بند......!" گورڈن نے پرشفقت انداز میں کہا "میں نے صرف یہ سوچ کر محنت کی ہے کہ میں اپنی بہن کی مدد کروں گا تمہیں دیکھتے ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے...... جیسے میری بہن واپس آ گئی ہو جو بچپن ہی میں ہلاک ہوگئی تھی۔"
کمرے میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے سسکی لی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا بہن...... یہ لفظ کتنا پاکیزہ اور کتنا مقدس ہوتا ہے اس میں کتنی مٹھاس ہوتی ہے اس کا مجھے پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔
لنک حیرت سے گورڈن کی طرف دیکھتا رہا شاید وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا ورسائل میں ایسے اچھے لوگ بھی ہیں۔
"میں ورسائل کا رہنے والا نہیں ہوں۔" گورڈن نے حلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی اور ڈین تو ایک ٹک مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ ڈین اور گورڈن کی بہن میں وہی تعلق تھا جو...... بچپن میں میرا اور لنک کا تھا۔
"مجھے اسٹار پیلس کے بارے میں بنیادی اطلاعات حاصل کرنے میں قدرے دشواری تو ہوئی لیکن...... جب کامیابی ہوئی تو ساری تھکن دور ہوگئی۔ عام لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اس عمارت کا نام اسٹار پیلس کیوں پڑا آس پاس کی کوئی جگہ...... کوئی کاؤنٹی اس نام کی نہیں یہ عمارت ۱۷۶۴ء میں تمہاری والدہ اور خالہ کے اجداد نے تعمیر کرائی تھی اور جد امجد کا نام ٹموتھی ہیگن تھا وہ آئرلینڈ میں پیدا ہوا تھا اس نے جس زمانے میں یہ زمین خریدی تو اس کو اسٹاف پیلس ہی کہا جاتا تھا حالانکہ اس وقت یہ لق و دق صحرا تھا دلدل تھی اور یہاں کسی قسم کا کوئی مکان نہیں تھا۔ لہٰذا اسٹار پیلس کا نام اس وقت بھی موجود تھا جب ہیگن نے زمین خریدی۔ میں نے بعض قدیم دستاویزات کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ پہلے اس جگہ کو اسٹریٹ آف پیلس کہا جاتا تھا ان قدیم کاغذات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں ایک جنگ لڑی گئی تھی اور کسی نہ کسی وجہ سے اس مقام کو حکمت عملی کے باعث اسٹریٹ آف پیلس کہا جانے لگا تھا میرا خیال ہے کہ یہی نام بگڑ کر اسٹار پیلس ہوگیا۔"
"اوہ...... مگر یہ عمارت تو میری ننھیال پیم بروک کی ملکیت رہی ہے اگر ہیگن......!"
"ہیگن خاندان کی ایک لڑکی نے کسی پیم بروک سے شادی کر لی تھی اور صرف وہی واحد وارث تھی لہٰذا اس کی موت کے بعد شوہر وارث ہوا اور یوں یہ عمارت

پیم بروک کی ملکیت بن گئی قانونی اعتبار سے یہ اب بھی ہیلن پیم بروک کی ملکیت ہے کیونکہ وراثت نامے میں صاف لکھا ہے کہ اگر کوئی لڑکا وارث نہ ہو تو جائیداد اس لڑکی کو ملے گی جس نے شادی نہ کی ہو اور اگر لڑکی یا تمام لڑکیاں شادی شدہ ہوں تو یہ مساوی تقسیم ہو جائے گی۔"

"میرے خدا۔" میں نے سر تھام لیا لیکن مجھے اب اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اسٹار پیلس قانوناً کس کی ملکیت ہے میں تو صرف یہی سوچ رہی تھی کہ اس عمارت میں کتنے لوگ پیدا ہوئے ہوں گے کتنی نسلیں پروان چڑھی ہوں گی اور یہ بھی کہ کیا میں ان نسلوں کی آخری فرد ہوں۔

اگلے روز لنک نے وہ کر ہی دکھایا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا اگرچہ اسے صندوق اور ڈائری نہیں ملی لیکن وہ کاغذوں کا ایک پلندہ ضرور لے آیا تھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ ورجل اپنی بے حرمتی کے باوجود ڈائری نہیں دے سکا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈائری اس کے پاس نہیں ہو گی ورجل کے مطابق اس نے صندوق مقامی نیلام گھر کے مالک مسٹر کروچ کو فروخت کر دیا تھا۔

لنک کی واپسی رات گئے ہوئی تھی لیکن میں سونے کے بجائے کاغذوں کا پلندہ کھولنے پر مصر تھی میں نے بے صبرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلندہ اس سے چھین کر کھول لیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

یہ دو درجن خط ہیلن پیم بروک کے نام تھے آنٹی ہیلن کے نام...... ان پر اسٹار پیلس ورسائل جارجیا کا پتا لکھا ہوا تھا میں نے اپنے والد کی تحریر فوراً پہچان لی اور میرا دل دھڑکنے لگا ہر لفافے پر کولمبس جارجیا کی مہر تھی سب سے پرانی مہر پر ۱۹۴۴ء اور آخری مہر پر ۱۹۴۷ء درج تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے تمام خطوط تاریخ وار اوپر تلے رکھے اور پھر پہلا خط اٹھا لیا۔

"پیاری ہیلن سمندر پار ہونے کی وجہ سے میں تمہیں خط نہیں لکھ سکا، مجھے معاف کر دو لیکن اتنا احساس ضرور کر لینا کہ توپوں کی گھن گرج کے دوران چھوٹی سی خندق میں بیٹھ کر گولیوں سے بچتے ہوئے خط لکھنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے اب خدا کا شکر ہے کہ میں گھر واپس آ گیا ہوں میرے زخم کے بارے میں فکر مند مت ہونا ہلکا سا زخم تھا لیکن اسی زخم کی وجہ سے مجھے ڈسچارج بھی ہونے کا موقع ملا ہے کیا تمہارے پاپا اس سال مجھے کام کاج پر رکھ لیں گے میں جانتا ہوں کہ جب پہلی بار میں نے تمہارے گھر میں ملازمت حاصل کی تھی تو بہت کم عمر تھا اب تو بڑا ہو گیا ہوں اور جنگ نے مجھے محنت اور سختیوں کا عادی بنا دیا ہے تم سے ملنے کی بڑی آرزو ہے کیونکہ اب تم یقیناً مکمل عورت بن چکی ہو گی تم نے جو تصویر بھیجی ہے وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے۔

پرخلوص تمناؤں کے ساتھ

فریڈ اونیل

میں نے پنسل لے کر حساب لگایا اس خط سے سب سے پہلا انکشاف یہ ہوا تھا کہ میرے والد لڑکپن میں بھی پیم بروک کی ملازمت کر چکے ہیں ایک انکشاف یہ بھی ہوا تھا کہ جنگ کے دوران آنٹی اور پاپا میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی خط پر پڑی ہوئی تاریخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت آنٹی کی عمر ستائیس سال اور پاپا کی عمر تیس سال تھی جبکہ اپنا صرف ۱۴ سال کی لڑکی تھی مجھے یہ علم تھا کہ میرے نانا اور نانی دونوں ۱۹۴۴ء کے اختتام تک فوت ہو چکے تھے اور شاید یہ ایک ایسی بات تھی جس کا پاپا کو یہ خط لکھتے وقت علم نہیں تھا۔ ۱۹۴۴ء میں نانا کے انتقال کے

بعد آنٹی ہیلن نے جائیداد اور فصلوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اگلے چند خط بھی عام نوعیت کے تھے جن سے یہ پتا چلتا تھا کہ آنٹی نے پاپا کو ورسائل آنے اور اپنا ہاتھ بٹانے کی درخواست کی تھی پھر خطوط کی تاریخوں میں نمایاں فرق ہو گیا اور ۱۹۴۵ء کے کرسمس تک کوئی خط تک نہ ملا غالباً اس درمیانی عرصہ میں پاپا ورسائل ہی میں رہے تھے لہٰذا خطوط کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اگلا خط ۱۹۴۵ء کے کرسمس ڈے سے قبل لکھا گیا تھا۔

"پیاری ہیلن تمہارے بغیر وجود بے معنی لگتا ہے۔ میرے ذہن سے تمہارا تصور محو ہی نہیں ہوتا میں جانتا ہوں کہ تمہیں کرسمس کے موقع پر میرا انتظار ہوگا لیکن بعض خاندانی مسائل نے مجھے یہاں باندھ رکھا ہے میں چشم تصور میں تمہارا مخروطی چہرہ اور روشن آنکھیں دیکھ رہا ہوں، تمہاری مسکراہٹ بھی مجھے بے چین کیے دے رہی ہے اگر میں نے تمہارے بارے میں عارضی طور پر سوچنا بند نہ کیا تو میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔

خدا کرے تمہیں اور ننھی اینا کو میرے تحائف مل گئے ہوں میرا انتظار کرنا اب واپسی میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔"

پیار کے ساتھ فریڈ

تو ۴۵ء کے کرسمس تک حالات میں قیامت خیز تبدیلی ہو گئی تھی آنٹی اور پاپا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔

خطوط کے ناغے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ۴۷ء کے ابتدائیوں میں آنٹی ہیلن کے پاس ورسائل پہنچ گئے تھے آنٹی کی عمر اسوقت تیس سال، پاپا کی چھبیس سال اور مدر اینا کی عمر سترہ سال تھی وہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ عورت پن کی حدود کو چھو رہی تھی۔

پاپا نے ورسائل پہنچنے سے قبل ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء کو جو خط لکھا تھا اس میں ڈھیروں مسرتیں پنہاں تھیں۔ اس کا آغاز ڈارلنگ ہیلن سے اور اختتام میں تم سے محبت کرتا ہوں فریڈ...... پر ہوا تھا۔

میرا دل دھڑ کنے لگا۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ایما پاپا اور آنٹی کے بارے میں سچ ہی کہتی تھی۔ لوگ بھی سچ کہتے تھے انہیں ایک دوسرے سے محبت تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اس چاہت کے باوجود پاپا نے اینا سے شادی کیوں کر لی؟

۲۰ جون ۴۷ء کا خط بہت مختلف اور بڑا عجیب سا تھا۔

"ڈیئر ہیلن، میں جانتا ہوں کہ میری حرکت سے تمہیں کتنا دکھ ہوگا تمہارے بھرپور غم اور کرب کا احساس مجھے تمہارے خط سے ہو چکا ہے اور میں شرمندہ ہوں۔

تم ورسائل سے یہاں کیوں نہیں آ جاتیں، میرے، اور اینا کے ساتھ رہو کچھ عرصہ ہی کے لیے سہی میں ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہوں۔

مخلص...... فریڈ اور...... اینا

......☆☆☆......

پتا نہیں میں کب تک ان خطوط کو پڑھتی رہی میں تو ان میں اتنی منہمک ہو گئی تھی کہ مجھے لنک کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا اور اس نے اس وقت تک ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ جب تک آخری خط پڑھ کر طویل سانس نہیں لے چکی تھی۔

"نہیں لنک ان خطوط سے اصل معمے کی کلید نہیں ملتی، ڈائری ضروری ہے لیکن ممکن ہے کہ ڈائری کا کوئی وجود ہی نہ ہو سب خواب کی باتیں ہوں۔"

"ان خطوط سے کچھ معلوم نہیں ہوتا؟"

"نہیں بلکہ چند نئے سوالات ابھر آئے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں، کیسے سوالات۔"

"یہ محبت بھرے خطوط ہیں لنک۔"

"تو کیا ہوا آنٹی ہیلن نے یقیناً کسی نہ کسی سے ضرور محبت کی ہوگی اور اس کے خطوط سنبھال کر رکھے ہوں گے۔"

"ہاں...... اور وہ شخص کوئی اور نہیں لنک میرے پاپا تھے ان کا ایک خط اینا سے شادی کے وقت کا تھا یہ سمجھ لو چند ماہ قبل لکھا گیا تھا پھر آخری خط شادی کے بعد کا ہے جب وہ اینا کے ساتھ کولمبس میں مقیم تھے۔"

"اوہ......!" لنک ہاتھ ملنے لگا۔ "تب پھر ان افواہوں میں تھوڑی بہت صداقت ضرور تھی۔"

"سوال یہ ہے کہ پاپا نے شادی کے فوراً بعد آنٹی ہیلن کو کولمبس آنے کی دعوت کیوں دی کیا یہ عجیب نہیں لگتا کہ محبوبہ کی چھوٹی بہن سے۔"

ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے میں صرف یہ سوچتی رہی کہ ڈائری کہاں ہے؟ میں نے ذہن پر زور دینا چاہا مگر ڈر گئی کیونکہ اس طرح صرف اور صرف اینا کی شبیہہ ابھر رہی تھی۔ ممکن ہے اینا پھر واپس آ کر ڈائری کی تلاش میں میری مدد کر سکے۔

"کینڈرا۔" بہت دیر بعد لنک نے دھیرے سے مجھے آواز دی تو میں سوالیہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"تمہارے پاپا اور ممی...... دونوں اس وقت یہاں آئے تھے جب تمہاری عمر بمشکل چار سال تھی کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ کولمبس سے ورسائل کیوں آ گئے تھے؟"

"نہیں لنک۔" میں نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے جواب دیا جو درد سے پھٹنے لگی تھیں۔

"یہ سب اچانک ہی ہوا، مجھے ایک دن مما...... اینا...... نے کپڑے بدلنے کے لیے کہا اور ہم کولمبس سے ورسائل آ گئے پھر یہاں ایک روز پاپا نے اینا کو بتایا کہ کولمبس میں ان کی دکان کا سودا ہو گیا ہے اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ ہم اب ہمیشہ یہیں رہیں گے۔"

"میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔" لنک نے بھی مضمحل لہجے میں جواب دیا۔

"یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے کہ تمہاری مما ورسائل کے لوگوں کی سرگوشیوں کے باوجود آنٹی کی چھت کے نیچے رہنے پر آمادہ ہو گئی ہوں گی میں جانتا ہوں کہ اینا کو ورسائل سے نفرت تھی۔"

"ہاں وہ یہاں کے لوگوں سے بھی اور آنٹی ہیلن سے بھی نفرت کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ آنٹی کی موجودگی میں وہ پاپا سے محبت کی باتیں کرتی رہتی تھیں سوال یہ بھی ہے کہ آنٹی اس کرب کو کیوں برداشت کرتی رہیں وہ انہیں گھر سے نکال سکتی تھیں۔ مجھ سمیت اسٹار پیلس ان کی ذاتی جائیداد تھی لیکن شاید وہ پاپا کی موجودگی ہی کو غنیمت سمجھتی تھیں اور انہیں صرف نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے وہ اینا کے دیے ہوئے کرب کو برداشت کرتی رہی تھیں۔"

"تم نے کبھی خود کو آزمائش میں نہیں پایا؟"

"نہیں مجھے کبھی ان کی آپس کی نفرت کا احساس بھی نہیں ہوا مجھے آنٹی ہیلن اور پاپا کے تعلقات کا کوئی علم نہیں تھا میں صرف اتنا جانتی تھی کہ پاپا اور آنٹی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اینا مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن آنٹی ہیلن نے مجھے کبھی ممتا سے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔"

لنک مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آیا۔

"چلو...... اب سو جائیں۔"

"لنک۔" میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مجھے صرف یہ یاد رہا کہ وہ بھی

میرے ہی کمرے میں سونے کی تیاری کررہا تھا۔

وہ رات خوشیوں کی رات تھی۔

''تمہیں پچھتاوا تو نہیں کینڈرا۔'' اس نے کمبل گردن تک کھینچتے ہوئے پوچھا ''کیونکہ میں ایک ٹانگ سے......!''

''پلیز لنک اس کا ذکر مت کرو اگر تمہارا جسم بھی ختم ہو گیا ہوتا تب بھی میں تمہاری روح سے محبت کرتی رہتی۔'' میں نے تڑپ کر کہا اور وہ ہنسنے لگا میں جانتی تھی کہ وہ بہت خوش ہے میں بھی بہت خوش تھی میری مراد برآئی تھی۔

پھر میں سو گئی۔

......☆☆☆......

گولیوں کی آواز سن کر میری آنکھ اچانک ہی کھل گئی۔ لنک بیڈ پر نہیں تھا میں نے خوف و دہشت کے عالم میں چیخ پاری اور گھبرا کر موم بتی جلائی مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں اٹھ کر باہر جا سکتی لہٰذا میں بے بس پرندے کی طرح تڑپ کر رہ گئی میرے دل کی گہرائیوں سے لنک کے لیے دعائیں نکلنے لگیں اور ذہن میں برے برے خیالات آنے لگے۔

''خدایا......اسے حفظ وامان میں رکھنا۔'' اس وقت میں صرف یہی دعا مانگ رہی تھی اور پھر خدا نے میری دعائیں سن لیں وہ واپس آ گیا مگر اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس نے مجھے ایک طرف رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے کھڑکی کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔

''کون تھا لنک؟'' میں نے کمبل کو دونوں ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہی میں سوچ رہا ہوں، لیکن جو کوئی بھی تھا بھاگ گیا ہوگا گولی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی، میں نے فوراً ٹانگ باندھی اور ریوالور لے کر نکل گیا۔ باہر سے اس نے دو تین فائر کیے تو میں نے آواز کی سمت میں گولیاں داغ دیں یقیناً گولی اسے ضرور لگی ہے کیونکہ میں نے اس کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔''

''لیکن......لنک......اس نے حملہ کیوں کیا؟'' میں خوف کی وجہ سے کانپنے لگی تھی۔

''ممکن ہے کوئی پاگل ہو یا کوئی یہ چاہتا ہوں کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔''

ہم باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ صبح کی مدہم روشنی نظر آنے لگی کچھ دیر بعد میں کچن میں چلی گئی اور لنک باہر جا کر اس جگہ کو تلاش کرنے لگا جہاں حملہ آور نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی ایک پرانے اور ناکارہ ٹریکٹر کے قریب خون کے دھبے نظر آئے وہیں سے جنگل تک کسی کے قدموں کے نشانات بھی ملے ان چیزوں کو دیکھ کر میری مخالفت کے باوجود لنک نے شیرف سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی ضد کی اور طے یہ پایا کہ ہم پہلے گورڈن سے مشورہ کریں گے اور اگر ممکن ہوا تو اسی کے ساتھ تھانے جائیں گے۔

لیکن لنک سب سے پہلے روز روم میں گیا جہاں اس نے مجھ سے پوچھے بغیر بوڑھی روز کے سامنے اپنی اور میری منگنی کا اعلان کردیا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی او۔ جب ہم روز کی پیش کردہ مفت کی پی کر باہر نکلے تو میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

......☆☆☆......

گورڈن کا گھر بہت خوب صورت تھا اور اتنے ہی خوب صورت اس کے بچے بھی تھے جب گورڈن کی بیوی ہیزل کو یہ معلوم ہوا کہ گورڈن نے مجھے بہن بنالیا ہے تو وہ کھل اٹھی۔

''چلو اچھا ہوا، اب ہم دنوں خوب لڑا کریں گے۔''

لیکن اس انکشاف پر تو ایک ہنگامہ ہو گیا کہ ہم شادی کرنے والے ہیں۔ گورڈن بڑے جوش و خروش سے

انتظامات کے بارے میں باتیں کرنے لگا اور ہیزل اسے ٹوکتی رہی کہ انتظام میں فلاں نقص رہ جائے گا یا یوں ہونا چاہیے۔

ان کے دونوں بچے میری گود میں ہمکنے لگے وہ جڑواں تھے۔ انہیں آغوش میں لے کر مجھے بڑی مسرت طمانیت کا احساس ہوا ایسا لگا جیسے میں آنٹی ہیلن ہوں۔

ہیزل اور میں باتیں کرنے لگے شادی کے بارے میں ادھر لنک اور گورڈن سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے پھر کچھ دیر بعد اچانک گورڈن نے بڑے سنجیدہ لہجے میں ہمیں پکارا۔

''لڑکیو اب ذرا ہوش میں آجاؤ اگر سنجیدگی اختیار نہ کی تو دولہا کو جیل میں شب عروسی گزارنی ہوگی۔''

پھر اس نے تفصیل سے ہمیں چند اہم مشورے دیے اور خاص طور سے لنک کو ہدایت کی کہ وہ شیرف سے چند ابتدائی باتیں کر کے خاموش ہو جائے گا اس کے بعد باقی کام گورڈن خود سنبھال لے گا۔

ہم ہیزل کو خدا حافظ کہہ کر تھانے پہنچے تو شیرف اونگھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔ اس نے ساری تفصیل اس طرح سنی اور اس کے بعد ایک آنکھ کھولتا ہوا بولا۔

''اوہ میں نے آج تک کسی ایک ٹانگ کے آدمی کو اتنی پھرتی سے ریوالور سنبھال کر جوابی کارروائی کرتے ہوئے نہیں سنا۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ لنک میری زندگی پر ذاتی حملہ تھا آگے بڑھی تاکہ اس کا بدلہ اتار سکوں لیکن اسی لمحے گورڈن نے میرا بازو تھام لیا۔

''میں نے آواز کی سمت میں چند فائر کیے تھے شیرف گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔'' لنک نے جواب دیا۔

''تو وہ مر گیا؟'' شیرف نے اس مرتبہ دونوں آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''نہیں......قدموں کے نشان بھی بتاتے ہیں کہ وہ دونوں پیروں پر چل کر فرار ہوا ہے وہاں زیادہ خون بھی نہیں تھا۔''

''آہ......کیا چاہتے ہو......تمہیں بہادری کا اعلیٰ ترین اعزاز دلوادوں؟''

''شیرف......!'' اب گورڈن نے ہم دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم جائے واردات پر جا کر قدموں کے نشانات ریکارڈ کرو گولیوں کے خول محفوظ کرو اور خون کا تجزیہ کراؤ تاکہ حملہ آور کی شناخت ہو سکے۔''

''مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔'' اس مرتبہ برہم ہونے کی باری شیرف کی تھی۔

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

''اور مقامی ڈاکٹر سے یہ بھی پوچھ لینا کہ کوئی مرہم پٹی کے لیے تو نہیں آیا۔'' گورڈن نے بڑی معصومیت سے اس کو پھر مشورہ دیا۔

''خاموش رہو۔'' شیرف نے کھڑے ہو کر میز پر زور سے گھونسا مارتے ہوئے کہا اور ہم تھانے سے باہر نکل آئے میری بری حالت تھی کیونکہ گورڈن نے نہ جانے کیوں دانستہ طور پر شیرف کو اشتعال دلایا تھا لیکن جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو لنک اور گورڈن زور زور سے ہنسنے لگے میں نے جھنجلا کر ہنسنے کا مقصد پوچھا تو ان کے قہقہے اور زوردار ہو گئے آخر پھر لنک ہی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ''اگر تم اور ہیزل شادی کی تیاریوں میں سر نہ کھپا رہی ہوتیں تو تمہیں گھر پر ہی یہ معلوم ہو جاتا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں فوجی اصطلاح میں اسے ''توجہ ہٹاؤ مہم'' کہا جاتا ہے ہم نے اسے اتنا

مشتعل کردیا کہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکا کہ میں نے بھی فائر کیا تھا اور اگر اسے یہ سوچنے کا وقت مل جاتا تو میں لاک اپ کے مزے اڑا رہا ہوتا ننھی چڑیا۔"

ہم نے گورڈن کو اس کے دفتر پر اتارا وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا لہٰذا جب لنک نے اس سے یہ کہا کہ وہ شادی کے موقع پر شہ بالا بنے گا اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ تو ٹھیک ہے لنک لیکن شادی کے فوراً بعد میرے گھر کی دعوت مت بھولنا ورنہ ہیزل مجھے چیر پھاڑ کر پھینک دے گی۔"

ہم واپسی پر خوب پروگرام بناتے رہے میری زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

"ہنی مون ورسائل میں تو منانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور......!" میں اپنے خوابوں کو لفظوں کا روپ دینے لگی وہ محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر اس نے زیورات کی ایک دکان کے سامنے گاڑی روک دی۔

......☆☆☆......

اگلے تین روز بہت مصروف گزرے میری ضد پر لنک نے عروسی جوڑے کے لیے مخصوص ہنی مون وین کرائے پر حاصل کی جسے بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا اور میں نے تمام نوادرات اس وین میں بھر دیے جو اسٹار پیلس سے مس میبل کی دکان کے لیے خریدے تھے میں جانتی تھی کہ اس وین میں ون شپ پہنچنا اور پھر مس میبل سے ملاقات یہ سب کچھ کتنا اچھا لگے گا اور مس میبل تو میرے دولہا کو دیکھ کر حیرت اور خوشی سے ششدر رہ جائیں گی۔

شادی کی رسم، اداس ڈین، خوش وخرم گورڈن اور نازاں اور فرحاں لنک کی موجودگی میں ایک جج نے ادا کی اور اس کے بعد ہیزل ہم سب کو اپنے گھر لے گئی جہاں ہیزل کی پیاری سی بیٹی نکی نے ایک خوب صورت ٹرے میں رکھ کر دو انگوٹھیاں پیش کیں۔

دعوت پر ہیزل نے اپنے تمام پڑوسیوں کو بھی مدعو کیا تھا جن سے ملتے ملتے میں تھک گئی جب لوگوں نے ہمیں چاولوں کی بارش میں رخصت کیا تو مسرتوں کے نشے کی وجہ سے میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

ہم نے پہلی رات ہائی وے کے ایک ہوٹل میں گزاری اور علی الصبح ون شپ روانہ ہو گئے۔

......☆☆☆......

ون شپ میں حسب توقع محبت بھرا ماحول ملا اور دو ہفتے آنکھیں میچتے ہی کٹ گئے مس میبل نے جن کی کوئی اولاد نہیں تھی مجھے شادی کا ایک ایسا تحفہ دیا کہ مجھے آنٹی ہیلن یاد آ گئیں انہوں نے ایک میوزک بکس دینے کے علاوہ اپنی چھوٹی سی دکان بھی میرے نام کر دی میرے پاس شکریہ کی ادائیگی کے لیے لفظ نہیں صرف اور صرف تشکر کے آنسو تھے۔

دو ہفتے بعد مجھے مس میبل کی مخالفت کے باوجود باقی سامان لینے کے لیے اسٹار پیلس واپس آنا پڑ گیا۔

اور یہیں سے ایک نئے المیہ کا آغاز ہوا۔

......☆☆☆......

اسٹار پیلس کے احاطے میں ہماری اسٹیشن ویگن کے علاوہ شیرف کی سیڈان بھی کھڑی تھی جسے دیکھ کر میرا دل نہ جانے کیوں بہت زور زور دھڑکنے لگا۔

لنک بھی سنجیدہ ہو گیا اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور ہم دونوں شانہ بشانہ شیرف کی طرف بڑھ گئے جو مکروہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"آہ...... مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم لوگ واپس آ رہے ہو۔" اس کے چہرے پر خباثت برس رہی تھی۔

"مجھے یہ بھی علم تھا کہ تم دونوں نے شادی کر لی ہے لہٰذا مبارکباد دینے کے لیے فوراً ہی چلا آیا۔"

"شکریہ شیرف، ویسے ہم بہت تھکے ہوئے ہیں

لہٰذا اگر تمہیں چائے کی دعوت نہ دے سکیں تو برا مت ماننا۔" لنک نے جواب دیا۔

"آہا...... میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ بلبل ایک ٹانگ والے سے شادی کے بعد......!"

"شیرف......!" لنک نے غرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ اس وقت لنک کی آنکھیں آگ کی طرح دہک رہی تھیں اور ابھی شیرف نے میرے بارے میں ایک غلیظ فقرہ کہا ہی تھا کہ لنک کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور شیرف خوف کے عالم میں دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا میں نے گھبرا کر لنک کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"سنو......!" شیرف نے جس کے چہرے پر اب مسکراہٹ نہیں تھی دانت پیس کر کہا۔

"یہ سماجی ملاقات نہیں میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری فائرنگ سے زخمی ہونے والا شخص چل بسا ہے۔"

"کیا؟" لنک نے اچھل کر پوچھا اور میرا دل کسی انجانے خوف سے بیٹھنے لگا۔

"اور سنو...... وہ ورجل تھا۔" شیرف نے خوفناک انداز میں ایک نیا دھماکا کیا۔ "میری سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آیا کہ وہ اپنی جھونپڑی سے یہاں فائرنگ کرنے کے لیے کیوں آیا تھا؟ وہ ہمیشہ جھونپڑی میں رہتا تھا دو روز قبل ایما نے کسی سے کہا کہ وہ ورجل کو بلا لائے اور جب ایما کا آدمی وہاں پہنچا تو ورجل دم توڑ رہا تھا اس کا زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا لیکن اس نے اس کی مرہم پٹی نہیں کرائی اور زخمی ہونے کے بعد جھونپڑی میں چلا گیا جہاں خون بہتا رہا اور پھر دس بارہ دن بعد وہ مر گیا۔"

میں کانپ کر رہ گئی۔

یہ کیسا جنون تھا کہ کوئی اپنے علاج کے بجائے خون بہتا رہنے دے۔

"کل اس کی تدفین ہے۔" شیرف نے ایک اور انکشاف کیا۔ "تم لوگ جاؤ گے؟"

"ہاں۔" میں بھی لنک کی طرف اثبات میں سر ہلانے لگی اور شیرف ہمیں گھورتا ہوا چلا گیا میں یہی سوچ کر کانپنے لگی کہ اگر ورجل کسی خطرناک اور طبی امداد ملنے کے باوجود مر جاتا تو لنک کو گرفتار کر لیا جاتا۔

میں دیر تک روتی رہی اور لنک مجھے سمجھاتا رہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے پھر جب میں نے خود کو سنبھال لیا تو ہم یہ بحث کرنے لگے کہ ورجل نے حملہ کیوں کیا تھا اس کا جواب بڑا آسان تھا کہ وہ ایما کے کہنے پر خطوط واپس لینے آیا تھا اور کیونکہ وہ شعوری اعتبار سے بچہ تھا لہٰذا اس نے فائرنگ کر کے ہمیں خوفزدہ کرنا چاہا تھا۔

......☆☆☆......

اگلے روز تدفین کے بعد میں پاپا کی قبر کے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی تو لنک مجھے اٹھا کر گھر لے آیا تدفین کے دوران میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایما کتنی نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے اس کی بوڑھی آنکھیں تیز دھار چاقو کی طرح میرے وجود میں سارے وقت چبھتی رہی تھیں۔

......☆☆☆......

صندوق اور ڈائری اب بھی میرے اعصاب پر سوار تھی۔ لہٰذا میں نے لنک کو مجبور کیا کہ وہ اس نیلام گھر چلے جہاں بقول ورجل صندوق فروخت کر دیا گیا تھا۔

نصف گھنٹے بعد ہم ایک بڑے گودام کے سامنے اترے تو ایک شخص نے دور ہی سے لنک کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تیزی سے ہماری طرف آنے لگا

"اوہ...... لنک کہاں غائب ہو یار اور پھر جب لنک نے اس سے میرا تعارف کرایا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کینڈرا تم بہت بڑی ہوگئی ہو بھئی بچپن میں فریڈ کی انگلی پکڑ کر یہاں آیا کرتی تھیں۔"

وہ پاپا کا پرانا دوست تھا اور میں جانتی تھی کہ پاپا کبھی بھی مجھے یہاں لایا کرتے تھے۔

پھر ہم نے صندوق کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اوفوہ...... یہ ایما کے گھر والے بھی بہت خبطی لوگ ہیں چند ہفتے قبل صندوق کوڑیوں کے بھاؤ مجھے بیچ گئے تھے اور اب چند روز قبل ایما کا ہی کوئی پوتا اسے بہت زیادہ قیمت دے کر لے گیا ہے۔"

"وہ کون تھا؟"

"ورجل کا کوئی بھائی یا کزن...... نام یاد نہیں رہا۔"

میں مایوس ہوگئی اگر صندوق ایما کے قبضے میں پہنچ گیا ہے تو اس کی واپسی ناممکن تھی۔

واپسی پر ہم یہ ہی سوچتے رہے کہ شاید صندوق میں کوئی ڈائری موجود ہی نہ ہو۔

احاطے میں داخل ہوتے ہی میری نظر بوڑھے درخت پر پڑی اور پھر اس کی ڈالیوں سے جڑوں تک پھسلتی چلی گئی جو رگوں کی طرح زمین پر ابھری ہوئی تھیں گاڑی کے رکتے ہی میری سانس بھی رک گئی۔

صندوق فرنٹ پورچ کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھا ہوا تھا۔ جس پر ایچ پی کے حروف نمایاں تھے۔

ہم دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے صندوق تک پہنچے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ڈھکنا اٹھایا اور پھر اس ڈائری پر تقریباً گر سی گئی جو اس کے اندر چمک رہی تھی۔

"کینڈرا...... خود کو سنبھالو۔" لنک نے مجھے پکڑتے ہوئے کہا اور ڈائری اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی لیکن ڈائری کے اوپر ایک خط بھی رکھا ہوا تھا لنک کے نام

میں نے خط لنک کی طرف بڑھا دیا لیکن تجسس سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"لنک میں نے اپنی عزیز ترین دوست ہیلن سے وعدہ کیا تھا کہ یہ ڈائری اس کی بیٹی کے ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گی اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس ڈائری کا علم کسی اور کو نہ ہو لیکن اگر کسی بے گناہ کو فریڈ اور ایتا کے قتل میں ملوث کیا جائے تو یہ ڈائری پولیس کے حوالے کر دی جائے وہ بھی اس شرط پر کہ پولیس اس کے مندرجات سے ہیلن کی بیٹی کو مطلع نہیں کرے گی۔

اب ڈائری تمہارے پاس ہے تم جو چاہو کرو اور ہاں اسے ورجل کی طرف سے شادی کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔

ایما

"اوہ لنک آنٹی ہیلن کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں تھی۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ خط ایک معمہ ہے اور ڈائری اس سے بھی بڑا معمہ ثابت ہو سکتی ہے کینڈرا، میری مانو تو اسے جلا دو، پڑھنے سے کوئی۔"

"نہیں......!" میں نے ڈائری کو سینے سے لگا لیا۔

"میں نے صرف اس ڈائری کی وجہ سے شادی کے بعد بھی یہاں واپس آنے کا فیصلہ کیا تھا لنک اور...... اور یہ مت بھولو کہ اگر میں قتل کے اصل حقائق کی جستجو میں یہاں نہ آتی تو تم سے بھی ملاقات نہیں ہوتی۔"

لنک بڑی اداس نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

......☆☆☆......

ہم ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گئے اور میں نے ورجل کا تحفہ سامنے رکھ کر اس کا پہلا صفحہ کھول لیا۔

۶ نومبر ۱۹۲۹ء سوچتی ہوں کہ اس ڈائری کا کیا کروں، یہ مجھے کلاس میں اول آنے پر بطور انعام ملی

ہے اور میری مس سوئٹ کا مشورہ ہے کہ میں اس میں عمر کے آخری ایام تک کے واقعات قلم بند کر سکتی ہوں آج میری بارہویں سالگرہ بھی ہے لہٰذا میں آج ہی سے یومیہ اس ڈائری پر لکھا کروں گی ہیلن پیم بروک۔"

اگلے کئی اوراق عام سی باتوں پر مشتمل تھے لہٰذا میں انہیں سرسری طور پر دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔

۲۳ ستمبر ۱۹۳۰ء آج مما نے میری چھوٹی بہن کو جنم دیا اس کا نام اینا رکھا گیا ہے ڈاکٹر چیسٹر نے ہدایت کی ہے کہ اب اگر کوئی بچہ ہوا تو مما کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی لیکن میں جانتی ہوں کہ پاپا کو لڑکے کی کتنی آرزو ہے۔"

۲۰ دسمبر ۱۹۳۱ء اس مرتبہ کرسمس بے جان رہے گا مما ایک مردہ لڑکے کو جنم دے کر خود بھی انتقال کر گئیں۔ مس ایما ہماری دیکھ بھال کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں پاپا پورے دن کمرے میں بند رہے ہیں اور مس ایما کا کہنا ہے کہ اب مجھے پاپا اور ننھی اینا کی دیکھ بھال کرنے کا کام سنبھال لینا چاہیے خدایا ہم پر رحم کر دا گر مس ایما چلی گئیں تو میں بالکل تنہا رہ جاؤں گی۔"

میں نے دکھ بھرے انداز میں ڈائری کے کئی صفحات الٹ دیے کیونکہ ان میں نانی کی موت کے بعد مسائل کا ذکر تھا پھر ایک جگہ پاپا کا ذکر دیکھ کر میں رک گئی۔

۴ جون ۱۹۳۷ء پاپا نے آج ایک لڑکے کو ملازم رکھا ہے جس کا خاندان کوٹمبس میں رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لڑکا میرا ہاتھ بٹانے کے بجائے کھانا زیادہ کھائے گا اس کی عمر صرف سولہ سال ہے اور شاید گھر سے بھاگ کر آیا ہے۔"

میں نے انگلیوں پر حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس وقت پاپا کی عمر سولہ سال اور آنٹی کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔

۱۲ اگست ۱۹۳۷ء یہ فریڈ تو بہت محنتی لڑکا نکلا۔ مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانا ہی نہیں پڑتا کہتا ہے کہ موسم خزاں میں بھی یہیں رہے گا پاپا کے کام بھی اسی نے سنبھال لیے ہیں اور میں دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے اسے کام میں منہمک دیکھتی رہتی ہوں۔"

یہ وہ مرحلہ تھا جہاں پاپا کے بارے میں آنٹی ہیلن کے خیالات قدرے تبدیل ہوئے تھے لیکن پھر بھی تحریر میں کسی قسم کی چاہت یا محبت نہیں تھی تاہم ستمبر کے مہینے میں آنٹی کو اپنے بارے میں چند خامیوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۳۷ء آج اینا کی ساتویں سالگرہ تھی کاش مما دیکھ سکتیں کہ اینا کتنی خوب صورت نکل رہی ہے ہر کوئی اس کے حسن کا دلدادہ ہے میں اسے تباہ ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں۔ فریڈ نے اسے تحفہ میں گڑیا دی ہے جو اینا ہی کی طرح خوب صورت ہے پاپا کیک کٹوانے کے بعد پھر کمرے میں بند ہو گئے اور مس ایما نے آج ہی کہا ہے کہ میں اپنے لیے شوہر کی تلاش شروع کر دوں لیکن میرے پاس نہ تو تقریبات میں جانے کا وقت ہے اور نہ ہی وہ حسن جس کی وجہ سے مرد متوجہ ہوتے ہیں میں بالکل سپاٹ عورت ہوں لیکن یقیناً اینا مجھ سے مختلف اور بھرپور ہوگی۔"

یہ آخری جملہ چھوٹی بہن سے جلن اور حسد کا ہلکا سا اظہار تھا۔

ڈائری کے مطابق پاپا ۱۹۴۲ء کی بہار تک اسٹار پیلس میں رہے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۲ء فریڈ نے آج فوج میں نام لکھوا لیا ہے وہ وردی پہن کر میرے سامنے آیا تو میں خوشی سے ناچ اٹھی لیکن میرے آنسو بھی نکل آئے وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا میرے آنسوؤں کا سبب یہ انکشاف تھا کہ وہ جلد ہی محاذ پر چلا جائے گا خدا کرے

وہ جلد واپس آجائے اگر واپس نہ آیا تو...... نہیں، مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے پاپا مسلسل بیمار رہنے لگے ہیں اور مس ریما اپنے بیٹوں کو یہاں لاتی رہتی ہیں تاکہ میں کسی کا انتخاب کرسکوں لیکن مجھے تو ایسا مرد چاہیے جو فصلوں اور جائیداد کی دیکھ بھال کرنے کا نہ صرف اہل ہو بلکہ بہت وجیہہ بھی ہو، بالکل فریڈ کی طرح اوہ...... پتا نہیں فریڈ کی غیر موجودگی میں میری کیا حالت ہوجائے گی۔" اس کے بعد کے الفاظ دھندلے تھے کچھ ایسے جیسے ان پر آنسو گرے ہوں۔

۲۲ اپریل وہ چلا گیا اینا اپنے کمرے میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ پاپا بھی بہت اداس ہیں۔ آج صبح ہی ہماری بہترین گائے بھی مری ہے۔ میرے خدا...... اب کیا ہوگا۔ فریڈ کے بغیر اس گھر کا انتظام کس طرح چلے گا۔ فصلوں کو خشک سالی کی وجہ سے بھی خطرہ لاحق ہے فریڈ نے رخصت ہونے سے قبل میرا ہاتھ تھام کر درخواست کی ہے کہ میں اسے خط لکھتی رہا کروں میں۔" آگے کے تمام حروف دھندلے سے تھے اور صفحہ پر آنسوؤں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔

۲۹ مئی ۱۹۴۲ء فریڈ نے آج رات نیو جرسی سے بات کی۔ وہ کل بحری جہاز میں محاذ پر جارہا ہے۔ میں ڈر رہی ہوں کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے خدایا، فریڈ کو حفظ وامان میں رکھنا اس نے مجھے خط لکھنے کے لیے ایک ایسا پتا دیا ہے جس سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جارہا ہے میں اسے روزانہ خط لکھوں گی۔ اس کے بغیر میں کھوکھلی اور بے جان سی مورت ہوگئی ہوں۔"

اگلے چند مہینوں کے صفحات جدائی کے کرب اور فصلوں کے بارے میں تشویش سے بھرے ہوئے تھے لیکن مارچ میں یہ کیفیت تبدیل ہوگئی تھی۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء آہ آج فریڈ کا خط ملا ہے مختصر سا خط، فریڈ کے بارے میں مرجھائی ہوئی امیدوں کو ایک بار پھر زندگی دے دیا ہے میرے خدا اب اسے یہاں واپس بھیج دے ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"

اگلے چند مہینوں میں آنٹی ہیلن کو فریڈ کا کوئی اور خط نہیں ملا اگرچہ وہ پاپا سے تقریباً چار سال بڑی تھیں لیکن ڈائری کے صفحے چغلی کھا رہے تھے کہ انہیں اس فرق کی کوئی پروا نہیں تھی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء اینا مجھے بہت پریشان کر رہی ہے تیرہویں سالگرہ کے بعد ہی سے میری پریشانیاں بڑھ گئی ہیں وہ چھچھورے لڑکوں کے ساتھ گھومتی رہتی ہے پاپا کی حالت ابتر ہے۔ میں نے ایک اور ملازم رکھ لیا ہے لیکن وہ کاہل الوجود ہے کاش فریڈ واپس آجائے اس کا تو کوئی خط بھی نہیں مل رہا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر میری عمر فریڈ سے کم ہوتی تو......!"

"یکم جنوری ۱۹۴۴ء پاپا چل بسے رات کو سوتے میں خاموشی سے دم توڑ گئے فریڈ کا کوئی خط نہیں ملا ہے میرا دل اب گھبرانے لگا ہے خدایا وہ خیریت سے ہو۔"

۱۰ فروری ۱۹۴۴ء وہ محاذ پر زخمی ہوگیا ہے۔ اس کے ٹیلی گرام سے یہ پتا نہیں چلتا کہ زخم کی نوعیت کیسی ہے لیکن شکر ہے کہ وہ زندہ ہے اور بہت جلد واپس آجائے گا اینا کی طرف سے پریشانیاں مسلسل بڑھ رہی ہیں نئے ملازم کو نکال دیا ہے۔"

۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء آج فریڈ کا خط ملا تو ایسا لگا جیسے بہار آگئی ہو، وہ کولمبس واپس آگیا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ وہ اسٹار پیلس واپس آنا چاہتا ہے اسے یہ علم نہیں کہ پاپا انتقال کرچکے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ معمولی زخمی ہوا تھا میں نے اسے ایک تصویر بھیجی تھی جس کی اس نے تعریف کی ہے اور مجھے مکمل عورت قرار دیا ہے یہ پڑھ کر مجھے اپنی عمر دس سال کم لگ رہی ہے اینا کا

چل چلن ویسا ہی ہے کل میں نے اسے کھیتوں میں ٹام کے ساتھ دیکھا ہے یہ لکھنا ضروری نہیں کہ وہ دونوں کیا کررہے تھے۔"

میں سوچنے لگی کہ اینا آگے چل کر یقیناً آنٹی ہیلن کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کردے گی۔ میں نے لنک کی طرف دیکھا جو ایک ٹک مجھے دیکھے جارہا تھا۔

یکم اگست ۱۹۴۴ء وہ واپس کیا آیا میرے دل کی کلی کھل اٹھی۔ اتنا خوب صورت لگ رہا ہے کہ بس کیا لکھوں لیکن اس نے یہ کہہ کر مجھے پھر اداس کردیا ہے کہ وہ چند روز بعد واپس جائے گا کیونکہ اسے کولمبس میں چند کاروباری امور نمٹانے ہیں اور البامہ میں عزیزوں سے ملاقات کرنی ہے وہ سمندر پار سے ہمارے لیے تحفے لایا ہے اینا کے لیے ایک خوب صورت نائٹی، پاپا کے لیے ایک پائپ اور میرے لیے مدھر آوازوں والا میوزک بکس۔"

اب مجھے احساس ہوا کہ آنٹی ہیلن کو اس میوزک بکس سے اتنی محبت کیوں تھی اور میں بھی ان کی اجازت کے بغیر اس کو ہاتھ کیوں نہیں لگاسکتی تھی۔

یکم اپریل ۱۹۴۵ء وہ آخر مستقل رہنے کے لیے واپس آہی گیا ہے آج بہت شرارتیں کرتا رہا لطیفے سناتا رہا اور اس نے اس ویران اور خاموش گھر کو مسرتوں کے گہوارے میں بدل ڈالا ہے میں لفظوں میں اس مسرت کو بیان نہیں کرسکتی جو اس کی آمد سے مجھے ہوئی ہے آج تو اینا بھی کہیں نہیں گئی۔"

میں نے مزید چند صفحات تیزی سے پلٹ ڈالے کیونکہ ان میں فریڈ کی واپسی اور اس کے شوخ و لطیفوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا پھر میری نظر ایک صفحے پر جم گئی۔

۱۸ مئی ۱۹۴۵ء اوہ خدایا میں کسی کو نہیں بتاسکتی کہ آج کیا ہوا۔ ایک دو گھنٹہ قبل میں مسرت اور خوف کے کن مرحلوں سے گزر رہی تھی وہ میرا فریڈ مجھے سورج ڈھلے تفریح کرانے کے لیے باہر لے گیا اور پھر میں اس طرح بہنے لگی جیسے کوئی پرسکون ندی بہہ رہی ہے میں فریڈ کو اپنائے بغیر اب زندہ نہیں رہ سکوں گی"

آنٹی ہیلن نے کوئی واضح بات نہیں لکھی تھی اور نہ ہی یہ کہا تھا کہ ۱۸ مئی کی اس شب ان دونوں نے شادی کے عہد و پیمان کیے تھے یا نہیں۔

۳۰ نومبر ۱۹۴۵ء فریڈ کو کسی ضروری کام سے کچھ دنوں کے لیے جانا ہے اس کے والد کی حالت بہت خراب ہے اور وہ قریب المرگ ہے۔ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ ایسے وقت میں اپنے والد کے ساتھ رہے لیکن مجھے اس کا بھی علم ہے کہ یہ عارضی جدائی بہت تکلیف دہ ثابت ہوگی میں تو اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کی عادی سی ہوگئی ہوں اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کرسمس کے موقع پر واپس آجائے گا۔ لیکن پاپا کرسمس تک واپس نہیں آئے بلکہ آنٹی ہیلن کو ان کا ایک خط ملا لہٰذا ڈائری کا ایک ورق آنٹی کے اسی کرب سے عبارت تھا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۴۵ء میں آج دن بھر فریڈ کا انتظار کرتی رہی اور پھر جب اس کا پارسل بذریعہ ڈاک آیا تو یہ یقین کرکے اداس اور دلگیر ہوگئی کہ اب کرسمس کے موقع پر وہ موجود نہیں ہوگا۔ میرا تحفہ بہت خوب صورت ہے اس نے دل کی شکل کی پن بھیجی ہے جبکہ میں نے اینا کے لیے اس کے تحفہ کو کھولے بغیر کرسمس ٹری کے نیچے رکھ دیا ہے وہ صبح بیدار ہونے پر اسے خود کھول لے گی۔ کرسمس مبارک ہو فریڈ...... میری زندگی تم خوشی کے اس موقع پر زمینی فاصلے کے اعتبار سے بہت دور ہو۔"

پاپا جو عارضی طور پر اسٹار پیلس سے گئے تھے ایک سال تک خاندانی جھمیلوں میں پھنسے رہے اور واپس نہیں آئے اس دوران آنٹی ہیلن کی ڈائری کے کئی

ورق آنسوؤں سے بھیگتے رہے ایناکی طرف سے انہیں مسلسل پریشانی لاحق رہی جو ہر روز خوب صورت تر مغرور کینہ پرور اور آوارہ ہوتی جارہی تھی۔

۱۴ فروری ۱۹۴۷ء میں آج خوشی سے دیوانی ہوئی جارہی ہوں وہ واپس آرہا ہے اس کے والد طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اس نے واپسی کے بارے میں جو خط لکھا ہے وہ...... میں تم سے پیار کرتا ہوں...... پر ختم ہو رہا ہے اس ایک جملے میں کتنی محبت بھری ہوئی ہے۔ یہ صرف میں ہی جانتی ہوں اور میں تو اسے لفظوں کی شدت سے بھی زیادہ چاہتی ہوں فریڈ جلد آجاؤ میں بہت طویل اور جاں گسل انتظار کر چکی ہوں بس آبھی جاؤ۔"

اگلے چند ورق فریڈ کی آمد کے موقع پر گھر کی زیبائش سے متعلق تھے۔ اینا کے بارے میں یہ صفحات بھی پرتشویش باتوں سے بھرے ہوئے تھے اینا چاہتی تھی کہ تعلیم ترک کر کے ٹام سے شادی کرلے لیکن اس کے گریجویشن میں صرف چند ہفتے رہ گئے تھے۔ آنٹی ہیلن نے سختی سے کہہ دیا کہ یہ شادی ابھی نہیں ہوسکتی لیکن مستقبل کے واقعات نے ثابت کردیا کہ ان کا یہ فیصلہ غلط بلکہ سو فیصد مہلک تھا آنٹی نے اینا کو شادی کی اجازت نہ دے کر اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری تھی۔

یکم مارچ ۱۹۴۷ء بہار میرے لیے بہار کا سامان لے آئی۔

فریڈ بہار کے خوشگوار اور مست جھونکے سے کم نہیں۔ وہ اس ایک سال میں اتنا بڑا لگنے لگا ہے کہ بظاہر ہماری عمروں کا فرق ختم ہو گیا ہے۔

۸ مارچ ۱۹۴۷ء آج رات میں کسی گناہ گار لڑکی کی طرح اپنے کمرے میں واپس آئی لیکن ندامت کے اس احساس کے باوجود میرا رواں رواں خوشی سے ناچ رہا ہے آج رات میں نے جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے، خود کو فریڈ کے سپرد کر دیا۔ اب مس ایما کو میرے بارے میں کبھی کوئی فکر نہیں ہوگی وہ یقیناً مجھ سے شادی کرے گا۔" اس صفحے پر آنسوؤں کے نشان تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ آنٹی ہیلن کے یہ آنسو خوشی کی وجہ سے نکلے ہوں گے۔

یکم جون ۱۹۴۷ء اینا نے آج ڈگری حاصل کرلی۔ اس تقریب میں میرے ساتھ فریڈ بھی موجود تھا اور جب اینا اسٹیج پر آئی تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ بھرپور عورت بن چکی ہے دو تین ہفتے قبل ہی اس نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ کالج نہیں جائے گی شاید وہ اور ٹام دونوں شادی کا پکا ارادہ کر چکے ہیں لیکن انہیں انتظار کرنا ہوگا کیونکہ پہلے بڑی بہن کی شادی ہوگی اور پھر اینا کا نمبر آئے فریڈ نے ابھی تک شادی کا پیغام نہیں دیا ہے لیکن اب میرے اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ بھی تو نہیں رہا۔"

لیکن اسی رات پارٹی ختم ہونے کے بعد پولیس نے بعض لڑکوں اور لڑکیوں کو شراب پیتے ہوئے اودھم مچانے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ شیرف نے جن لوگوں کو جیل میں ڈالا تھا ان میں اینا بھی شامل تھی۔

۲ جون ۱۹۴۷ء پتا نہیں اینا اب کیا گل کھلائے گی۔

کل رات فریڈ نے خود جیل جا کر اس کی ضمانت دی اور آج صبح سویرے اسے گھر واپس لے آیا اینا بہت غصے میں تھی۔ اس نے ٹام کو بہت سی گالیاں دیں اور اپنے کمرے میں گھس گئی فریڈ چپ چاپ کھڑا رہا اس نے صرف اتنا کہا کہ صرف اینا ہی جیل میں نہیں تھی اور بھی کئی لڑکیاں پکڑی گئی تھیں میرا خیال ہے کہ اینا کی تربیت اچھی نہیں ہوئی اور اس کی ذمہ دار میں خود ہوں فریڈ نے ابھی تک شادی کی خواہش ظاہر نہیں کی ہے پتا نہیں، وہ اتنا انتظار کیوں کرا رہا ہے۔ میں تیزی سے

تیس سال کی ہو رہی ہوں لیکن وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اور دو تین روز قبل ہی جب اینا سو رہی تھی تو وہ میری خواب گاہ میں چلا آیا تھا۔"

۱۰ جون ۱۹۴۷ء فریڈ کے رویے میں کھنچاؤ سا آنے لگا ہے وہ ایک ہفتے سے میری خواب گاہ میں نہیں آیا گریجویشن نائٹ کے بعد اینا اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہے۔ وہ تو ابھی بچی ہے اور فریڈ کی عمر اس سے زیادہ ہے۔"

آنٹی ہیلن کے لفظوں اور جملوں میں اچانک ہی تلخی سمو گئی تھی۔ میں نے اگلے صفحات پر نظر ڈالی اور میری سانس گھٹنے لگی۔

۱۳ جون ۱۹۴۷ء خدایا شاید میں امید سے ہوں میں نے ابھی تک اس کا تذکرہ فریڈ سے نہیں کیا ہے ممکن ہے کہ اسی طرح ہماری شادی ہو جائے۔ اس نے ابھی تک شادی کی درخواست نہیں کی ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہی ہوں فریڈ کے بچے کی ماں بننے کا تصور ہی میری خوشیوں کا نقطہ عروج ہے اور میں اگرچہ نادم ہوں لیکن میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں۔"

آنٹی ہیلن نے بچے کے بارے میں پاپا کو بتانے سے گریز کیا اور یوں دو روز بعد ہی ایک دھماکا ہو گیا۔

۱۵ جون ۱۹۴۷ء نہیں میں یقین نہیں کر سکتی فریڈ اور اینا فرار ہو گئے ہیں۔ خدایا اب میں کیا کروں کس سے فریاد کروں میں امید سے ہوں ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے آج جب میں ڈاکٹر سے ملنے گئی تو وہ میری غیر موجودگی میں بھاگ گئے میں نے فریڈ کو بچے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ میں عمر دار اور غیر شادی شدہ عورت نہ صرف ایک غیر قانونی بچے کو جنم دینے والی ہوں بلکہ میں...... میں نے اپنے محبوب کو بھی گنوا دیا ہے میری بہن جس کو میں نے ماں بن کر پالا تھا میرے حق پر ڈاکا ڈال گئی ہے۔"

آنٹی ہیلن نے یقیناً پاپا کو اس بارے میں خط لکھا لہٰذا ۲۰ جون کو پاپا کا جواب آیا جس میں انہوں نے آنٹی سے کہا تھا کہ وہ کولمبس آ جائیں۔

۲۴ جون ۱۹۴۷ء مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ کیونکہ بہت جلد سب لوگوں کو بچے کے بارے میں معلوم ہو جائے گا اور لوگ میری جسمانی تبدیلیوں کو محسوس کرنے لگیں گے۔ میں نے اس بارے میں صرف ایما کو بتایا ہے ان کی یہ تجویز میں نے مسترد کر دی ہے کہ اسقاط کرا لوں میں بھلا فریڈ کے بچے کو کس طرح قتل کر سکتی ہوں مجھے کولمبس چلے جانا چاہیے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ولادت جنوری کے آخر میں متوقع ہے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر اچانک میرا سر چکرانے لگا۔

"لنک......!" میں تقریباً چیخ اٹھی۔ "میں...... اینا کی بیٹی نہیں ہوں سنو...... میں ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ کو پیدا ہوئی تھی آنٹی میری...... ماں ہیں۔"

لنک اداسی سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

میں نے آنسو پونچھ کر جنوری کے اوراق نکال لیے۔

۲۲ جنوری ۱۹۴۸ء ڈاکٹر کہتا ہے کہ تاخیر ہو گئی ولادت ہو جانی چاہیے تھی فریڈ کا رویہ بہت اچھا ہے لیکن اینا مسلسل طعنے دیتی رہتی ہے وہ بار بار یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ میں اس کے ٹکڑوں پر پل رہی ہوں۔ کاش میں اپنی ماں کی طرح زچگی کے وقت مر جاؤں خدایا میری یہ خواہش پوری کر دے۔

۲۳ جنوری کا صفحہ خالی تھا۔

۲۴ جنوری ۱۹۴۸ء کتنی پیاری سی بچی ہے میری، میری آغوش میں لیٹی دودھ پی رہی ہے چوبیس گھنٹے تک میں لیبر روم میں رہی لیکن ان چوبیس گھنٹوں کے

کرب کا انعام مجھے اس حسین مورت کی شکل میں ملا جو فریڈ کی بھی بیٹی ہے۔ میں نے اس کا نام کینڈرا رکھا ہے اس کی نانی کے نام پر...... خدایا...... تیرا شکر ہے کہ تو نے موت کے بارے میں میری خواہش کو پورا نہیں کیا میں اب اسے پال پوس کر جوان کروں گی لیکن اینا کی طرح نہیں۔"

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، میں پہلے ہی آنٹی ہیلن کو ماں کی طرح چاہتی تھی لیکن ۲۴ جنوری کا ورق پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں آنٹی ہیلن کی محبت بھری مٹھاس دوڑ رہی ہو۔ میرے دل کے تمام گوشے ممی پکارنے لگے۔ آنسو بہتے رہے جن کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہو گیا۔ لنک نے مجھے تسلیاں دیں اور پھر جب اس نے میرے آنسو پونچھ ڈالے تو میں پھر پڑھنے لگی۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء انہوں نے مجھے مجبور کر ہی دیا میں فریڈ اور اینا کو یہ اجازت دینے پر رضا مند ہو گئی کہ وہ کینڈرا کو اینا کی بیٹی کے طور پر متعارف کرائیں میں کینڈرا کو اینا کے حوالے کبھی نہ کرتی لیکن سوال یہ ہے کہ کینڈرا کس کو اپنا باپ کہے گی ویسے اب میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتی۔ اینا ہر وقت میری توہین کرتی رہتی ہے مجھے ورسائل واپس جانا ہوگا اور میں وہاں یہ خوشخبری سناؤں گی کہ میں خالہ بن گئی ہوں مجھے کینڈرا کے بارے میں فریڈ کے رویے کی کوئی فکر نہیں وہ اس کا باپ ہے اور اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ میں چلی جاؤں گی لیکن کینڈرا مجھے یاد آتی رہے گی فریڈ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی کینڈرا کو مجھ سے ملانے کے لیے ورسائل لاتا رہے گا۔ اس نے یہ بھی پیش کش کی ہے کہ میں جب چاہوں کولمبس آ سکتی ہوں اور صرف یہ درخواست کی ہے کہ کینڈرا کو کچھ بھی پتا نہ چلے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی ناجائز اولاد ہے۔"

میں ماضی کے جھروکے میں جھانکنے لگی آنسوؤں کے باوجود سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ پاپا نے آنٹی نہیں بلکہ ممی سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا وہ ہر ایک دو مہینے بعد مجھے ورسائل لے جانے لگے۔

میں نے ڈائری پر نظریں پھر جما دیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ء میں کولمبس سے ابھی واپس آئی ہوں کرسمس کا دن کینڈرا اور فریڈ کے ساتھ گزارا حالانکہ اینا دن بھر کچوکے دیتی رہی لیکن میری خوشی متاثر نہیں ہوئی کیونکہ کینڈرا ہمہ وقت میری گود میں رہی لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ اینا کینڈرا سے محبت نہیں کرتی تو میں نے فریڈ سے بات کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ کینڈرا اور اینا کو ورسائل لے چلے میں نے اسے سمجھایا کہ کینڈرا اب بولنے، چلنے لگی ہے اب محبت اور نفرت کا احساس بھی ہونے لگا ہوگا۔ لہٰذا اسے کسی عورت کی محبت دینا ضروری ہے جب فریڈ نے میرے سامنے اینا سے بات کی تو وہ بپھر گئی پھر جب میں نے دھمکی دی کہ میں دنیا کو حقیقت بتا دوں گی تو وہ ٹھنڈی پڑ گئی اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ کسی کو یہ نہیں علم ہوگا کہ کینڈرا کس کی بیٹی ہے اور یہ کہ گریجویشن نائٹ، جیل سے رہائی کے بعد اینا نے دلدلی علاقے میں فریڈ کو لے جا کر کس طرح مجبور کر دیا تھا میرا خیال ہے کہ اب وہ لوگ میری کینڈرا کو لے کر جلد ہی ورسائل آ جائیں گے۔"

اب مجھے علم ہوا کہ پاپا اور اینا اچانک ورسائل کیوں آ گئے تھے۔ مجھے یہ بھی احساس ہو گیا کہ اینا مجھ سے نفرت کیوں کرتی تھی۔

۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء میرا خاندان گھر واپس آ گیا آج تو اینا کو بھی دیکھ کر میں خوش ہو گئی۔ سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ کینڈرا کی سالگرہ پہلی بار ورسائل میں میری چھت کے نیچے منائی جانی تھی۔ وہ چار

سال کی ہوگئی ہے میں نے اپنے کمرے میں مناسب تبدیلیاں کرلی ہیں کیونکہ کینڈرا میرے ساتھ ہی سویا کرے گی آہ...... اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر سونے میں کتنا سکون ملے گا۔"

ورسائل میں میری سالگرہ کی پہلی تقریب اس المیہ سے تین سال پہلے کا واقعہ تھا میرا دل چاہا کہ میں تمام اوراق چھوڑ کر آخری اوراق پڑھ ڈالوں لیکن میں نے اس خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میں نے سوچا کہ تین سال بعد کے واقعات کو ۲۳ جنوری ۱۹۵۵ء کے واقعہ کے تناظر میں دیکھنا مناسب نہیں۔

پہلے سال تو حالات ایسے ہی رہے جیسے اینا اور پاپا کی شادی سے قبل تھے اب فرق صرف یہ تھا کہ ممی ہیلن، پاپا کو عشقیہ خطوط نہیں لکھتی تھیں اور میں اپنی حقیقی ماں کے پاس تھی۔

۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء ہم نے آج فریڈ کی اکتسویں سالگرہ منائی اور آج جب اینا نے میرے سامنے فریڈ کو بوڑھا آدمی کہا تو میں سلگ اٹھی۔ اس نے فریڈ کو سالگرہ کے تحفے میں ایک چھڑی پیش کی اور ہنستے ہوئے کہا کہ فریڈ کو جلد ہی اس کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی لہذا جب وہ شاہ بلوط کے درخت سے چند گز دور شیڈ میں مصوری کا شوق پورا کرنے کے لیے گئی تو میں نے بھی اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ مصوری کی دلدادہ تھی اور اس نے شیڈ میں اسٹوڈیو بنا رکھا تھا لیکن ایک سال میں وہ صرف ایک پینٹنگ بنا سکی تھی اور اس کی وجہ مجھے آج ہی معلوم ہوئی جب میں اس کا تعاقب کرتی ہوئی شیڈ میں پہنچی تو وہاں ہمارا چوکیدار والٹر بھی موجود تھا میں ایک طرف چھپ گئی والٹر کی عمر بیس سال ہے میں نے انہیں شرمناک حالت میں دیکھ کر واپس آنا ہی مناسب سمجھا اور پھر اس کشمکش میں مبتلا ہوگئی کہ فریڈ کو کچھ بتاؤں یا نہیں۔"

میری آنکھیں پھر بھیگنے لگیں میں اینا کو اپنی ماں سمجھ کر اس کی پاکیزگی کا ثبوت لوگوں کو دینے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن یہاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری آنٹی تھی اور اپنے جرائم کی مجرم تھی جو اس پر سرگوشیوں میں عائد کیے جاتے تھے۔

۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء آج میری جگر گوشے کی پانچویں سالگرہ تھی اور اینا بن ٹھن کر یہ کہنے کے بعد گھر سے چلی گئی تھی کہ وہ کینڈرا کے لیے تحفہ لانے جارہی ہے لیکن اس کی واپسی رات اس وقت ہوئی جب معصوم کینڈرا سوگئی تھی میں کینڈرا کو سینے سے لگائے لیٹی تھی کہ مجھے ان کے کمرے سے تلخ کلامی کی آواز سنائی دی میں جانتی تھی وہ کیوں لڑ رہے ہیں۔ فریڈ کو اینا کی آوارہ گردی کا علم ہوگیا تھا۔ مجھے ان کے جھگڑے کی کوئی فکر نہیں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ان کی آوازیں کینڈرا کی نیند خراب نہ کردیں کینڈرا سوتے میں فرشتہ لگتی ہے میں نے آج اسے میوزک بکس بجانے کی اجازت دی تھی جس کو سنتے سنتے وہ سوگئی۔"

پاپا کو اینا کی بے راہ روی کا علم ہوا تو وہ سب سے پہلے اس ہستی کے پاس گئے جس پر انہیں سب سے زیادہ اعتماد تھا اور یہ ہستی میری ماں تھی۔

۱۰ مئی ۱۹۵۳ء آج بے چارہ فریڈ بالکل ٹوٹا پھوٹا میرے پاس آیا۔ اس نے اینا سے شادی پر پچھتاوے کا اظہار کرتے ہوئے وہ تمام واقعات بتا دیے جن کا مجھے ورسائل کے بعض لوگوں سے سرسری علم ہوگیا تھا اینا کی گریجویشن نائٹ کے موقع پر گرفتاری کے بعد جب وہ اسے رہا کرانے جیل گیا تو اینا کو چند منٹوں میں رہائی مل گئی تھی لیکن وہ دونوں صبح ہونے سے قبل واپس نہیں آئے تھے۔ اس وقت فریڈ نے یہ بہانہ بنا دیا تھا کہ اینا شرمندگی کے باعث فوراً گھر واپس آنا نہیں

چاہتی تھی ہوا یہ تھا کہ رہائی کے بعد اینا نے فریڈ سے کہا کہ وہ بہت پریشان ہے لہٰذا گھر جانے سے قبل کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہے فریڈ اسے جھیل کی طرف دلدلی علاقے میں لے گیا اور پھر اینا نے جو بہت خوب صورت تھی وہاں ایسی حرکتیں کیں کہ فریڈ اس کی دعوت رد نہ کر سکا۔

اس رات کے بعد ہی سے فریڈ نے مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی لیکن آج اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی وجہ محبت کی کمی نہیں تھی اس نے کہا وہ شرمندہ تھا اور پھر جب ایک روز اینا نے اسے یہ اطلاع دی کہ وہ امید سے ہے تو وہ یقین کر بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بچے کو اپنانے اور معاشرہ میں اسے اس کا جائز مقام دلانے کے لیے اینا سے شادی کرلے گا لیکن شادی کے بعد معلوم ہوا کہ اینا نے اسے بلیک میل کیا تھا۔“

اگلے اوراق ان گناہوں کے بارے میں تھے جو درسائل میں آنے کے بعد اینا کرتی رہی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء اینا سے ایک اور جھگڑے کے بعد آج رات فریڈ میرے کمرے میں آ گیا اس نے اعتراف کیا کہ ایک سال سے وہ دونوں حقوق زوجیت ادا نہیں کر رہے ہیں وہ رو پڑا اور میں نے مجبور ہو کر میرے خدا مجھے معاف کردے۔“

اگلے اوراق میں یہ ذکر تھا کہ پاپا ہر ایک دو روز بعد ممی ہیلن کے کمرے میں آنے لگے اور یہ بھی کہ میرے اور ممی کے لیے اینا کی نفرت میں کس طرح اضافہ ہوتا رہا۔

۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء مجھے خوشی ہے کہ میرے اور فریڈ کے تعلقات کا علم ہو ہی گیا وہ آج شام ڈھلے کہیں گئی تھی میں نے کینڈرا کو سلا دیا تھا اور فریڈ میرے کمرے میں موجود تھا کہ وہ خلاف توقع نصف شب سے پہلے ہی واپس آ گئی اس نے ہم پر الزام لگائے اور گالیاں دیں تو فریڈ نے حتمی جواب دیا کہ وہ طلاق چاہتا ہے۔ اس پر وہ آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا وہ بہت کمینی تھی اسے فریڈ کی نہیں فریڈ کے سہارے کی ضرورت تھی تا کہ وہ اس کی آڑ میں گل کھلاتی رہے پتا نہیں نیا سال کیا لائے گا۔“

میں جانتی ہوں کہ ۱۹۵۵ء کیا لایا تھا۔

میری والدہ نے اس رات کی پوری تفصیل لکھی تھی جب پاپا اور اینا کا قتل ہوا تھا۔

۲۳ جنوری ۱۹۵۵ء آج میری زندگی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ کینڈرا اینا سے بھی حسین نکل رہی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اینا کی طرح بدتمیز نہیں ہے۔ اس کی باتیں بچوں کی طرح معصوم ہیں جبکہ اینا اس عمر میں زبان دراز ہو گئی تھی کینڈرا کو اس بحران کا علم نہیں جو اس گھر میں جنم لے چکا ہے آج، سالگرہ کے باوجود اینا سارا دن گھر سے غائب رہی لیکن عین وقت واپس آ گئی جب کیک کٹنے والا تھا فریڈ آج گم صم سا تھا اس نے طلاق کے معاملے میں کسی وکیل سے بات کرلی ہے اور اس کا علم اینا کو بھی ہے۔“

”بس کرو۔“ لنک نے دونوں ہاتھ ڈائری پر رکھ کر کہا ”بس......اب اسے ضائع کردو پلیز۔“ وہ بہت خوفزدہ لگ رہا تھا ایسے جیسے اگلے اوراق کوئی المیہ جنم دیں گے۔

”ہاتھ ہٹاؤ لنک۔“ میں نے تڑپ کر جواب دیا لیکن لنک ڈائری چھین کر آتش دان کی طرف اچھال چکا تھا۔ میں اچھل کر آتشدان کی طرف لپکی اور اس سے پہلے کہ لنک مجھے روکتا میں نے شعلوں میں ہاتھ ڈال کر ڈائری نکال لی جس کے برسوں پرانے خشک اوراق نے آگ پکڑ لی تھی میں دونوں ہاتھوں سے ان کی آگ بجھانے لگی اور جب ہاتھ جل گئے اور ان میں سکت نہ رہی تو میں پیروں سے اس کے شعلے

بجھانے لگی حتیٰ کہ لنک نے مجھے تھام لیا اور میں گر کر بے ہوش ہوگئی۔

مجھے ہوش آیا تو لنک میرے دونوں ہاتھوں پر پٹیاں باندھ چکا تھا اور میری پیشانی پر پانی میں بھیگا ہوا تولیہ رکھ رہا تھا۔

''ڈائری کہاں ہے لنک۔'' میں نے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا جو سفید پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

''یہ رہی۔'' اس نے اداسی سے جواب دیا۔

''مجھے پڑھ کر سناؤ...... پلیز۔''

''کینڈرا!''

''لنک پلیز میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ باقی صفحے پڑھ کر سنا دو ورنہ میں......!''

''او کے......!'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ آگ سے آخری اوراق کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

''۲۴ جنوری۔'' اس کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی اور میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''۱۹۵۵ء جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا یہی تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں میں اب جو کچھ لکھ رہی ہوں اس کی وجہ ڈائری لکھنے کا شوق نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے واقعات قلم بند کر رہی ہوں کہ کوئی بے گناہ نہ پکڑا جائے میرا مطالبہ یہ ہے کہ ان واقعات کا علم کینڈرا کو نہ ہو پائے وہ پہلے ہی کافی صدمے برداشت کر چکی ہے۔''

وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''پڑھتے رہو پلیز۔'' میں نے سسکی لے کر کہا۔

''ان میں جھگڑا نصف شب کے بعد شروع ہوا وہ دونوں اپنے بیڈ روم میں تھے اور کینڈرا حسب معمول میرے سینے سے لگی سو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اسے کمرے میں محوِ خواب چھوڑ کر کچن میں چلی آئی تاکہ اگلے روز کے لیے گوشت کاٹ سکوں میرے ہاتھ میں لمبے پھل والا چاقو تھا اور مجھے کچن میں بھی ان کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ خوف دامن گیر ہوگیا کہ کہیں ان کی آوازوں سے ننھی کینڈرا کی نیند خراب نہ ہوجائے مجھے علم تھا کہ جھگڑا طلاق کے مسئلے پر ہی ہو رہا ہے اور فریڈ نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کی حقیقی ماں دے کر سالگرہ کا جشن منانا چاہتا ہے۔ میں نے کچن کلاک کی طرف دیکھا بارہ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے اور یہ جھگڑا تقریباً ایک گھنٹے سے جاری تھا میں نے صرف اس خیال سے ان کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے کہ انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کروں کہ کینڈرا کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ چاقو کچن میں ہی چھوڑ جاؤں میں نے ان کے دروازے پر دستک دی مگر شاید وہ اپنے شور میں اس کی آواز نہ سن سکے۔ میں نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو وہ شب خوابی کے لباس میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے چلا رہے تھے۔ اینا کی حالت کچھ جنونی سی تھی وہ غلیظ گالیاں دے رہی تھی اور فریڈ غصے کے باوجود اسے خاموش رہنے کیلئے کہہ رہا تھا کچھ دیر تک تو انہیں میری آمد کا احساس نہیں ہوا اور میں اینا کی طرف دیکھتی رہی اس کے دانت چمک رہے تھے آنکھوں میں بدمعاشی اور غصہ تھا۔ اس کے ہاتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ اپنے ناخنوں سے فریڈ کی آنکھیں تک پھوڑ دے گی اور پھر اس نے فریڈ پر حملہ کر ہی دیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کوئی ناخن، فریڈ کی آنکھ میں گھس جائے لیکن فریڈ نے اس کے ہاتھ پکڑ کر زور سے دھکا دیا تو وہ بیڈ پر گر گئی اور اسی لمحے اس کی نظریں، مجھ پر پڑیں۔ اس نے ہذیانی انداز میں مکروہ

قہقہہ لگاتے ہوئے تھوک دیا۔
''تم دونوں وعدہ کر چکے تھے کہ کسی کو اس راز سے آگاہ نہیں کرو گے۔''
''ہاں......!''فریڈ نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔''ہمیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''
اینا، فریڈ سے دور ہٹ گئی۔ اس کا ہر قدم میری طرف اٹھ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور چاقو فرش پر گر پڑا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر چاقو اٹھا لیا اور زور سے قہقہہ لگاتی ہوئی فریڈ کی طرف لپکی۔ اس سے قبل کہ فریڈ اس کی زد سے بچتا چاقو کا پھل اس کے سینے میں اتر گیا۔ وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر گیا میں خوف اور دہشت کے باعث چیخ اٹھی۔ ''تم نے مار ڈالا۔'' اگلے چند سیکنڈ منجمد ہوگئے۔ میں اسے فریڈ کی لاش سے چاقو نکالتے ہوئے دیکھتی رہی مجھے پہلی بار اینا کے وجود تک سے نفرت محسوس ہوئی اور پھر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا اس کے انداز میں حیوانیت تھی، درندگی تھی میں اس کا اگلا شکار بننے والی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد وہ ننھی سی کلی کینڈرا کو بھی اسی چاقو سے ذبح کر دے گی وہ اچھل کر میری طرف آئی تو میں ایک طرف ہوگئی اور وہ بستر پر گر گئی۔ اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں نے اس سے چاقو چھین لیا میری نظر ایک بار پھر اپنی پہلی اور آخری محبت کی لاش پر پڑی میری بیٹی کا باپ قتل ہو چکا تھا۔ میں دیوانی سی ہوگئی اور پھر میں نے اینا پر حملہ کر دیا چاقو بہت تیزی سے اینا کے جسم میں لگ کر نکل رہا تھا میرا ہاتھ مشین کی طرح چلتا رہا میں اسے کاٹتی رہی اور بیڈ شیٹ خون سے تر ہوگئی۔ وہ ہچکی لے کر دم توڑ گئی لیکن میں اس کے جسم میں گھاؤ لگاتی رہی۔ تبھی میں نے ہلکی سی آواز سنی، میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری ننھی سی بیٹی خوف زدہ حالت میں سب کچھ دیکھ رہی تھی میں کھڑکی سے باہر کود کر باہر کھڑی ہوگئی اور پھر اندر جھانکنے لگی میں نے اسے روتے دیکھا تو یوں لگا تو یوں لگا جیسے میرا دل پانی کی طرح بہہ جائے گا پھر وہ نہ جانے کیوں بھاگ کر الماری میں چھپ گئی اور اس نے اندر سے کنڈی چڑھالی۔
میں عقبی لان میں کچھ دیر تک لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی۔ مجھے صرف یہ فکر تھی کہ اب کیا ہوگا، کینڈرا کا کیا بنے گا؟ اس کا باپ مر چکا ہے اور ماں...... قاتل ہے۔
پھر اب صبح ہونے لگی تو میں نے چاقو کو اچھی طرح دھو کر اپنے خون آلود ہاتھ، چہرہ اور بازو صاف کیا میں گرفتاری سے بچنا نہیں چاہتی اور ایسا اس لیے بھی ممکن نہیں تھا کہ کینڈرا مجھے دیکھ چکی تھی میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ اینا کا ناپاک خون میرے جسم پر نہ لگا رہے۔
پھر میں نے شیرف جے ڈی کو فون کر کے بتایا کہ وہ دونوں مر چکے ہیں اس نے یہ سنتے ہی ریسیور رکھ دیا اس نے نہ تو میرا بیان لینے کی زحمت گوارا کی اور نہ ہی مجھے اقبال کرنے کی مہلت دی۔
اب کینڈرا ہی میرے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ میں اسے الماری سے نکالنا چاہتی ہوں لیکن اس کی سسکیاں میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہیں۔
میں نے الماری کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھی۔ شاید اسے یہ خوف تھا کہ میں اسے بھی قتل نہ کر دوں لیکن پھر اس نے میری آواز سنتے ہی اندر سے کنڈی ہٹالی اور میری آغوش میں آ گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ لاشیں نہ دیکھ سکے اور پھر اسے سینے سے چمٹائے ہوئے کمرے میں لے آئی۔

شیرف اور ڈاکٹر دونوں موجود ہیں، کینڈرا کی زبان گنگ ہے وہ کسی سوال کا جواب دینا چاہتی ہے مگر نہ جانے کیوں اس کی زبان نہیں کھل رہی ہے شاید اسے مجھ سے ڈر لگ رہا ہے لیکن اسے صرف میری گود ہی میں قرار بھی مل رہا ہے وہ بار بار میرے سینے پر منہ رکھ کر سونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ شیرف کو سب کچھ بتا دوں، لیکن پھر کینڈرا کا خیال کون رکھے گا؟

اب دوپہر ہو چکی ہے کینڈرا میری لوریاں سننے کے بعد سو گئی ہے میں نے اسے کچھ دیر تک میوزک بکس بجانے کی اجازت دی تھی جس کے بعد اس کی کیفیت میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔

ڈاکٹر اور شیرف دونوں اس نکتہ پر متفق ہیں کہ یہ قتل اور خودکشی کا کیس ہے میری نظروں میں اب بھی اینا کی لاش ناچ رہی ہے جس کے جسم کو میں نے ناقابل شناخت حد تک مسخ کر دیا تھا۔

شیرف کچھ دیر پہلے ہی رخصت ہوا ہے۔ لاشیں ہٹا دی گئی ہیں مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں گرفتار نہیں ہوں گی فریڈ مجھے معاف کر دینا میں تمہاری بیٹی کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ تم نے کہا تھا نا کہ کینڈرا کو اس کی حقیقی ماں واپس کر دو گے دیکھو، کینڈرا کو اس کی ماں مل گئی ہے تم نے مجھے گرفتار نہیں ہونے دیا سارا جرم اپنے سر لے لیا۔

تدفین کے فوراً بعد اس گھر کو بند کر کے کینڈرا کو یہاں سے بہت دور لے جاؤں گی۔

اور کبھی واپس نہیں آنے دوں گی۔

میں ہیلن پیم بروک عمر اڑتیس سال اپنی زندگی کے آخری جملے لکھ رہی ہوں۔ اب میں کبھی ڈائری نہیں لکھوں گی میں قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک کسی مرد کے پاس نہیں جاؤں گی بلکہ اپنی بیٹی کے لیے باپ اور ماں ثابت ہوں گی میں قسم کھاتی ہوں کہ اسے یہ علم کبھی نہیں ہونے دوں گی کہ اس کی ماں زندہ ہے میں باقی زندگی اپنے وجود کو قربان کر کے گزار دوں گی خدایا...... میری مدد کرنا۔"

......☆☆☆......

لنک نے ڈائری بند کر دی اور وہ دیر تک میرے رد عمل کا منتظر رہا۔

مجھے ان انکشافات کے بعد افسردہ، ملول، دلگیر اور پاگل ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں بے حرکت بیٹھی رہی ایسے جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

تبھی میرے ذہن میں ایک آواز گونجی، "وہ میری قاتل ہے کینڈرا۔"

میرے جسم میں ایک سرد ترین لہر سی دوڑ گئی ایسا لگا جیسے میں کسی سرد تابوت میں لیٹی ہوں۔

"کینڈرا۔" لنک کا زرد چہرہ مجھے نظر آیا اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے اس کا چہرہ نظر آ رہا ہے لنک...... پاپا کی قاتلہ نظر آ رہی ہے، مجھے بچا لو...... بچا لو لنک وہ مجھے بھی پاپا کی طرح سینے میں چھری گھونپ کر مار ڈالے گی۔

لنک نے مجھے بانہوں میں لے لیا اور پھر میں روتے روتے سو گئی۔

......☆☆☆......

میری آنکھ اچانک کھلی لیکن آنکھ کھلنے کی وجہ کوئی آواز نہیں تھی بس ہلکی سی سسکی تھی اور یہ سسکی اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے وجود میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کیا، صرف تجسس تھا میں پرسکون نیند سوتے ہوئے شوہر کو بیدار کرنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا میں نے موم بتی جلا لی، پھر میں نے اس سسکی پر کان لگا دیے۔ یہ سسکی الماری کی طرف سے آ رہی تھی میں نے

پٹیوں سے بندھے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے الماری کا دروازہ بمشکل کھولا اور سن ہو کر رہ گئی۔

وہاں ایک بچی سسک رہی تھی۔

میں نے اسے تسلی دینے کے لیے ایک ہاتھ آگے بڑھایا لیکن میرا ہاتھ الماری کے آر پار ہو گیا۔ بچی کے وجود سے بھی گزر گیا۔

میں نے ایک بار پھر غور سے سنا، اب گھر میں کئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں گوشت کاٹنے کی آواز بھی شامل تھی میں موم بتی اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے سے نکلتے ہی یہ آواز اور تیز ہو گئی اور جونہی میں نے کچن میں قدم رکھا اچانک خاموشی کا راج ہو گیا۔

کچن ٹیبل پر چاقو رکھا ہوا تھا جسے میں نے بڑی احتیاط سے اٹھایا اور اسی لمحے خواب گاہ سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ میں بہت تیزی سے خواب گاہ کی طرف لپکی موم بتی کی مدھم روشنی میں مجھے ایک ہیولا نظر آیا جو بستر پر لیٹے ہوئے شخص پر جھکا ہوا تھا اس ہیولے نے آہٹ پاتے ہی پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک عورت تھی لیکن الماری والی بچی کی طرح یہ بھی شفاف تھی۔ اس کے جسم کے آر پار نظر آ رہا تھا میں اسے چھونے کے لیے آگے بڑھی تو وہ دور ہو کر ہنسنے لگی۔ میں آئینے کے سامنے سے گزری تو موم بتی کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے آئینے میں دیکھا میں فطری لباس میں کھڑی تھی۔ میں جو گاؤن پہن کر سوئی تھی وہ غائب تھا۔

میں نے ایک بار پھر عورت کی طرف دیکھا۔ اب وہ ایک گاؤن پہنے ہوئے تھے۔

"سنو بیٹی کچھ ڈھونڈ رہی ہو؟" اس نے بیٹی کہا تھا لیکن میں نے اس کے لہجے میں کینہ اور زہریلا پن محسوس کر لیا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تھے۔ تبھی ایک اور ہیولا نمودار ہوا یہ کسی مرد کا تھا۔

"دفعان ہو جاؤ۔" ہیولے نے عورت سے کہا۔

"اسے کچھ مت کہنا، یہ بے قصور ہے۔"

"میں اپنی بیٹی سے ملنے آئی ہوں۔"

"دفعان ہو جاؤ جہاں سے آئی ہو وہیں چلو۔" مرد کے ہیولے نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عورت کا ہاتھ کسی چاقو کی طرح مرد کے سینے میں ترازو ہو گیا اور پھر مرد کا ہیولا غائب ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم تو مجھ سے بھی خوب صورت نکلیں حالانکہ وہ اتنی حسین نہیں تھی۔" یہ کہہ کر وہ اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس نے میک اپ کرنا شروع کر دیا۔

جونہی صبح کا ملگجا نمودار ہوا وہ اٹھ گئی۔

"اب مجھے واپس جانا ہوگا آؤ میں تمہیں کوئی چیز دکھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گاؤن کھول دیا اور میں انتہائی خوف کے عالم میں چلا اٹھی۔

اس کے سینے پر تین گھاؤ تھے جن سے خون بہہ رہا تھا پیٹ پر ایک بڑے گھاؤ سے آنتیں جھانک رہی تھیں پہلو میں ایک گھاؤ سے پیپ بہہ رہی تھی گردن کے نیچے حلق پر بھی ایک زخم تھا اور دونوں رانوں پر چاقو کے گہرے گھاؤ تھے وہ ناچنے لگی اور میں دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر بھاگنے لگی لیکن پھر میں نے رک کر موم بتی اٹھائی اور اس پر دے ماری۔ اس کے ریشمی گاؤن نے آگ پکڑ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ عورت غائب ہو گیا۔

میں سوچے سمجھے بغیر نہ جانے کیوں اندھا دھند بھاگنے لگی میں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔

میں نے اسٹار پیلس سے نکلتے ہوئے صرف اس کا قہقہہ سنا وہ کہہ رہی تھی۔ "دیکھا ہیلن میں نے انتقام لے لیا ہے۔"

☆☆☆

پتا نہیں کس نے مجھے تلاش کیا میری آنکھ کھلی تو ایک وردی پوش مجھے گھور رہا تھا اور میں ایک کھیت میں لیٹی ہوئی تھی۔

"پاگل ہوگئی ہے یونہی نکل آئی ہاتھ جلے ہوئے ہیں" اس نے کہا۔ "شوہر تو مر گیا جلا کر مار دیا ہوگا اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی اس بے چارے لنگڑے کو آگ سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

پتا نہیں وہ کیا بک رہا تھا کیسا شوہر کیسی آگ۔

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "کینڈرا لنک مجھ سے واقف ہو میں شیرف جے ڈی ہوں۔"

پتا نہیں اس نے مجھے کینڈرا لنک کیوں کہا تھا ویسے کینڈرا اور لنک دونوں نام مجھے مانوس سے لگے تھے۔

میں خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر انہوں نے مجھے یہاں لا کر بند کر دیا۔

☆☆☆

یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ میرا نام کینڈرا اونیل لنک ہے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں جوان ہوں میری عمر ستائیس سال ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میرا شوہر مر گیا لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ کب اور کیسے؟

یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہر چیز سفید ہے چاروں طرف صفائی رہتی ہے یہاں کے لوگ بھی سفید ہیں ہم سب سفید کپڑے پہنتے ہیں میرے بستر کی چادر بھی سفید ہے اور بستر پر نظر پڑتے ہی کوئی چیز میرے ذہن میں کلبلانے لگتی ہے لیکن میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتی۔ جب بھی میں بستر پر لیٹتی ہوں تو دائیں طرف ضرور ہاتھ رکھتی ہوں لیکن وہاں کوئی نہیں ہوتا۔

اب بہار آرہی ہے چڑیوں کی چہچاہٹ مجھے سویرے ہی بیدار کر دیتی ہے اور میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے یہ سوچتی ہوں کہ میرے دروازے کی جگہ سفید سلاخیں کیوں لگائی گئی ہیں۔

آج ہی ڈاکٹر ایک خوب صورت شخص کے آئے تھے اس کا نام ڈین تھا ڈین دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اس نے مجھ سے مس میبل کے بارے میں پوچھا لیکن میں کسی مس میبل کو نہیں جانتی پھر جب اس نے یہ بتایا کہ مس میبل مر گئی ہیں تو نہ جانے کیوں میں رونے لگی۔

ڈین پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے وہ ضرور آئے گا اسے آنا چاہیے مجھے اس سے انسیت ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میری یادداشت چند مہینوں میں واپس آجائے گی اور پھر ڈین مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ پتا نہیں آنٹی ہیلن مجھ سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آتیں۔ مجھے آج کل ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر آنٹی ہیلن میری کون ہیں میری خالہ یا ماں...... شاید کل آئیں گی اور پھر میں ان سے پوچھ لوں گی کہ وہ میری کون ہیں۔

سرد ہوا

ناز سلوش ذشے

عرصے بعد ایک کہانی لے کر حاضر ہوں۔ میں نے اس کا نام تجویز نہیں کیا کیوں کہ جنات کے موضوع پر غالباً یہ میری پہلی کہانی ہے۔ میری پچھلی کہانیوں کی طرح یہ بھی ایک سچی کہانی ہے۔ بہر حال پسند نہ پسند کا اختیار آج بھی قارئین کے پاس ہے۔

سدسمبر 2011ء کا واقعہ ہے' میں تربیلا اپنے ننھیال میں تھی' یخ سردی کے دن تھے۔ سرد ہواؤں کے جھونکے تربیلا جھیل پر سے سرکتے ہوئے آتے اور صحن میں لگے درختوں کے درمیان سے اپنا رستہ بناتے ہوئے کمروں کے دروازوں پر سر پٹخنے لگتے گو کہ ان جھونکوں کی آواز قطعاً ڈرامائی نہ تھی اور نہ میر پور کی ان ہواؤں جیسی کہ جو سردیوں میں جب چلا کرتی ہیں تو آواز ہو بہو کسی زخم کھائی چڑیل کی آہوں اور سسکیوں اور کبھی کبھار بدروحوں کی چیخوں کی مانند ہوا کرتی تھی۔

میں اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ اپنی باقی کزنز کو لیے لڈو کھیلنے میں مشغول تھی کہ بڑی ممانی کا بلاوا آ گیا۔

"بیہ انگلینڈ واپس جانے والی ہے' کون کون جائے گا اس سے ملنے؟" اور اگلے ہی پل کمرے میں موجود سبھی کے ہاتھ فضا میں بلند تھے سوائے ایک سالہ طلحہ کے جو کہ مزے سے انگوٹھا چوسنے میں مشغول تھا۔

لمحوں میں ہم تیار ہو کر گاڑی میں اس گاؤں کی طرف رواں دواں تھے جہاں بیہ صاحبہ موجود تھیں جن کا مختصر ترین تعارف فقط یہ تھا کہ وہ میری والدہ کی خالہ زاد بہن کی ہونے والی بہو تھیں۔ رستہ ہمیشہ کی طرح خوش گپیوں میں کٹا اور اگلے گھر میں ہمارا استقبال وی آئی پی شخصیات سے کم کا ہر گز نہ تھا۔ بیہ کہ جس کی کچھ دیر قبل تک ان دیکھی ہستی کسی ایلین سے زیادہ اور کسی حور پری سے کم ہر گز نہ تھی۔ ہمیں پہلی نہ سہی دوسری نظر میں ضرور بھا گئی۔ ہاں البتہ اس کے ہاتھ ایسے تھے جسے تازہ دھنکی ہوئی دودھیا روئی سے بنے ہوں یا یوں کہ جیسے دوسری تہہ میں اڑتے جہاز سے ابر آلود موسم میں نیچے جھانکو تو دودھ سے گندھے ایک بادل کا گچھا سا نظر آئے کہ جس پر سورج کی کرنوں نے سونے کا پانی چڑھا رکھا ہو اور وہ دیکھنے میں اک ماورائی سی چیز لگے سو اس کے نرم ملائم ہاتھ کسی عجوبے سے کم ہر گز نہ تھے۔

ملنے ملانے کے بعد جب ہم گرم گرم کمبل میں پاؤں ڈال کر بیٹھے تو شاہین آنٹی تازہ' سرخ اور رس بھرے بیروں کی ایک باسکٹ اٹھا لائیں چونکہ ایسی چیزوں کی میں بڑی دیوانی ہوں لہٰذا وہ باسکٹ پوری کی پوری میرے حصے میں آئی۔ پہلا بیر منہ میں رکھتے ہی اس کی لذت میرے رگ و جاں میں اتر گئی۔

"آنٹی! یہ بیر آئے کہاں سے؟" اتنا لذیز بیر میں نے اس سے قبل نہیں کھائے۔"

"آیا تو کہیں سے نہیں' اپنے گھر کی بیری کے بیر ہیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ارے یہ تو موج ہو گئی پھر تو مجھے اس درخت کا ضرور وزٹ کرنا چاہیے' جس کا پھل اتنا لذیز ہو۔" میں نے باسکٹ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر ان کی ساس ہنس دیں۔

"ہاں ہاں ضرور جاؤ' یہ دروازہ ہے پچھلی طرف کا۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ساس کی بات سے شاہین آنٹی لمحہ بھر کو سٹپٹا گئیں اور ہڑبڑا کر بولیں۔

"ارے نہیں' باہر مغرب ہوگئی ہے اور اس وقت اس کا باہر جانا مناسب نہیں یہ ویسے ہی پیاری ہے' اوپر سے پنک کلر پہن رکھا ہے' نظر نہ لگ جائے۔"

"ارے نہ نہ آنٹی! ذشے کو نظر نہیں لگ سکتی' ہاں بس یہ کنفرم کر لیجیے گا کہ وہاں آپ کی کوئی پڑوسن نہ کھڑی ہو۔ اس کے ساتھ بس ایک ہی مسئلہ ہے کہ یہ جہاں جاتی ہے وہاں سے اس کے لیے رشتوں کی ایک لائن لگ جاتی ہے۔" میری خالہ زاد نے باتوں باتوں میں بیروں کی مٹھی بھرتے ہوئے کہا جس پر میں نے اسے ایک سخت گھوری ڈالی جس کا اس پر قطعاً اثر نہیں ہوا۔

"یہ بات نہیں' بیری کا درخت بھاری ہوتا ہے اور وقت بھی مغرب کا ہے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں اس وقت دوسری مخلوق کے اٹھنے کا وقت ہوتا ہے لہٰذا بعد میں پچھتانے کے بجائے' ہمیں پہلے خود ہی سے احتیاط کرنی چاہیے۔" آنٹی ہمیں سمجھاتے ہوئے بولیں جسے میں نے ان کے سامنے تو مصلحتاً مان لیا مگر درحقیقت یہ جن بھوتوں کے چکر سے میری جان جاتی ہے۔

ذکر مخلوق کا آیا تو لگے ہاتھوں سب اپنی اپنی کہنے لگے جیسے ثوبیہ آنٹی بولیں۔

"ہماری بھابی کی بہن تو یاد ہوں گی تم کو اتنی خوب صورت تھی کہ مثال نہیں۔ بس قسمت کی خرابی کہ تقدیر کا چکر' مغرب کے وقت کہیں سے آ رہی تھی کہ رستے میں پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر لگا دی اور بس' گھر پہنچی تو پہلے بخار نے جسم پکڑا رفتہ رفتہ آنکھوں پر اندھیرا چھانے لگا۔ رات تک اسے نظر آنا بند ہو گیا' تین برس گزر چکے ہیں کوئی جگہ چھوڑی نہیں مگر آرام نہیں ملتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں بخار کی وجہ سے نظر آنا بند ہوا ہے جبکہ روحانی معالج کہتے ہیں اس نے جو پتھر کو ٹھوکر ماری تو وہ سیدھا ایک جن کے بچے کی آنکھ پر لگا' بدلے میں انہوں نے اس کی نظر چھین لی۔"

مجھے واقعی افسوس ہوا وہ لڑکی واقعی حسین تھی بے چاری' بڑی ممانی بولیں۔

"نورین کی جٹھانی کا بھی سنا ہو گا' اس پر جنات کا سردار عاشق ہو گیا' سب اسے حاجی صاحب کہتے ہیں۔ پہلے پہل تو اس کے کان سے مکئی کے دانے نکلتے تھے پھر آنکھوں کی پتلیوں سے ریت نکلنے لگی۔"

میں نے اس عورت کو دیکھا ہوا تو نہیں تھا مگر سنا بہت تھا کہ وہ حاجی صاحب اب علاقے کے لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف بلا کہ سگریٹ نوش واقع ہوئے ہیں۔ ایک دو مرتبہ میرا دل چاہا جا کر انہیں آزماؤں مگر یہ سوچ کر کے اگر وہ سچی مچی کے جن بابا ہوئے تو...... میرا تو ہو گیا نا کام......

بس جی پھر کیا تھا کوئی پری والی کا قصہ سنا رہی ہیں تو کوئی جھولے والی سرکار کا' کوئی اس بارات کا کہ جو قبرستان سے گزر رہی تھی اور ان کی دلہن چھل پیری میں بدل گئی تھی اور لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اب بھی ہمارے خاندانی قبرستان میں رہتی ہے تو کوئی اسد کے جن بتانے لگا' اسد کا جن بھی بڑا دلچسپ تھا جب اسد (میرا چھوٹا کزن) کو اس کی من پسند چیز نہ ملے تو اس کا جن حاضر ہو جاتا ہے اور پھر اسد صاحب دل کھول کر اور جن کا ڈھونگ رچا کر سب کو تنگ کرتا پھرتا ہے اور یوں گھر والے اسے من پسند چیز دلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں گو کہ وہ ساتھ میں یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کا جن سو فیصد جعلی ہے کسی دو نمبر بنگالی بابا کی طرح مگر پھر وہ بیٹے کی ضد کے آگے ہار جاتے ہیں۔

اسی طرح خالد ماموں کے چھوٹے بیٹے فرحان کا قصہ جس کے ساتھ جنات کے بچے تھے اور وہ بچپن میں کچا گوشت بڑے شوق سے کھاتا تھا اور اب بڑا ہوا کہ وہ اپنے والدین کو امی ابو پکارنے کے بجائے نشاط اور خالد کے نام سے بلاتا ہے۔ یہ بھی الگ بات ہے کہ بلا کا نماز کا پابند ہے' سردی ہو یا گرمی پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ادا کرتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اسے کہہ دیا کہ فرحان تم فجر میں جلدی اٹھ جاتے ہو ہمیں بھی آج اٹھا دینا۔ جن کا بچہ ساری رات اس غم سے نہیں سویا کہ کہیں اس کی وجہ سے ہماری فجر قضا نہ ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ ہر آدھے گھنٹے بعد ایک گھنٹی ہمارے سرہانے بجاتا اور کہتا۔

"ارے سو مت جانا' فجر کے لیے اٹھنا ہے تم لوگوں نے۔"

قصہ مختصر سب کی اپنی اپنی بولیاں جاری تھیں کہ دفعتاً شاہین آنٹی کی ساس بول اٹھیں۔

"شاہین اسے مریم کا قصہ سناؤ۔" انہوں نے آنٹی کو مخاطب کیا اور پھر میری طرف مڑیں۔

"یہ تو اپنے گھر کی کہانی ہے' ایک دم سچی اور کھری۔ تمہیں یقیناً لکھنے کا مواد مل جائے گا۔"

بعد ازاں سب کے زور دینے پر آنٹی نے اپنی پڑوسن مریم کا واقعہ سنانا شروع کیا جس میں کافی حد تک ان کا کردار بھی موجود رہا تھا لہٰذا میں انہی کی زبانی

وہ واقعہ درج کروں گی۔

''مریم ایک عرصے سے ہماری پڑوسن تھی' انتہائی سگھڑ اور سلیقہ مند۔ سونے پر سہاگہ نہایت خوب صورت بھی تھی' سسرال کچھ خاص بڑا نہیں ایک ساس تھی' شوہر اور دو بچوں کے ساتھ خالصتاً گھریلو عورت تھی۔ خوب صورتی کی بناء پر کم عمری میں ہی ''ہما'' نامی ایک جن زادی اس پر فریفتہ ہوگئی اور اکثر اس پر ظاہر ہونے لگی تھی۔ بے ضرر سی ہما بچپن سے اب تک اس کے ساتھ تھی اور اکثر حاضر ہو کر اس کے کاموں میں مدد کیا کرتی تھی' آج تک ہما نے صرف انہی لوگوں کو تنگ کیا جنہوں نے بلاوجہ مریم کو چھیڑا ورنہ اس کی ذات صرف مریم تک ہی محدود رہی۔ ہاں اکثر جب وہ آتی تو مریم اور اہل خانہ سے دودھ کی فرمائش کرتی اور ایک وقت میں دس دس کلو دودھ پی جاتی۔ ہما کے آنے کی خاص نشانی تھی وہ بذات خود بہت خوب صورت تھی' مریم کے ہونٹ پتلے مگر دلکش تھے۔ اس کے لبوں پر یہ مسکراہٹ بڑی جچتی تھی مگر جب ہما اس کے اندر حلول کرتی تو اس کے ہونٹ انتہائی خوب صورت ہوجاتے یوں کہ جیسے کسی نقاش نے بڑی فرصت میں تراشے ہوں الغرض ہما کا وجود مریم کے لیے باعث آرام تو تھا مگر اس کے جانے کے بعد مریم کا جسم ادھورے نشے کی مانند ٹوٹنے لگتا تھا۔ کئی کئی دن تک وہ نڈھال پڑی رہتی اور گھر والے اس کی دیکھ بھال کرتے۔

خیر ہما کا قصہ تو اس کے بچپن سے تھا' مسئلہ خراب تب ہوا جب ایک روز وہ بیری تلے کھڑی ہوئی غالباً جمعہ کا دن تھا اور گرمیوں کا موسم تھا جیسا کہ ہر گاؤں کا رواج ہے کہ عصر کے بعد رات کا کھانا اور روٹی تیار کرلی جاتی ہے ہم محلے والیاں بھی بیری کے سائے تلے بنے تنور پر روٹی لگا رہی تھیں۔ آپ اس جگہ کو ہمارا اوپن ائیر میٹنگ کلب بھی کہہ سکتی ہیں سرے دن کا احوال اور جمع

وقت کا فاتح

بزدل بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب کارفرا ہم نہیں لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں، تو اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے، اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیے، اگر دشمن بے شمار ہیں، تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہوگیا کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ وہ زمانے کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا جائے؟ جس سے دامن بھرلوں، وہ یہ دیکھنے کیلئے آتا ہے کہ لیا کیا نہیں، جس کو پورا کردوں۔

محمد شفا...... کورنگی، کراچی

کتھا یہاں آکر سنایا جاتا ہے ہم ساتھ ہی اپنی باتوں میں مگن تھیں کہ مریم نک سک تیار ہو کر آگئی اس نے غالباً ابھی غسل کیا تھا۔ لانبے بالوں کے کناروں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور انگلیوں کے پورے مہندی سے سرخ تھے اور ساتھ ہی اس نے سرخ رنگ کا لباس بھی زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ ننگے تلے قدموں سے آئی اور ہمیں سلام کرنے کے بعد بیری کے ساتھ بندھے ہوئے جھولے پر بیٹھ کر ہلکا ہلکا جھولنے لگی وقتاً فوقتاً کسی بات میں شامل ہوجاتی ورنہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی جاتی اور جھولا لیتی جاتی۔

عصر سے مغرب کا وقت پڑ گیا تقریباً بھی عورتیں

اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں اور تنور کے پاس میں میری ساس اور مریم رہ گئے۔ ہم نے اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی حرکتیں بڑی عجیب سی لگیں۔

وہ کافی دیر سے جھولے پر بیٹھی جھولا تو جھول رہی تھی مگر اس کی آنکھیں یوں بند تھیں جیسے وہ کسی چیز کا سرور لے رہی ہو اس کے گھنے لمبے بال ہوا کے دوش پر اڑتے پھر رہے تھے حالانکہ ہوا بند تھی لبوں پر مسکراہٹ تو تھی لیکن وہ تب تھمتی جب وہ آنکھیں کھول کر بیری کی ایک مضبوط ڈال کو نظر بھر کر دیکھتی اس ایک پل میں اس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ لپکتا اور لمحے بھر میں معدوم ہو جاتا۔ میری ساس جہاں دیدہ خاتون ہیں وہ سمجھ گئیں کہ کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہے۔

انہوں نے آگے بڑھ کر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کیا اور دوپٹہ اس کے سر پر اوڑھا دیا' مریم اس عمل سے یوں چونکی جیسے کسی نے خواب سے جگایا ہو۔

ہمارے ہلانے پر وہ چپ چاپ اٹھی اور اپنے گھر چلی گئی پھر تین چار دن گزر گئے نہ وہ ادھر آئی نہ ہی ہم جا سکے۔ پانچویں دن صبح کو جب میں اپنے بیٹے کے لیے ناشتا بنا رہی تھی وہ درمیانے دروازے سے چلتی ہوئی آئی اور میرے پاس سے گزر کر برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کا اکھڑا اکھڑا انداز دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ اس پر ہما کا نزول پڑا ہوا ہے۔ میں نے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام میں مگن رہی۔

"شاہین! میرے لیے بھی پراٹھا بنانا۔"

مجھے توے پر پراٹھا ڈالتے دیکھ کر وہ رعب سے بولی مجھے اس کا لہجہ عجیب لگا کیونکہ ہما کبھی اتنے کرخت لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔ میں چپکے سے اٹھی اور اپنے بیٹے کو اندر رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کے کمرے کو باہر سے بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ دوسری مخلوق ذرا سے غصے کی وجہ سے میری اولاد کو نقصان پہنچائے جب میں پلٹ کر آئی تو توے پر پڑا پراٹھا جل چکا تھا۔ مریم کے رویے سے میں پہلی مرتبہ حواس باختہ ہوئی تھی' میں نے جلدی جلدی دوسرا پراٹھا تیار کیا' چائے گرم کر کے کپ میں ڈالی اور ٹرے لے کر مریم کی طرف آئی' خدا کی پناہ! مجھے آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں نے جیسے ہی ٹرے مریم کے سامنے رکھی اس نے کڑکتے ہوئے ہاتھ کا پنجہ گرما گرم پراٹھے پر رکھا اور پورے کا پورا پراٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا دیکھو ایسے......" انہوں نے مریم کے پراٹھا اٹھانے کے انداز میں جو ہاتھ میری طرف بڑھایا ان کے اس عمل سے میری چیخ نکل گئی کیونکہ میں حد درجہ ان کی قصہ گوئی میں محو تھی۔

"تم سے زیادہ میں ڈر گئی تھی کیونکہ پراٹھا منہ میں ڈالتے وقت مریم کے منہ کا دہانہ کانوں تک کھل گیا تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی غار کا منہ کھلا ہو۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹی تو اس نے پروانہ کرتے ہوئے ابلتی ہوئی گرم چائے بھی یوں پی لی جیسے وہ پانی ہو۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ہما! میں نے تمہیں ناشتا کروا دیا ہے اب تم یہاں سے جاؤ۔" ساتھ ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔ وہ ہنسی بلکہ ہنسا...... کیونکہ آواز مردانہ تھی۔

"میں ہما نہیں اشوک ہوں۔" ایک بے ہنگم خرخراہٹ سی اس کے گلے سے نکلی اور وہ تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"میری مینڈھیاں بنا دو شاہین!"

میں چپ چاپ تخت پر بیٹھ گئی اور اس کے لمبے بالوں کی مینڈھیاں بنانے لگ گئی' دل میں اک خوف بھی تھا۔ ہما کے بجائے یہ اشوک آن ٹپکا تھا اور نام بھی

خالص ہندوانہ، ہما مسلمان جن زادی تھی مگر یہ جن تو ہندو لگ رہا تھا اور ایسے شر پسند جنات کا کیا بھروسہ یہ کسی کے دوست کب ہوتے ہیں انہیں کوئی بھی بات کسی بھی لمحے بُری لگ سکتی ہے اور لمحوں میں اگلے بندے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ میں اللہ سے اس جن کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرتی رہی۔

''لو مریم! بال بنا دیئے میں نے' اب تم جاؤ۔ دیکھو میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اگر مجھے یا ان کو کچھ ہو گیا تو بہتر نہ ہوگا۔'' میرے ملتجیانہ رویے کو دیکھ کر وہ اٹھی اور اپنے گھر چلی گئی۔ آنٹی سانس لینے کو رکیں تو ہم سب کی محویت ٹوٹی۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' ہم سب یک زبان بولیں۔

اس کے بعد چالیس دن تک مریم کا امتحان تھا' وہ دن اس کے بہت سختی کے تھے اس کو وقتاً فوقتاً دورے پڑنے لگے' کبھی وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپنے لگتی' اپنا ہوش گنوایا تو کھانے پینے سے بھی رہ گئی۔ دن بہ دن اس کا بدن لاغر ہوتا گیا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ اور بال اب بھی ویسے ہی حسین تھے۔ اس کے سسرال والوں نے پہلے پہل تو سمجھا کہ ہما مریم کو تنگ کر رہی ہے مگر جب معاملات حد سے بڑھے تو وہ سنجیدہ ہوئے پھر مختلف عاملوں کے پاس چکر لگنے لگے۔ ہر ایک کا جن اتارنے یا بھگانے کا اپنا طریقہ کار تھا کوئی مار مار کر بے چاری کو لہولہان کر دیتا یہ کہہ کر کہ جن کو مار پڑ رہی ہے اور کوئی سوکھے جھاڑو سے جھاڑن کرتا' کوئی بال اور ناخنوں پر تعویز کر کے دیتا تو کوئی کچھ' الغرض اس کا اشوک کی موجودگی میں گزرنے والا ہر دن بہت سختی کا تھا۔

پھر اللہ کا کرم ہوا اور انہیں ایک ایسے عالم صاحب مل گئے جو پیشہ ورانہ عامل تو نہیں تھے البتہ ان کے پاس جنات سے متعلق خاص علم تھا اور وہ قرآنی آیات اور وظائف کے ذریعے مسائل کا حل نکال دیتے تھی۔ مریم کو جب پہلی مرتبہ ان کے پاس لے جایا گیا تو حساب سے اس کے ساتھ اس وقت کوئی جن نہیں تھا سب حیران ہوئے کیونکہ پچھلے کافی عرصے سے اشوک نامی شریر جن نے مریم کا جینا محال کر رکھا تھا۔ صرف یہی نہیں اس کے بچے' شوہر اور اس کے سسرال والے بھی اس کے زیر عتاب رہنے لگ گئے تھے اور وہ جی بھر کر انہیں تنگ کرتا۔

پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا جب جب اسے عالم کے پاس لے جاتے اشوک جن اس کے پاس سے غائب ہو جاتا اور جیسے ہی اسے گھر لاتے وہ پھر حاضر ہو جاتا۔ اب تو وہ باقاعدہ وارننگ دینے لگ گیا تھا کہ اگر مریم کو پھر کہیں لے جایا گیا تو وہ بہت بُری طرح پیش

سیاستدان بیوی

☆ ''سنئے! میں کب سے آپ کو بریفنگ دے رہی ہوں آپ تو جہ ہی نہیں دے رہے۔''

☆ ''میرا خیال ہے چھٹیاں گزارنے سنگاپور چلتے ہیں جب کہ آپ کا خیال نادرن ایریاز کا ہے' یوں کرتے ہیں' بچوں سے ووٹ مانگتے ہیں جسے زیادہ ووٹ ملے اس کی پسندیدہ جگہ چلے جائیں گے...... سمپل۔''

☆ میرے ہاتھ کے کھانوں میں کیا برائی ہوتی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں کہ آئندہ کھانا میں نہ بناؤں اس گھر میں تو جمہوریت نام کو نہیں۔''

☆ ''دیکھیں آپ مثبت اپوزیشن کا کردار ادا نہیں کر رہے ہر وقت تنقید' ہر وقت تنقید...... آپ اپنا امیج خراب کر رہے ہیں۔

☆ سنیں! میں امی کے گھر کا پانچ روزہ دورہ کرنے جا رہی ہوں' خدا حافظ۔''

فیروز احمد...... للیانی' سر گودھ

آئے گا۔ گھر والوں نے سوچا نہ لے کر جائیں تب بھی مصیبت اور اگر کہیں علاج کے لیے لے جائیں تب بھی مسئلہ تو بہتر ہے کہ ایک طرف لگ کر علاج کروالیا جائے' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

ایک روز جب مریم کچا گوشت من و سلویٰ سمجھ کر کھا رہی تھی اس کے شوہر نے اسے اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر عالم کی طرف چل نکلا۔ رستے میں ایک پرانا پل پڑتا تھا گو کہ اب اس پل کے نیچے سے پانی کا گزر نہیں تھا مگر پرانے وقتوں کی یادگار کے طور پر یہ ابھی تک اس جگہ ایستادہ تھا۔

گاڑی جب اس پل کے پاس پہنچی اچانک ہی خراب ہوگئی' ڈرائیور گاڑی کی خرابی ڈھونڈنے لگ گیا جبکہ وہ لوگ اتر کر پل کے کنارے چہل قدمی کرنے لگے پھر جیسے گاڑی خود خراب ہوئی تھی ویسے ہی خود سے ٹھیک بھی ہوگئی مگر جیسے ہی وہ عالم کے ہاں پہنچے جن پھر غائب' سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''آپ اسے گھر لے جائیں میں کسی روز خود وہاں آؤں گا' میں جانتا ہوں یہ جن بڑا خبیث ہے' پل کی دوسری طرف اتر جاتا ہے پھر جب گاڑی وہاں سے واپس گزرتی ہے تو مریم کے ساتھ ہولیتا ہے اس کا علاج اب آپ کے گھر میں ہی ہوگا۔'' عالم نے تجزیہ کرکے بتایا اور ساتھ ہی کچھ وظائف بھی دے دیئے۔

عالم کے پاس سے واپسی پر وہ لوگ جیسے ہی پرانے پل کے پاس پہنچے' گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور پھر ایسی قلابازی کھائی کہ جیسے کسی نے بچوں کے کھلونے کو پلٹا ہو' دو تین پلٹیاں کھانے کے بعد گاڑی خود بخود سیدھی ہوگئی۔

''میں نے منع کیا تھا نا کہ مریم کو کہیں مت لے کر جانا مگر تم لوگ سمجھتے نہیں' اب سمجھاؤں گا اچھی طرح سمجھاؤں گا۔'' اچانک مریم کے منہ سے کرخت آواز میں کوئی بولا۔

''میں اشوک ہوں' آسانی سے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اب تم سب کو مزہ چکھاؤں گا۔'' مریم کا شوہر ہمت کرکے بولا۔

''تم جو بھی ہو' مریم کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟''

''نہیں چھوڑ سکتا میں اس کا پیچھا کیونکہ اچھی لگتی ہے مجھے۔'' اس کے بعد مریم کو کچھ ہوش نہیں رہا' اگلے تین دن تک وہ بے ہوش رہی بس لحہ بھر کو اس کی آنکھیں وا ہوتیں اور پھر یوں لگتا جیسے آنکھوں کا ڈیلا باہر کو ابل پڑے گا۔

چوتھے دن مغرب کے وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی' بچے نے دروازہ کھولا تو سامنے عالم صاحب کھڑے تھے۔ انہیں عزت سے گھر میں لایا گیا اور ایک کھلے کمرے میں طلب کیا کچھ دیر بعد مریم کو چارپائی پر ڈال کر لایا گیا اور عالم کے باندھے ہوئے حصار میں اس کو لیٹا دیا گیا۔

غیر ضروری افراد کو کمرے سے باہر نکال کر انہوں نے پڑھائی شروع کی جیسے جیسے ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی' مریم کے منہ سے آہوں اور سسکیوں کی آوز بلند ہوتی جاتی۔ جیسے ہی قرآنی آیات کا ورد ختم ہوا' مریم اٹھ بیٹھی وجود تو اس کا اپنا تھا مگر اس میں جان' طاقت' سوچیں اور زبان کسی غیر کی تھیں اشوک حاضر ہو چکا تھا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو لڑکی کو؟'' عالم نے پوچھا۔

جن...... ''تنگ نہیں کرتا' اس سے پیار کرتا ہوں' اچھی لگتی ہے مجھے۔''

''تم جانتے ہو تم دونوں کا کوئی جوڑ نہیں۔ یہ شادی شدہ ہے۔ اس کے بچے ہیں' شوہر ہے۔'' عالم نے کہا۔

جن...... "مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔"
"تم دونوں کا مذہب الگ ہے۔" عالم نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔
جن...... "تو میں اس کی خاطر اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں۔" عالم مسکرائے۔
"اللہ کے خوف سے نہیں اس لڑکی کی خاطر...... خوب اچھا یہ بتاؤ تم اس پر عاشق کب ہوئے؟"
سب گھر والے دم سادھے بیٹھے تھے کیونکہ یہ تو وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اشوک مریم پر کب فریفتہ ہوا۔
"اس روز جب یہ سرخ جوڑا پہن کر بیری تلے بیٹھی تھی تب میں ایک بارات کے ساتھ جا رہا تھا رستے میں بیری کے سائے تلے مجھے اس کے لمبے بال نظر آئے بس وہی لمحہ تھا جب یہ مجھے اچھی لگی۔" اشوک جن نے بتایا لیکن اب اس کی آواز ایسی تھی کہ جیسے کسی نے اس کا گلہ دبا رکھا ہو۔
"اچھا تو تم اس سے الگ نہیں ہو گے؟"
"نہیں......"
"پھر کیا کرو گے؟"
"اسلام قبول کروں گا۔"
"میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔" عالم نے تسبیح پکڑتے ہوئے کہا۔
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمان بھی ہو جاؤں گا اور کبھی اسے تنگ بھی نہیں کروں گا۔" جن غرا کر بولا۔ "پھر مجھے کیوں جلاؤ گے؟"
"تمہاری ہٹ دھرمی مجھے تمہارے ساتھ سخت رویے پر مجبور کرتی ہے تم نسلاً ہندو ہو اور وہ بات سے بھی نہ مکرے یہ بات ماننے والی نہیں۔" پھر ان کے درمیان کافی دیر خاموشی قائم رہی بالآخر اس خاموشی کو اشوک جن نے ہی توڑا۔
"میں کلمہ پڑھنے کو تیار ہوں۔"

دوستی

☆ دوستی موسم نہیں جو اپنی مدت پوری کرے اور رخصت ہو جائے۔
☆ دوستی ساون نہیں ٹوٹ کے برسے چلا جائے
☆ دوستی آگ نہیں جو سلگے' بھڑکے اور بجھ جائے۔
☆ دوستی آفتاب نہیں جو چمکے اور ڈوب جائے۔
☆ دوستی پھول نہیں جو کھلے اور مرجھائے۔
☆ دوستی سانس کا ایک ایسا رشتہ ہے جو چلے تو سب کچھ جو ٹوٹے تو کچھ بھی نہیں۔

ندیم احمد...... ملتان

عالم مسکرایا اور بولا۔ "اعتبار کرنے کو دل نہیں مانگتا مگر میں کر رہا ہوں صرف اس لیے تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں کہ کل کو اللہ کے حضور میری اس بات پر پکڑ نہ ہو جائے کہ ایک جن ذات اسلام قبول کرنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اسے موقع نہ دیا مگر میری کچھ شرائط ہوں گی اگر تم انہیں مان لو تو میں تمہیں مسلمان کرنے کو تیار ہوں ورنہ آج تمہاری ہلاکت کا دن ہے۔"
کمرے کا ہر فرد عالم اور جن کی بات سن کر سکتے میں تھا جن کہ جو مریم کے وجود کا سہارا لیے گفتگو کر رہا تھا' اسے کسی صورت چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے وہ اسلام بھی قبول کرنے کو تیار تھے مگر سوال یہ تھا کہ کیا وہ مسلمان ہو جانے کے بعد اسے تنگ نہ کرے گا؟ لیکن یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اگر وہ مریم کو تنگ نہ کرنے کا وعدہ کر رہا تھا تو ممکن تھا وہ اپنے وعدے پر قائم تو رہتا مگر اس کے گھر والوں کو نقصان پہنچاتا بالآخر مریم کا شوہر تھا اس کے بچے اور ساس بھی تھی یا اس کے میکے والے' وہ ان میں سے کسی کو بھی

نقصان پہنچا سکتا تھا۔
"میں وعدہ کرتا ہوں اور شرائط بھی ماننے کو تیار ہوں۔" وہ بے ساختہ بولا۔
"پہلے شرائط تو سن لو اول تم مسلمان ہوجانے کے بعد مریم اور اس کے خاندان کے سبھی افراد کے لیے بے ضرر بن جاؤ گے۔ تمہاری ذات سے کسی کو بھی ذرہ برابر تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔" عالم نے پہلی شرط بتائی۔
"منظور ہے۔" اشوک نے تھوڑی پس و پیش کے کہا۔
"دوئم' تم کبھی ان کی تنہائی میں مخل نہیں ہوگے۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ غرا کر بلا۔
"سوئم اور سب سے اہم' صرف نام کا مسلمان نہیں ہونا بلکہ اسلام کے تمام ارکان پر عمل پیرا بھی ہونا ہے۔" عالم نے ایک اہم نکتہ رکھا۔ اشوک تھوڑا مضمحل ہوا لیکن ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
تمام شرائط ماننے کے بعد عالم نے اشوک جن کو کلمہ پڑھایا اور اسلام میں داخل کردیا اور اس کا اسلامی نام حسن رکھا۔
"اب تم اس مریم کا وجود چھوڑ دو' تم ایک مسلمان ہو اور ایک مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی' بہن کو ایذا دے۔" عالم نے اسے تنبیہ کی اور کوئی کلام پڑھ کر مریم پر پھونکا۔
لمحہ بھر بعد مریم کا بے جان وجود ایک طرف ڈھلک گیا جن اس کا وجود چھوڑ چکا تھا اور مریم نقاہت اور اذیت کی وجہ سے بے جان ہوئی پڑی تھی۔ عالم نے مسلسل ورد کرکے اس پر پھونکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں' وہ اب اسے تنگ نہیں کرے گا اور اگر اس نے وعدہ خلافی کی میرے پاس اس کا علاج ہے۔ اسے اٹھاؤ اور آرام کرنے دو' اس کے کھانے پینے کا خیال کرو اور نماز اور پاکیزگی کو اپنا شیوہ بنالو کیونکہ جو لوگ دین اور پاکیزگی سے دور ہوتے ہیں' شیاطین ان پر مسلط ہوجاتے ہیں' اپنے وجود اور دل و دماغ کو شیطان کا گھر مت بننے دو۔"

☆......☆......☆

کچھ عرصہ خیریت سے گزرا مریم بھی بیماری سے نکل کر روبہ صحت ہوگئی۔ گھر والے اس واقعے کو بھولے تو نہیں تھے البتہ یاد بھی نہیں کرتے تھے اور ممکن تھا کہ وہ بھول بھی جاتے اگر مریم پر دوبارہ دورے پڑنا شروع نہ ہوتے۔
مریم کا حال دیکھ کر سب پھر پریشان ہوئے اور اسے پھر عالم کے پاس لے جایا گیا۔ عالم مریم کی صحت پر پڑنے والے اثرات کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ سب اسی جن کی کارستانی ہے چنانچہ ایک عمل کرکے اس نے جن کو بولنے پر مجبور کردیا۔
"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے تنگ نہیں کرو گے' جانتے ہو نا جنات میں وعدہ خلافی کی سزا کیا ہوتی ہے؟" عالم نہایت غصے میں گویا ہوا' ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح مریم کو ماری جس سے حسن (اشوک) نامی جن بلبلا اٹھا۔
"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ اکڑ کر بولا۔ "اور اب مجھے اس سے کوئی الگ نہیں کرسکتا' اگر مجھے اس سے الگ کیا گیا تو میں مریم کی بھی جان لے لوں گا۔"
عالم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عمل شروع کردیا' جس سے اس جن کی جان پر بن گئی وہ مرغ بسمل کی مانند تڑپنے لگا۔ یہ تڑپ مریم کے وجود پر ہی طاری تھی کیونکہ جن اسی کے وجود میں ظاہر ہوا تھا۔ عمل آدھے میں ہی تھا کہ جن نے ہار مان لی۔

"میں خدا کے نام پر توبہ کرتا ہوں آئندہ اس کے پاس بھی نہیں بھٹکوں گا' میں وعدہ کرتا ہوں۔" عالم نے عمل روکا اور کچھ سوچ کر دوبارہ اسے چھوڑ دیا۔

مگر وہ جن بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا اس نے یہ وتیرہ بنالیا' عالم کے سامنے توبہ کرلیتا جبکہ گھر جاتے ساتھ ہی وہ سب کو اپنی شیطانی حرکتوں سے عاجز کرنے لگتا۔

جیسے ایک بار مریم کی ساس تار پر دھلے کپڑے پھیلا رہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا ان کا چھوٹا پوتا بھی تار پر کپڑوں کے ساتھ ہی ٹنگا ہوا ہے۔ اس کے شور شرابے سے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور بڑے جتنوں سے اسے نیچے اتارا۔

پھر ایک بار جب وہ تنور میں روٹیاں لگا کر پیچھے ہوئیں تو اچانک جلتے انگارے برف بن گئے اور تنور پر لگی روٹیاں نیچے گرنے لگیں۔ جب وہ انہیں سمیٹنے کو نیچے جھکیں تو یک لخت ایسے شعلے بھڑکے کہ ان کا ہاتھ اور بازو جھلس کر رہ گئے' وہ بڑی ڈھٹائی سے کہتا۔

"میں اشوک ہوں' ذات کا ہندو ہوں۔ کالی ماتا کا پجاری ہوں' بھلا اپنا مذہب' نام اور خدا بھی کوئی تبدیل کرتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں مریم کا عاشق ہوں اور اس کے لیے مجھے جتنا بچاؤ کرنا پڑا میں کروں گا۔"

گھر والے جب حد سے زیادہ عاجز آئے تو عالم کو اٹھا کر گھر لے آئے۔

"یہ اشوک جھوٹ بولتا ہے آپ سے' اس نے قطعاً اسلام قبول نہیں کیا اور نہ اس نے ہمیں اور مریم کو تنگ کرنے میں کوئی کسر باقی چھوڑی ہے۔ ہم ہاتھ جوڑتے ہیں' ہمیں اس کے عذاب سے بچائیں۔"

عالم نے صبر سے ان کی بات سنی' اشوک جن کو مسلسل ڈھیل دینے کی وجہ یہی تھی کہ شاید کبھی وہ سدھر جائے اور اپنی ناپاک حرکتوں سے باز آجائے مگر اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ کتے کی ٹیڑھی دُم کی مانند ٹیڑھا ہی تھا۔

عالم نے اس بار زبردست کلام پڑھا اور انتہائی مشکلات کے بعد مریم کو بچاتے ہوئے اشوک جن کا خاتمہ کرڈالا گو یقین تو کسی کو نہ آیا مگر کمرے میں پڑی راکھ کے ڈھیر اور تعفن نے اس کی تصدیق کردی کہ ان سب کی جان اس خبیث جن سے چھوٹ چکی ہے۔

اس دن کے بعد سے آج تک مریم کو پھر کبھی اشوک جن کے دورے نہیں پڑے اور نہ پھر وہ کبھی تیار ہوکر گھر سے باہر نکلی البتہ "ہما" واپس آگئی تھی لیکن وہ مریم کی دوست تھی اور گھر والوں کو اس سے خطرہ نہیں تھا۔ مریم آج اپنے گھر میں اپنے بچوں کے درمیان خوش ہے اور اسے بالکل یقین نہیں آتا کہ وہ 41 دن تک ایک ہندو جن کی معشوقہ رہی جس نے اسے حد درجہ اذیت بھی دی۔ اس لیے کہ وہ 41 دن تک اپنے ہوش وحواس میں تھی ہی نہیں۔

شاید کبھی آنے والے وقتوں میں مریم کے گھر والے تو اشوک کو بھول جائیں مگر میں کبھی اس منظر کو نہیں بھلا پاؤں گی جب گرم پراٹھا ڈالتے ہوئے اس کے منہ کا دہانہ کانوں تک کھل گیا تھا گویا کسی مگر مچھ کا منہ ہو۔" آنٹی نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے بات کا اختتام کیا اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔

آنٹی ہی کیا میں خود اتنے سال گزر جانے کے باوجود اکثر جب اس بچے کو سوچتی ہوں جس سے اشوک نے پراٹھا اٹھایا تھا تو اندر سے ڈر جاتی ہوں' ویسے میں اتنی ڈرپوک ہوں نہیں۔

حفظ ماتقدم

ریاض بٹ

بعض اوقات انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔
ایک منصوبہ ساز کا المیہ اس نے اپنے تئیں ایک اچھا کام کرنا چاہا تھا۔
نئے افق کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اوراق۔

انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے یعنی اس کی جو خواہش ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی۔ محبت کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں محبوب مل جائے لیکن بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں' جن کو ان کا محبوب مل جاتا ہے۔ پرانے محبت کرنے والوں نے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ فرہاد نے تو شیریں کو حاصل کرنے کے لیے دودھ کی نہر نکال دی تھی لیکن ہوا کیا تھا یہ سب کو معلوم ہے۔ بعض لوگ یہ بحث لے بیٹھتے ہیں کہ اگر ہیر کی شادی رانجھے سے' شیریں کی فرہاد سے' لیلیٰ کی مجنوں سے' سسی کی پنوں سے ہو جاتی تو...... اس تو سے آگے کچھ نہیں ہے۔

قارئین آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس دفعہ یہ تھانیدار کیا بحث لے کر بیٹھ گیا ہے' لیجیے جناب کہانی کی طرف آتا ہوں' کہانی پر نظر رکھیے گا یہ تمہید آپ کو بتادے گی کہ میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔

خیر ایک جوان کا قتل ہو گیا تھا اور ہم اس وقت جائے واردات پر موجود تھے۔ جوان زندگی میں خوب صورت اور ہینڈسم رہا ہوگا' جنس مخالف کے لیے اس کے چہرے میں بہت کشش ہوگی لیکن اس وقت موت کی زردی نے اس کے چہرے کی ساری کشش ختم کردی تھی۔ اسے ایک گولی سینے میں لگی تھی اور ایک سر میں۔

جائے واردات پر اس وقت کافی لوگ جمع تھے' جوان کا نام فرخ معلوم ہوا' یہ شادی شدہ تھا۔ اس کی شادی کو تقریباً چھ ماہ ہی ہوئے تھے' یہ جگہ ہمارے تھانے سے ذرا دور تھی اور یہاں ایک کوٹھی زیر تعمیر تھی۔ ایک جگہ اینٹوں اور ریت بجری کا ڈھیر سا نظر آ رہا تھا۔

لاش ریت پر پڑی تھی اور ریت خون سے تر تھی۔ میرے ساتھ سپاہی بشارت اور کانسٹیبل وزیر بھی تھا۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش کو میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا' کانسٹیبل وزیر کو ساتھ بھیج دیا اور خود سپاہی بشارت کے ساتھ مقتول کے گھر پہنچ گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت کوٹھی تھی جس کا چھوٹا سا پائیں باغ تھا۔ یہ سردیوں کے ابتدائی دن تھے۔ باغ میں بید کی بنی ہوئی خوب صورت اور دیدہ زیب کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے چند ابتدائی باتیں آپ کے گوش گزار کردوں جیسا کہ ذکر آ چکا ہے مقتول کا نام فرخ تھا' اس کی بیوی گوشی ایک امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ گوشی اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی' ماں وفات پا چکی تھی۔ یہ کوٹھی گوشی کے باپ سرفراز سے تعلق رکھتا تھا' یہ محبت کی شادی تھی۔ فرخ نے کہیں گوشی کو دیکھ لیا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ سرفراز خان اپنی بیٹی کی شادی اپنے بزنس مین دوست کے بیٹے محسن سے کرنا چاہتا تھا لیکن گوشی نے کہا کہ وہ محسن سے کسی صورت شادی نہیں کرے گی۔ مرجائے گی' زہر کھالے گی۔ باپ بیٹی کی محبت کی وجہ سے مجبور ہو گیا' ورنہ عام حالات میں وہ فرخ کو گھاس نہ ڈالتا۔ بہرحال فرخ کے

والدین بھی راضی نہیں تھے ان کے خیال میں بندے کو آسمان پر چمکتے چاند کو دور سے دیکھنا چاہیے، اسے اپنے آنگن میں لانے کی ضد نہیں کرنی چاہیے لیکن آسمان نے دیکھا کہ گوشی دلہن بن کر فرخ کی زندگی میں آ گئی اور دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ فرخ نے والدین کو بھلا دیا تھا، میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ اس نے اچھا کیا یا بُرا کیا؟ یہ بتا دیتا ہوں کہ یہ باتیں مجھے سرفراز خان سے معلوم ہوئیں جو اس وقت ہمارے ساتھ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔

''خان صاحب! یہ باتیں تو ہوگئیں۔'' میں نے سرفراز خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا فرخ (مقتول) کے ماں باپ کو اطلاع ہوگئی ہے؟''

''تھانیدار صاحب! وہ یہاں سے دس میل دور رہتے ہیں، میں نے بندہ بھیج دیا ہے۔'' خان صاحب نے آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پیتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب! مجھے آپ کے دکھ کا احساس ہے، جس گھر کو آپ نے بسانے کی کوشش کی تھی وہ اجڑ چکا ہے۔'' میں نے دانستہ نپے تلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں قاتل یا قاتلوں کو پکڑنا ہے اور اس سلسلے میں ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔

''تھانیدار صاحب! میں نے بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے، میں نے سوچا کہ زندگی گوشی نے گزارنی ہے مجھے اس کی راہ کی دیوار نہیں بننا چاہیے۔ آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟''

''آپ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔'' میں نے خان صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! میں نے سب باتیں آپ کو بتا دی ہیں، کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟'' خان صاب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شک تو ہم اپنے اوپر بھی کرتے ہیں کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں چل رہے۔ بہرحال میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ گوشی سے ملا دیں تو بہتر ہوگا، ہم اس سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں۔'' میں نے سپاہی بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، میرے اس کی طرف متوجہ ہونے پر اس کے کان بھی کھڑے ہوگئے۔

''سوری تھانیدار صاحب! جب سے گوشی نے فرخ کے قتل کا سنا ہے بے ہوش ہے۔ شہر کے دو بڑے ڈاکٹر، ایک لیڈی ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔''

''اوہ۔'' میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''خیر، ہم اب چلتے ہیں آپ لوگ کل آ کر لاش لے لیں۔ امید ہے کل بارہ بجے تک لاش پوسٹ مارٹم کے بعد واپس آ جائے گی۔'' پھر ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے آ گئے تھے۔

یہاں اے ایس آئی ابرار بڑے احسن طریقے سے

تھانے کا انتظام وانصرام سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں آ گیا تھا' یعنی جب میں جائے واردات سے واپس آیا تھا۔

''سر! کوئی سراغ وغیرہ ملا؟'' اس نے پہلا سوال یہ کیا۔

''بھئی......'' میں نے ہنکارا بھرا اور اپنی چھڑی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''سراغ تو کوئی نہیں ملا البتہ اتنا معلوم ہوا کہ مقتول نے سب عاشقوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔''

''کیا مطلب سر؟''

''مطلب یہ کہ......'' پھر میں نے اسے اب تک حاصل کی ہوئی معلومات سے آگاہ کر دیا۔

''بہرحال سر! مقتول کیسا تھا ہمیں اس سے کیا سروکار' ہم نے تو اس کے قاتل کو ڈھونڈنا ہے۔'' اے ایس آئی ابرار نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''بالکل' تم ایک حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''ایک حد تک سر؟'' اس کی سوالیہ نگاہوں میں سوال تھا جو میں نے پڑھ لیا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سامنے کی بات ہے۔ اس نے اپنی محبت کی خاطر والدین سے ناتہ توڑ لیا' یہ کوئی اچنبھے یا حیرانگی والی بات نہیں۔ یہ عورت ہی تھی جس نے آدم کو جنت سے نکلوا دیا لیکن......'' میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''ہمیں اس میں تو دلچسپی لینی پڑے گی کہ وہ کردار کا کیسا تھا؟ اس کا رویہ اور برتاؤ اپنے اردگرد لوگوں کے ساتھ کس قسم کا تھا اور کیا اس کی دشمنی بھی تھی کسی کے ساتھ؟''

''سر! یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔''

''اگر یہ بات صحیح ہے تو آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔'' میں نے گیند اس کی کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات کی گہرائی تک پہنچ گیا پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ میں نے کچھ باتیں ابھی آپ کو نہیں بتائیں' یہ باتیں پوسٹ مارٹم رپورٹ میں واضح ہوں گی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اگلے دن دوپہر کے بعد موصول ہوئی' ظاہر ہے ساتھ لاش بھی تھی۔ کافی دیر سے سرفراز خان اور اس کے چند رشتے دار آئے بیٹھے تھے' وہ لاش لے کر چلے گئے اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھنے لگا۔

رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کی درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا باعث سینے اور سر میں لگنے والی گولیاں ہی تھیں' ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ گولیاں قریب سے لگی تھیں۔ سینے میں لگنے والی گولی آر پار ہو گئی تھی جبکہ سر میں لگنے والی گولی اندر ہی رہ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ لکھی تھی پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کے مطابق یہ گولی ذرا ترچھی لگی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مقتول اتنی رات گئے وہاں قدرے ویران جگہ پر کیا کر رہا تھا اور اسے کن لوگوں نے اور کیوں قتل کیا تھا۔ اندھیری رات میں جو کچھ ہوا تھا جو کہانی پس پردہ تھی اسے سامنے لانا تھا۔

حیرانگی اس بات کی تھی کہ ابھی تک مقتول کے والدین نہیں آئے تھے' یہ بات میں نے سرفراز خان سے پوچھی تھی' اس نے کہا تھا کہ پیغام لے جانے والا بندہ بھی ابھی واپس نہیں آیا تھا' یہ بھی ایک سوچنے والی بات تھی۔

یہاں میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ سرفراز ذات کے خان تھے' پٹھان نہیں تھے' ان کی شہر میں کئی ملز تھیں۔

بندہ اگلے دن آیا' اس نے بتایا کہ فرخ کے والدین نہیں ملے وہ مکان بیچ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ کہاں چلے گئے ہیں؟ اس کے متعلق وہ دو دن پتا کرتا رہا تھا لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی' آخر تھک ہار کر واپس آ گیا تھا۔ آپ کے لیے یہ بات عجیب ہو گی کہ بیٹے کی بے رخی اور لاتعلقی کی وجہ سے والدین اپنا آبائی مکان ہی بیچ کر چلے گئے لیکن ہم پولیس والوں کے لیے یہ بات ذرا بھی عجیب یا حیرانگی والی نہیں تھی۔

میں نے بندے (رشید) سے چند سوال بھی کیے تھے لیجیے آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"رشید! تم نے اڑوس پڑوس سے تو ضرور پوچھا ہوگا کہ فرخ کے والدین کہاں چلے گئے۔"

"تھانیدار صاحب! پڑوسیوں نے بتایا تھا کہ فرخ کی والدہ بیمار رہنے لگی تھی' وہ کہتی تھی کہ اس مکان کے در و دیوار سے مجھے فرخ کی خوشبو آتی ہے' وہ یہاں بیٹھتا تھا' بچپن میں یہاں کھلونے رکھ کر کھیلتا تھا اس جگہ وہ بچپن میں گر گیا تھا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی تھی' وغیرہ وغیرہ۔ تھانیدار صاحب! وہ نیم پاگل ہوگئی تھی۔" رشید سرفراز خان کا گھریلو ملازم تھا' اس لیے میں نے اس سے پوچھا۔

"اچھا' رشید اب جو بات میں تم سے پوچھنے لگا ہوں' اس کا جواب سوچ سمجھ کر دینا۔"

"جی جناب! پوچھیں۔ اگر میرے علم میں اس بات کا جواب ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔" یہ اندازہ میں نے لگا لیا تھا کہ رشید کچھ پڑھا لکھا ہے اور بات سمجھداری سے کرتا ہے۔

"تمہارے مالک ایک امیر ترین انسان ہیں' ان کی بیٹی سے شادی کے خواہشمند بہت سے جوان ہوں گے۔ کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو ذرا زیادہ سنجیدہ ہو یا جس نے گوشی سے شادی کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! میں اپنے علم کے مطابق باتیں آپ کو بتادوں گا لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے۔" رشید نے التجا بھرے لہجے میں میری طرف دیکھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا لیکن جان بوجھ کر انجان بن گیا اور اس کے منہ سے سننے کی غرض سے بولا۔

"تم کھل کر بات کرو۔"

"جناب! ہم جس کا نمک کھاتے ہیں اس کے گن گاتے ہیں لیکن یہ بڑے لوگ ہماری وفاؤں کو نہیں سمجھتے۔ اپنے مطلب کے لیے ہمیں استعمال کرتے ہیں اگر ہم ان کے متعلق کوئی بات کسی مجبوری کے تحت بتادیں تو ہماری جان کو آجاتے ہیں۔ آپ سے میری صرف اتنی ہی گزارش ہے کہ یہ باتیں خان صاحب کو پتا نہیں چلنا چاہئیں۔"

"تم فکر ہی نہ کرو جو باتیں تم مجھے بتاؤ گے وہ میری ذات تک محدود رہیں گی۔" میں نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! محسن گوشی سے شادی کرنے میں سنجیدہ تھے یا نہیں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر گوشی انہیں نہ ملی تو وہ اس کا گھر بسنے نہیں دیں گے۔" یہ بہت بڑا انکشاف تھا' قارئین آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے محسن وہی تھا جس کے ساتھ سرفراز خان بھی اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا' درمیان میں فرق آجاتا ہے۔

رشید کو میں نے رخصت کردیا وہ مجھے ایک واضح اشارہ دے گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا' میں کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ اے ایس آئی ابرار آ گیا۔

"آؤ بھئی' کیا خبریں ہیں؟"

"سر! فرخ کے متعلق کچھ خبریں ہیں۔" اے ایس آئی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"سناؤ بھئی۔" میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

ہاری ہوئی بازی مات نہیں

یہ بات انسانی سمجھ سے بالاتر ہے کہ انسان جان ہار جائے اور مقصد جیت لے پھر بھی اکثر ہارنے والوں نے منزلوں کو جیتا ہم دیکھتے ہیں کہ میدان کربلا میں جنگ ہار گئی اور مقصد جیت لیا گیا امام (علیہ السلام) قربان ہوئے اور اسلام زندہ ہوا۔ جان دینا بڑے راز کی بات ہے لیکن اس میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ قربانی اور خودکشی میں بڑا فرق ہوتا ہے' خودکشی کرنے والے برباد ہوجاتے ہیں اور قربانی دینے والے شادائی منزل میں پہنچادیئے جاتے ہیں' قربانی سے حاصل ہونے والی منزلیں ایک عجب لطف رکھتی ہیں۔ منزلوں پر پہنچنے والے بہت بڑے انتظامات کے قائل نہیں ہوتے وہ ایک جذبے کے ماتحت سفر کرتے ہیں۔

ارشاد احمد...... میرپور خاص

"فرخ کے متعلق یہ پتا چلا ہے کہ فلم بینی کا بہت شوقین تھا' جو بھی نئی فلم لگتی تھی ضرور دیکھتا تھا۔"

قارئین یہاں میں آپ کو ایک بات بتادوں کہ یہ وہ دور تھا جب سینما آباد تھے اچھی' معیاری اور سبق آموز فلمیں بنتی تھیں۔

"خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس پر ہم مغز کھپائی کریں۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پھر میں نے اسے محسن کے متعلق بتایا تھا اور وہ بے ساختہ بولا۔

"یہ بات زیادہ پھیلی نہیں ہوگی اس لیے مجھ تک نہیں پہنچی۔"

"اب تو بات تم تک پہنچ ہی چکی ہے' اس لیے......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل فکر ہی نہ کریں' کل محسن آپ کے سامنے ہوگا۔"

"سیانے کیا کہتے ہیں...... کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔"

"ٹھیک ہے سر!" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دو گھنٹے بعد محسن ہمارے سامنے تھا' میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا وہ ایک لاابالی سا جوان لگتا تھا۔ عمر پچیس چھبیس سال کے اریب قریب ہوگی' بال وحید مراد اسٹائل کے تھے۔ رنگ نہ زیادہ گورا تھا اور نہ زیادہ سانولا تھا۔ مونچھیں صاف تھیں' گردن پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس وقت اے ایس آئی ابرار بھی میرے کمرے میں موجود تھا' ہم نے محسن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے پھر اس سکوت کو محسن کی آواز نے توڑا۔

"تھانیدار صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"تم کیا سمجھتے ہو' ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" اے ایس آئی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کچھ بتائیں گے تو پتا چلے گا نا۔" جزبز ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ فرخ مارا جاچکا ہے۔" میں نے مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"پتا تو چل گیا ہے لیکن......"

"تمہارا اس قتل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" وہ لیکن پر رک گیا تو میں نے اپنی دانست میں اس کا فقرہ پورا کردیا۔

"بالکل جناب! میں یہی کہنا چاہتا تھا۔"

"اب تم وہ کچھ کہہ ڈالو جو تم کہنا نہیں چاہتے۔" اے ایس آئی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب جناب! میں بالکل نہیں سمجھا؟"

"گوشی سے شادی کرنے کے تم خواہش مند نہیں تھے اور کیا تم نے یہ دھمکی نہیں دی تھی کہ اگر گوشی تمہیں نہیں ملی تو تم اس کا گھر بسنے نہیں دو گے۔" میں تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب! یہ تو جذباتی باتیں تھیں' میرا تو اصول یہ ہے کہ:

تُو تو ہرجائی ہے اب اپنا بھی شیوہ ہے یہی
تُو نہیں اور سہی' اور نہیں اور سہی"

"بہت خوب' تو تم شاعر بھی ہو۔" اے ایس آئی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خاک بھی نہیں' یہ شعر تو پتا نہیں کس کا ہے۔" اس نے پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"خیر اس بات کو چھوڑو' تم بائیس تاریخ کو رات نو بجے سے بارہ بجے تک کہاں تھے؟ اور تمہاری گردن پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟" میں نے اس کے گرد پھیلائے ہوئے جال کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جناب! یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا' البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ میرا فرخ کے قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"ابرار! اسے فی الحال حوالات میں بند کردو' اسے سوچنے کا موقع دو صبح اس سے بات ہوگی۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا پھر اے ایس آئی اسے لے کر چلا گیا تھا لیکن محسن کے ساتھ صبح بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ رات دو بجے میں اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا کہ مجھے جگا کر بتایا گیا کہ حوالاتی کی حالات خراب ہے وہ آپ سے

بات کرنا چاہتا ہے۔

یہ اطلاع سپاہی بشارت لے کر آیا تھا میں نے رات والے کپڑے اتار کر سادہ کپڑے پہنے اور تھانے میں پہنچ گیا۔ محسن کی حالت واقعی خراب تھی' عملے نے اسے صرف پانی ہی دیا تھا۔ یہ بھی ملزموں کو توڑنے کی ایک ترکیب ہوتی ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ محسن چرس پیتا تھا' اس کا نشہ اکھڑا ہوا تھا' میں نے سپاہی بشارت سے کہا۔

''میرے کمرے میں جاؤ' وہاں میری میز کی دراز میں جو چیزیں ہیں' وہ لے آؤ۔'' چند لمحوں بعد سپاہی چیزیں لے کر آ گیا۔

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ یہ چیزیں محسن کی جیب سے نکالی گئی تھیں' ملزم کو حوالات میں بھیجنے سے پہلے ہم یہ کارروائی کرتے تھے۔ ان چیزوں میں ایک پرس تھا' جس میں تین چار سو روپے تھے۔ ایک رومال' کنگھی' کے ٹو سگریٹ کی ڈبی' لائٹر اور چرس تھی۔

''تھانے دار صاحب مجھے صرف ایک چرس کا سگریٹ پینے دیں' میں سب کچھ بتادوں گا۔'' محسن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے سپاہی بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلے اسے کھانے کے لیے کچھ دو۔'' بہر حال دس منٹ بعد محسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو' سگریٹ تم پیتے ہو کے ٹو اور پرس میں صرف چند سو روپے۔''

''تھانیدار صاحب! مجھے نگینہ کے عشق نے برباد کر ڈالا ہے۔''

''یہ نگینہ کون ہے بھئی' بات تو گوشی کی تھی۔''

''دراصل گوشی کا اصل نام نگینہ ہے۔'' محسن نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نیند ہلکورے لینے لگی ہے بہر طور اس نے آگے جو کہانی سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں کیونکہ وہ بار بار اونگھنے لگتا اور اس کی کہانی تقریباً بیس منٹ میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔

میاں مٹھو

ایک صاحب نے طوطا پال رکھا تھا' لاکھ جتن کرنے کے باوجود بھی وہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ اسے اس کے دوست نے کہا ''اسے مرچیں کھلاؤ''۔

ان صاحب نے طوطے کو مرچیں کھلانی شروع کردی مگر طوطا پھر بھی نہیں بولا۔ عید کے دن ان صاحب نے طوطے سے پوچھا۔ ''میاں مٹھو! چوری کھانی ہے۔''

میاں مٹھو نے جل کر کہا۔ ''کم بخت مارے! مرچیں ختم ہوگئی ہیں کیا؟ تمہیں چوری نصیب ہوتی ہے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو۔''

پرویز اختر ...... بہاولنگر

بقول اس کے اسے نگینہ عرف گوشی سے عشق ہوگیا تھا اور جب گوشی اسے نہیں ملی تو وہ چرس پینے لگ گیا اور ساتھ جوا بھی کھیلنے لگ گیا۔ اسے کسی اور سگریٹ میں مزہ نہیں آتا تھا جب کے ٹو کے سگریٹ کو ڈبل کر کے پیتا تھا تو کسی اور جہان میں پہنچ جاتا تھا۔ جس رات فرخ کا قتل ہوا تھا وہ شہر سے دو کلومیٹر دور استاد برکت کے ڈیرے پر جوا کھیل رہا تھا۔ وہ صبح گھر آیا تھا اس نے یہ بھی بتایا کہ اس رات وہ جیتا تھا تقریباً آٹھ سو روپے لیکن کل ہار گیا تھا۔ اس لیے اس کی جیب میں صرف تین سو ساٹھ روپے تھے۔ آخر میں اس نے کہا تھا۔

''تھانیدار صاحب! میں جیل سے بہت ڈرتا ہوں اس لیے چاہتے ہوئے بھی فرخ کا پتہ صاف نہ کرسکا۔'' میں نے اسے دوبارہ حوالات میں بند کردیا اور آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

صبح میں ذرا دیر سے تھانے پہنچا' کچھ دیر کے بعد میں نے سپاہی انور کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''کیوں بھئی' ابرار آیا کہ نہیں۔'' میں نے اپنے سامنے میز پر بکھرے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"سر! ابرار صاحب آ گئے ہیں۔"

"بھیج دو۔" چند لمحوں کے بعد ابرار میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے محسن کی رات والی کہانی سنائی تو چند لمحوں کے لیے وہ سوچ کی وادیوں میں کھو گیا پھر چونکتے ہوئے بولا۔

"سر! گردن پر بندھی ہوئی پٹی کے متعلق وہ کیا کہتا ہے؟"

"اس نے بتایا کہ جوئے کے اڈے پر جھگڑا ہو گیا تھا' مخالف کے بڑے بڑے ناخنوں سے اس کی گردن پر خراشیں آ گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے' میں برکت کے اڈے پر جا کر تصدیق کرتا ہوں۔" اے ایس آئی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم برکت کو پکڑ کر یہاں ہی لے آؤ' اسے چند دن حوالات کی سیر کرواتے ہیں آخر وہ غیر قانونی طور پر جوئے کا اڈہ چلا رہا ہے۔" مختصراً یہ کہ ہم نے برکت کو لا کر حوالات میں بند کر دیا لیکن محسن کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کروالی تھی' اس نے ایک دلچسپ بات کی تھی۔

"تھانیدار صاحب! یہ یعنی محسن ایک بزدل شخص ہے اسے آپ چھوڑ دیں' جب جھورے کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا تھا تو یہ بہت بودا ثابت ہوا تھا۔ اگر ہم بیچ بچاؤ نہ کرواتے تو جھورا اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے اس کی گردن ادھیڑ کر رکھ دیتا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"برکت استاد! تم تو بڑے دل گردے والے ہو جبھی تو میرے تھانے کی حدود میں جوئے کا اڈہ چلا رہے ہو۔" اس نے سر جھکا لیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ اندر سے پکا استاد ہے' بہر حال یہ ایک الگ کہانی ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں آپ کو قتل کی کہانی سنا رہا ہوں' آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ اتنا کچھ ہو گیا تھا لیکن محسن کا باپ نہیں آیا تھا' اس کے کان پر جوں نہیں رینگی تھی۔

دراصل وہ شہر میں نہیں تھا جونہی واپس آیا اور اسے پتا چلا کہ اس کا شہزادہ حوالات کی ہوا کھا رہا ہے یعنی اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے' سیدھا میرے پاس آ گیا۔

میں نے اسے عزت سے بٹھایا۔ وہ ایک معقول اور شریف بندہ لگتا تھا لیکن بیٹے کے کرتوتوں نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے میری طرف شرمندہ شرمندہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار! اس ناخلف نے کون سا جرم کر دیا ہے جو آپ نے اسے حوالات میں بند کر دیا ہے۔" میں نے اسے سب کچھ بتایا تو وہ بولا۔

"تھانیدار صاحب! میں جس کرب سے گزر رہا ہوں اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"میں آپ کے کرب کا اندازہ لگا سکتا ہوں لیکن ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ جرم ایک دلدل کی مانند ہے جس میں قدم رکھتے ہی انسان اس کے اندر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ آپ اپنے بیٹے پر کڑی نظر رکھیں' میں نہیں چاہتا کہ آئندہ وہ اپنے چہرے پر ایسے جرم کی سیاہی مل کر آئے کہ......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا پھر میں نے محسن کو اس کے باپ کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔

میرا مسئلہ اپنی جگہ پر موجود تھا مجھے فرخ کے قاتل کی تلاش تھی۔ گوشی کے متعلق مجھے پتا چلا تھا کہ ابھی تک ہوش وحواس میں نہیں آئی تھی' بس ٹکر ٹکر ہر ایک کو دیکھتی تھی۔ اس نے محبت کی شادی کی تھی ظاہر ہے فرخ اس کا محبوب تھا اس کے قتل کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہو جاتا' کم تھا۔

لیکن میرے واسطے یہ بات کوئی اچھا شگون نہیں تھی' میں نے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا شاید وہ کوئی ایسی بات بتا دیتی جو میرے لیے مشعل راہ بن جاتی اور میں فرخ کے قاتل یا قاتلوں تک پہنچ جاتا۔

ابھی تک فرخ کا کوئی ایسا راز دار دوست بھی سامنے نہیں آیا تھا جو مجھے اندر کی بات بتاتا۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ منفرد کیس تھا' سرفراز خان نے بتایا تھا کہ گوشی نے گھر میں کوئی ملازم یا ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ وہ گھر کے سارے کام خود کرتی تھی۔

بات یہ سمجھ آ رہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے میں مگن

تھے انہیں ادھر اُدھر دیکھنے کی فرصت یا ضرورت ہی نہیں تھی لیکن مجھے کچھ باتوں کی ضرورت تھی میں نے سوچا مجھے گوشی کے پڑوسیوں کو ٹٹولنا چاہیے۔
یہ اس شام کی بات ہے کہ میں اور کانسٹیبل وزیر گوشی کے پڑوس میں موجود تھے۔ یہ ایک بڑی کوٹھی تھی اگر میں اس کا محل وقوع لکھنے بیٹھ جاؤں تو کئی صفحات سیاہ ہو جائیں۔ بہر حال اس کوٹھی کے مالک کا نام اسلم معلوم ہوا جب میں نے اپنا اور کانسٹیبل کا تعارف کروایا تو وہ ہماری راہ میں بچھ سا گیا تھا اور ہمیں عزت سے اپنی بیٹھک میں لے گیا تھا اور ہمارے لیے چائے پانی کا بندوبست کر دیا تھا جیسا کہ میں اپنی کئی تفتیشی کہانیوں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ دوران تفتیش میں دعوتیں اڑانے سے اجتناب کرتا تھا۔
مگر کچھ لوگوں کا خلوص دیکھ کر میں مجبور ہو جاتا ہوں بہر حال اصل بات کی طرف آتا ہوں۔
''اسلم صاحب! آپ کچھ کچھ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم نے کیوں آپ کو تکلیف دی ہے۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
''تھانیدار صاحب! یہ اندازہ تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب آپ نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ ہمارے پڑوسی کا قتل ہو گیا ہے ظاہر ہے آپ اسی لیے تفتیش کر رہے ہیں کہ اس کے قتل کا معمہ حل کریں۔'' بندہ سمجھ دار تھا بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ کسی بینک میں منیجر تھا۔
''بالکل، اسلم صاحب! میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، چند لمحے توقف کیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ کا پڑوسی کیسا آدمی تھا؟''
''جناب! میں بھی اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں لیکن ساتھ ساتھ دوسرے معاملات بھی دیکھتا ہوں، میل ملاقات بھی رکھی ہوئی ہے لیکن یہ دونوں میاں بیوی عجیب تھے۔ بس اپنی دنیا میں مگن تھے، پڑوسیوں سے بھی لاتعلق تھے۔ بالکل الگ تھلگ اور اکیلے رہتے تھے۔''
''کیا فرخ کوئی کام بھی کرتا تھا؟'' میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔
''میرے خیال میں نہیں، وہ تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کر رہا تھا۔ اس کا سسر اتنا امیر آدمی ہے کہ اس جیسے بیسیوں کو پال سکتا ہے۔'' منیجر صاحب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
''اچھا! اگر آپ اپنی بیوی سے ملوا دیں تو مہربانی ہوگی، میں ان سے بھی چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔'' چند لمحوں بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر آ گیا۔
بیوی کا نام شبنم معلوم ہوا وہ ایک فربہ اندام درمیانے قد کی خوب صورت خاتون تھیں۔ خاتون نے بھی تقریباً وہی باتیں بتائیں جو اس کے خاوند نے بتائی تھیں لیکن اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جس نے میرا دماغ روشن کر دیا۔
ہم نے دونوں میاں بیوی کا شکریہ ادا کیا اور واپس تھانے میں آ گئے۔ تھانے میں ایک نئی اطلاع میری منتظر تھی، پتا یہ چلا کہ گوشی کو شہر کے ایک بڑے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ وہ نیم پاگل ہو چکی تھی، سرفراز خان پیسہ پانی کی طرح بہا رہے تھے لیکن بات وہی تھی کہ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر مریض عشق کا معاملہ ہو تو......؟ اور یہاں تو

اچھی باتیں

☆ جب اعتماد کا کومل پرندہ مٹھیوں سے پھسل کر بے سمت اڑتا ہے تو اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر آنسو تو بہتے ہیں وگرنہ ان آنسوؤں کے اندر ہی اندر گرنے سے کسی ایک کا زیاں ہوتا ہے۔
☆ مجھے پھول اور ماں میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا ماں کی اصل خوب صورتی اس کی محبت ہے اور میری ماں دنیا کی خوب صورت ترین ماں ہے۔
ربیعہ اساور بٹ...... **فیصل آباد**

سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ اس کا محبوب قتل ہوگیا تھا۔

سرفراز خان مصروف تھا میں اس سے ملنا چاہتا تھا جو بات مجھے اسلم (منیجر) کی بیوی نے بتائی تھی اس کے متعلق بات کرنی تھی لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ میں فی الفور خان صاحب کو تھانے بلالیتا یا ان کے گھر میں ان سے ملاقات کرسکتا۔

خیر یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے کہ جس کام کو جس وقت اور جیسے ہونا ہوتا ہے ایسے ہی ہوتا ہے۔ انسان اس معاملے میں بے بس ولاچار ہے۔

دو دن بعد یہ اطلاع آئی کہ گوشی کا انتقال ہوگیا ہے اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی تھی۔ یہ باب تو ختم ہوگیا تھا لیکن میری تفتیش نامکمل تھی' فرخ کا قاتل کہاں تھا؟

پانچویں دن میں نے تہیہ کیا کہ سرفراز خان کو تھانے بلوا لیتے ہیں۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی وہ خود ہی تھانے میں آ گیا اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی ان حالات میں ایک باپ کی ہوسکتی ہے۔ وہ تو جیسے مرسا گیا تھا' اس نے مجھ سے التجا کی کہ کمرے کا دروازہ بند کروادیں۔ میں تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں تھی اس لیے میں نے اس کی خواہش پوری کردی۔

قارئین آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جیسے سرفراز خان میرے سامنے بیٹھا ہو اور بول رہا ہو۔

''تھانیدار صاحب! اب تو کچھ بھی باقی نہیں بچا' میری آسوں کے شیش محل وقت کی ایک ٹھوکر سے پاش پاش ہوگئے ہیں اور اس کی کرچیوں میں میرے وجود کو لہولہان کردیا ہے۔'' میں نے دیکھا وہ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا' میرے کان اس کی باتوں پہ تھے۔

''تھانیدار صاحب! میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم ہوں مگر جب آپ پوری کہانی سنیں گے تو آپ کا تجربہ اس بات کی گواہی دے گا میری نیت میں فتور نہیں تھا میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا جو ہوگیا تھا۔ میں نے تو حفظ ماتقدم کے طور پر ایک اسکیم بنائی تھی۔'' پھر اس نے جو کہانی سنائی۔ وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ فرخ اور گوشی کی شادی محبت کی شادی تھی۔ سرفراز خان نے بھی محبت کی شادی کی تھی اس کی بیوی فریدہ اس سے بہت محبت کرتی تھی دو سال ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر فریدہ نے نگینہ یعنی گوشی کو جنم دیا لیکن زچگی کے دوران کوئی ایسی پیچیدگی ہوگئی جس نے فریدہ کی جان لے لی۔ سرفراز خان کی عمر اس وقت صرف تیس سال تھی اس نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنی ساری محبت اور توجہ گوشی کے لیے وقف کردی۔ اس نے کس طرح گوشی کی پرورش کی یہ ایک الگ داستان ہے اصل قباحت اس وقت آئی جب گوشی نے یہ دھما کہ کیا کہ وہ فرخ سے محبت کرتی ہے اور اسی سے شادی کرے گی۔

سرفراز خان نے اندازہ لگالیا کہ جوانی بغاوت پر آمادہ ہے وہ خود بھی محبت کا مارا ہوا تھا لیکن اس نے پہلے بیٹی کو سمجھایا کہ فرخ ہوسکتا ہے اس کے ساتھ مخلص نہ ہو اس کی دولت پر اس کی نظر ہو لیکن یہاں تو پانی سر سے گزر چکا تھا بہرحال فرخ کے ساتھ چند باتیں کرنے کے بعد سرفراز خان نے اندازہ لگالیا کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے اور فرخ سنجیدہ ہے۔ بہرحال شادی ہوگئی۔ ابھی شادی کو تقریباً چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ گوشی ایک دن حیران و پریشان باپ کے پاس آئی اور بولی۔

''ابو! فرخ عجیب عجیب باتیں کررہا ہے' کہتا ہے میں کب تک تمہارے باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہوں گا۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں' میں برطانیہ جاؤں گا وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے تم مجھے اپنے ابو سے دو لاکھ روپیہ لادو میں پائی پائی ادا کردوں گا۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''ابو! میں نے کہا تم باہر جانے کا خیال دل سے نکال دو' میں ابو سے کہتی ہوں وہ تمہیں اپنی کسی مل میں منیجر کی جاب دے دیں لیکن ابو! وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے میں باہر ہی جاؤں گا' تمہارے ابو کے میرے اوپر پہلے ہی بہت

احسان ہیں' میں مزید کسی احسان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ابو میں مر جاؤں گی' میں اس کی جدائی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔" پھر گوشی باپ کے قدموں میں گر گئی تھی اور بلک بلک کر رونے لگ گئی تھی۔ باپ نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا تھا اور اسے تسلی دی تھی کہ وہ فرخ کو سمجھائے گا۔ وہ فرخ کو دو دن بعد بھیج دے' دو دن بعد فرخ اس کے سامنے تھا اس دوران سرفراز خان نے اپنے قریبی دوست سے مشورہ کیا تھا اور اس کا مشورہ اسے اچھا لگا تھا۔ اس مشورے پر اس وقت عمل کرنا تھا جب فرخ اپنی ضد سے باز نہ آتا۔

فرخ نے سرفراز خان سے ملاقات پر واضح کر دیا کہ وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہوگا۔ سرفراز خان ایک اسکیم بنا چکا تھا اس نے اپنے دو خاص بندوں کو ساری اسکیم سمجھا دی تھی ان میں ایک کے پاس ریوالور بھی تھا۔

اسکیم یہ تھی کہ سرفراز خان فرخ کو دو لاکھ روپیہ دے گا اور کسی بہانے اسے ذرا دیر تک گھر میں روکے رکھے گا پھر اس کو رخصت کرے گا' یہ دونوں بندے اس کا تعاقب کریں گے اور کسی مناسب جگہ پر اس کو گھیر لیں گے اور ریوالور دکھا کر کہیں گے جو کچھ تمہارے پاس ہے نکال دو ورنہ......

باقی سب کچھ تو اسی طرح ہوا جو سرفراز خان کی اسکیم کا حصہ تھا لیکن آخر میں وہ ہو گیا جس کی توقع شاید کسی کو بھی نہیں تھی۔ فرخ نے بھرپور مزاحمت شروع کر دی' بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔

اسی کشمکش میں ریوالور نے دو گولیاں اُگل دیں' ایک فرخ کے سینے کے آر پار ہو گئی اور دوسری جو ذرا ترچھی لگی وہ سر میں رہ گئی۔

دونوں بندوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ کوئی راہزن' ڈاکو یا قاتل تو تھے نہیں' پچاس ہزار روپے کے لالچ کے مارے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرخ سے دو لاکھ روپے لوٹ کر پچاس ہزار روپے رکھنے تھے اور باقی ڈیڑھ لاکھ روپے سرفراز خان کو واپس کرنے تھے لیکن جب یہ سب کچھ ہو گیا تو انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ گرا ہوا فرخ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے' دوڑے دوڑے سرفراز خان کے پاس گئے اور سارا ماجرہ اسے جا سنایا' اتنا انہوں نے ضرور کیا تھا کہ دو لاکھ روپے فرخ کی جیب سے نکال لیے تھے۔

انہوں نے دو لاکھ روپے سرفراز خان کو دیئے اور ہاتھ جوڑ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے "خان صاحب' ہمیں بچالیں۔"

سرفراز خان خود دم بخود رہ گیا تھا' یہ سب کچھ سن کر لیکن اس نے اپنے حواس کو قائم رکھا اور انہیں ایک گاؤں میں اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیا۔

یہاں تک کہانی سنا کر خان صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر گویا ہوئے۔

"اب آپ قانون کے مطابق جو کارروائی کرنا چاہیں' کریں۔ میں نے تو حفظ ماتقدم کے طور پر یہ اسکیم بنائی تھی تاکہ میری بیٹی کو اکیلا اور اذیت میں مبتلا کر کے فرخ باہر نہ جا سکے لیکن تھانیدار صاحب! کچھ بھی باقی نہ بچا۔" پھر جو سرفراز خان رویا ہے تو مجھ سے سنبھالنا مشکل ہو گیا اور مجھے دروازہ کھول کر سپاہی اور دوسرے عملے کو بلوانا پڑا تھا پھر......

میں نے دونوں بندوں کو بھی گرفتار کرنے کے لیے چار پولیس اہلکار بھیج دیئے تھے۔ سرفراز خان مجھے ان کا ٹھکانہ بتا چکا تھا۔

میں نے تینوں کا چالان تیار کر کے حوالہ' عدالت کر دیا تھا۔

آخری بات جو آپ کے ذہن میں پھانس بن کر چبھ رہی ہے اس کو بھی نکال دیتا ہوں۔ منیجر اسلم کی بیوی نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ تقریباً پندرہ بیس دن سے ان کے گھر سے فرخ کی اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں کہ وہ ہر صورت میں باہر جائے گا۔

قسط نمبر32

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

میں جے لکشمن کا چہرہ دیکھ رہا تھا، جہاں پر حیرت جم کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک تشنج کی سی کیفیت میں رہا اور پھر اس نے خود کو یوں ڈھیلا چھوڑ دیا، جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ سرمد کی نگاہیں بھی اسی کے چہرے پر تھیں۔ جسپال سنگھ اور اکبر بھی اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے لکشمن۔! تم ٹھیک تو ہو؟''

''بہت بڑی بھول ہو گئی۔'' اس نے گہرا سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر دیے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہوا کیا ہے، کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے؟'' میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

''میرا ڈیپارٹمنٹ دھوکا کھا گیا۔ وہ بہت چالاک نکلی، جس نے ہمیں اس راہ پر ڈال دیا۔''

''مطلب، تم نے جو کچھ کیا......'' میں نے کہنا چاہا لیکن وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولا۔

''وہ سب غلط فہمی میں کیا۔'' یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں نے جو کیا، اپنے ڈیپارٹمنٹ کے حکم پر کیا۔ اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں، میں ہر طرح کی سزا کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، غلط فہمی میں کیا۔ شکر کرو، اس میں کسی کی جان نہیں گئی۔ ورنہ مجھے تمہارے ملک بھی جانا پڑتا تو میں تم سے بدلہ لینے وہاں ضرور جاتا، خیر۔! یہ سب کیا تھا، کیسے ہوا؟''

''مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے حکم ملا کہ نور نگر میں جمال رہتا ہے، اس کے سارے نیٹ ورک کا پتہ کروں۔ یہ ویریتا نامی تنظیم وہیں کی پیداوار ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس تنظیم کی بنیاد میں کون ہے، کوئی دہشت گرد تنظیم یا پھر کوئی ریاست کی بنائی ہوئی فورس۔ میں نے تصدیق کرنے کے بعد اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بتا دینا تھا۔ اس کے بعد جو بھی وہ کرتے۔''

''اب تمہارا ڈیپارٹمنٹ کیا کہتا ہے؟''

''انہوں نے کیا کہنا، اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔ میں نے تم لوگوں کو نکال لیا۔ اب میں نے رابطہ کیا تو وہاں صورت حال بدلی ہوئی تھی۔ ویریتا تنظیم کے پیچھے چند ہندو لیڈروں کا نام ہے اور یہ تنظیم چنڈی گڑھ کے ہندو نوجوان لڑکے لڑکیوں نے بنائی ہوئی ہے۔ اب تک انہوں نے دو لوگوں کو پکڑ بھی لیا ہے۔ انہوں نے ویریتا کے نام پر رقم لوٹی تھی۔ ان سے مزید تفتیش جاری ہے۔'' جے لکشمن نے یوں بتایا جیسے وہ اپنے کسی کولیگ سے بات کر رہا ہو۔ میں کچھ لمحے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ بلاشبہ یہ اروند سنگھ اور رونیت کور کا کیا ہوا تھا کہ یہ سب بدل کر رکھ دیا لیکن یہ کیسے کیا، اس کا جواب تو وہی دونوں دے سکتے تھے۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا، سرمد نے پوچھا۔

''مجھے یہ بتاؤ، یہ تم بجوات اور ہیڈ مرالہ ہی پر جا کر کیوں بیٹھے، تم ادھر کہیں قریب بھی بیٹھ سکتے تھے، اس کی کیا وجہ ہے؟''

''سچ بتاؤں، وہاں ہمارا پہلے ہی نیٹ ورک تھا، وہ حویلی میرے پرکھوں کی تھی جہاں میں رہا۔ میں نے کام تو سارا فون سے لینا تھا، لے لیا، یہ حقیقت ہے کہ تم کھلے ہو میرے ہاتھوں۔'' اس نے سرمد کی طرف دیکھ کر بے باکی سے کہا۔

''راشد کا تمہیں کیسے پتہ؟'' جسپال نے ایک دم سے سوال کیا تو وہ گڑبڑا گیا۔

''اصل میں وہ ہمارا پلانٹ کیا ہوا بندہ تھا، بہت

عرصے بعد وہ اس کام سے نکل جانا چاہتا تھا، لیکن نہیں نکل سکا۔ اسی سے تو پتہ چلا کہ تم لوگ کیسے کام کرتے ہو۔ وہ عالمی نیٹ کی کہانی اگرچہ درست تھی، لیکن وہ محدود تھا، صرف پاکستان اور لندن کی حد تک۔ اس نے ہمارے لیے بہت کام کیا۔" وہ سکون سے بولا تو میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"معافی، مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ تمہارا جو نقصان ہوا، وہ تو سود سمیت دوں گا، مزید جو بھی ہو سکا، وہ بھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں تمہیں معاف کر بھی دوں لیکن۔! تمہارا ڈیپارٹمنٹ، تمہیں قبول نہیں کرے گا۔ پاکستان سے بہ حفاظت واپس چلے جانے والا ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تجھے مرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں بھگوان کے لیے نہیں، میرے ساتھ وہاں جا کر جو مرضی ہو، وہ میں بھگت لوں گا۔" اس نے اعتماد دکھاتے ہوتے ہوئے تیزی سے کہا تو میں نے سکون سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو ابھی کروا اپنے لوگوں سے بات، اگر وہ لوگ تمہیں واپس لینا چاہتے ہیں تو اپنے ہائی کمشنر کو میرے پاس بھیجیں، میں اس سے بات کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں کر لیتا ہوں بات۔" اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر سے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ سرمد اس کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اکبر کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جسپال سنگھ کے ساتھ میں وہاں سے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے بیٹھتے ہی اپنا سیل فون نکالا اور اروند کو فون ملایا۔ اس نے فوراً کال وصول کر لی تو میں نے اسے جے لکشمن کی ساری روداد بتا کر پوچھا۔

"یہ سب کیسے کیا؟"

"یہ بات یوں ہے کہ ہر کمپیوٹر جاننے والا اور کمپیوٹر پر کام کرنے والا، اپنا ایک بیک اپ رکھتا ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ یہ کیا ہے۔ چاہے جو کوئی کام بھی ہو۔ جب میں نے یہ تنظیم بنائی تھی تو ایک بیک اپ رکھا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ جب کبھی یہ تنظیم پکڑی گئی تو بچاؤ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری یہ احتیاط کام آ گئی۔ ہندو نوجوانوں کی ایک شدت پسند تنظیم ہے۔ یہ صرف چنڈی گڑھ میں نہیں دکھائی گئی۔ پنجاب کے ہر بڑے شہر میں، ہندوؤں کی اس شدت پسند تنظیم کی شاخیں ہیں۔ بس اسے استعمال کیا۔ جب تنظیم متعارف کرائی تھی، تب سے میں ان کی بھی مدد کرتا رہا، آج وہ کام آ گئے۔" اس نے تفصیل سے بتایا تو میرے ذہن میں ایک نیا خیال رینگ گیا۔

"بلاشبہ تم نے ذہانت سے یہ معاملہ سنبھال لیا لیکن میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ پوری طرح یقین ہے کہ ہم انہیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟"

"بالکل۔!" اس نے تیزی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے جس طرح تم نے بیک اپ رکھا ہوا تھا، اسی طرح ان کے بیک اپ میں کوئی دوسری ہی بات ہو اور یہ سب کر کے وہ ہمیں دھوکا دے رہے ہوں۔ اس دوران وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوشش کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم کرو کوشش، میں بعد میں فون کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس وقت میرے ذہن میں کئی خیال کلبلا رہے تھے۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا جو سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے جے لکشمن کے اعتماد پر حیرت نہیں تھی۔

بہادر اور جان وار دینے والے ہر قوم میں ہوتے ہیں اور جب موت کا یقین ہو جائے تو صرف بہادر لوگ ہی اس کا سامنا کر پاتے ہیں۔ یہ اس کا حوصلہ ہی تھا کہ وہ اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں کارروائیاں کر رہا تھا۔ بزدل لوگ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ساری لڑائی کمپیوٹر اسکرین پر لڑی جا رہی تھی۔ حقیقت کیا تھی، یہی سمجھنا تھا۔

یہ بات ماننے والی ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بھارت آگے ہے۔ یہ دور ایسا ہے کہ جہاں آلات کو بھی اسلحہ کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمیشہ دشمن نت نئے ہتھیاروں کے ساتھ آیا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے انہی ہتھیاروں سے دفاع کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا، ایسا دور آنے والا ہے، جب گولی نہیں چلائی جائے گی، تو میں ایک دوسرے کو مفتوح کرنے کے لیے کئی دوسرے ہتھیار استعمال کریں گی۔ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمیں یہ سوچنا ہو گا۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سرمد کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال ریسیو کی تو اس نے

''یہ جے لکشمن اب ناکارہ ہے۔ اسے جواب مل گیا ہے کہ بھارت ماتا پر قربان ہو جاؤ۔ ہائی کمشنر نہیں ملنے آئے گا۔''

''اوکے۔ اب اس کا بندوبست کرتے ہیں، اب اسے کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹا دو۔'' میں نے کہا اور فون بند کر کے اٹھ گیا۔ تب جسپال نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیا کرو گے اس کا؟''

''ابھی کچھ دیر میں دیکھو، کیا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے جواب دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ ہال میں اب اسے ایک جانب بٹھایا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس کی آنکھوں میں ایسی یاسیت بھری ہوئی تھی، جو موت کا حکم سننے کے بعد انسان پر مسلط ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ تم بہادر ہو حوصلہ مند تو جوان ہو، مگر تیرے لوگوں نے تیری قدر نہیں کی۔ اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔''

''میں مانتا ہوں۔'' اس نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ ایسے میں کرنل وقار عظیم ہال کے دروازے میں داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر ہماری جانب بڑھ آئے۔ انہوں نے آتے ہی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پھر جے لکشمن کی طرف دیکھ کر بولے

''اچھا تو یہ تھا۔'' انہوں نے کہا اور اشارہ کیا۔ اگلے چند لمحوں میں چند جوان آگے بڑھے اور اسے اٹھا کر باہر کی جانب چلے گئے۔ جیسے ہی وہ ہال سے باہر گیا، کرنل نے میری جانب دیکھا اور کہا۔

''جمال۔! آج ڈنر ہم اکٹھے کریں گے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے دوبارہ مصافحہ کیا اور پلٹ گیا۔

میں، سرمد، جسپال سنگھ اور جنید وقت پر کرنل وقار عظیم کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے ہمارا استقبال پورچ ہی میں کیا اور اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گیا، جہاں پہلے ہی سے تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب آپس میں ملے، اور تعارف کا مرحلہ بھی ہو گیا تو پتہ چلا کہ وہ کرنل کے رینک سے بھی اوپر کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جو اپنے ہیڈ کا نمبر ٹو تھا۔ تعارف کے ساتھ ہی احساس ہو گیا کہ یہ ملاقات کوئی معمولی ملاقات نہیں ہے۔ بات کا آغاز کرنل وقار ہی نے کیا

''یہ جو بندہ آج پکڑا گیا ہے، یہ ہماری نگاہ میں تھا،

یہ کیا کرتا ہے یہ بھی پتہ تھا۔لیکن یہاں کس نیٹ ورک کے ساتھ کام کررہا ہے،اسے دیکھ رہے تھے۔"

"اصل میں جب تک مقامی لوگ انہیں سہولت نہیں دیتے،تب تک کوئی دشمن بھی یہاں کوئی بھی کارروائی نہیں کرسکتا۔ ہمارے وطن کے اصل دشمن یہاں کے سہولت کار ہیں۔"ایک آفیسر نے کہا تو سرمد نے جوش سے کہا۔

"وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں،پکڑتے کیوں نہیں؟"

"پلان بن گیا ہے۔اب صرف دیکھا یہ جارہا ہے کہ کون سا نیٹ ورک کن سہولت کاروں کے تحت چل رہا ہے۔"ایک دوسرے آفیسر نے کہا۔

"یہ ایک عام آدمی کو پتہ ہے کون کیا کررہا ہے، مثلاً جیسے کراچی میں ایک شخص جب بھی دبئی سے کراچی آتا ہے،ائرپورٹ سے لے کراس کے گھر تک تمام راستے سیل کردیئے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔اس قدر ظالم ہیں کہ ایک رپورٹر نے اس کی تصویر بنا کر اس سوال کے ساتھ آن ائیر کروادی کہ یہ کون ہے،کیا کراچی کا نیا ڈان ہے؟کسی بھی سرکاری حیثیت کے بغیر سرکاری پروٹوکول لیتا ہے۔کون ہے؟جواب میں اس رپورٹر کو گولی چاٹ گئی اور کسی نے پوچھا تک نہیں،جب تک ایسا ظلم ہوتا رہے گا،کیا ہوگا؟دبئی میں بیٹھ کر یہاں حکومت کرنے والے کون لوگ ہیں،کیا یہ ماورائی لوگ ہیں؟"جنید نے دردمندی سے کہا۔

"میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں۔آکٹوپس کی طرح چند لوگوں نے مافیا کی صورت اس ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔وہ دن دور نہیں جب ان کی گرفت ختم کردی جائے گی۔"پہلے آفیسر نے کہا تو نمبر ٹو نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھ کر مخاطب ہوا

"یہ جو حالات ہیں وہ ہماری نگاہ میں ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں،یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔میں ایک دوسری بات کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دشمن کی گرفت کمزور کرنے کے لیے،پہلے دشمن پر ضرب لگائی جاتی ہے۔میں چاہتا ہوں،ملک کے اندر صفائی سے پہلے دشمن کو بتادیا جائے کہ اب اس کا وقت ختم ہے۔اس نے اگر اب کوئی سازش کی تو اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"بولیں،کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟"میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"ساری تفصیلات آپ کو کرنل وقار بتادیں گے۔ اور جو کچھ کرنا ہے وہ آپ نے کرنا ہے۔میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ دشمن کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔"

"ہوجائے گا۔"میں نے کہا تو نمبر ٹو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔اس نے کھڑے ہوکر مجھ سے ہاتھ ملایا تو باقی بھی کھڑے ہوگئے۔

ڈنر کے دوران بہت ساری باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرح سے وہ ساری تفصیلات ہی تھیں۔انہوں نے جو بتایا،میرے ذہن میں اپنا ہی ایک پلان بنتا چلا گیا۔جس وقت ہم ڈنر سے واپس آرہے تھے۔مجھ پر ہر شے روشن ہوچکی تھی۔

☆......☺......☆

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔پچھلی رات کا چاند نکلنے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔جسپال سنگھ ایک سدھائے ہوئے اونٹ پر سوار تھا۔اس کا رخ سرحد پر لگی باڑ کی طرف تھا۔وہ لحہ بہ لحہ باڑ کے قریب ہوتا چلا جارہا تھا۔باڑ پر لگی ہوئی تیز پیلی روشنی سے وہ ابھی دور تھا۔اونٹ اس جگہ رک گیا جہاں تک روشنی آرہی تھی۔ جسپال سنگھ نے پہلے سیل فون پر وقت دیکھا پھر پیروں کی مدد سے اونٹ کو ٹھوکا دیا تو اونٹ بیٹھ گیا۔جسپال

سنگھ اترا تو اونٹ اٹھ کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ سامنے کچھ دور باڑ تھی، جس کی دوسری جانب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا سیاہ گیٹ تھا۔ جسپال سنگھ کھڑا نہیں رہا، بلکہ لیٹ گیا۔ اس نے پھر وقت دیکھا اور اطمینان سے سامنے دیکھنے لگا۔ باڑ کے ساتھ اس جانب فورسز کا ایک چھوٹا سا دستہ دائیں جانب سے سامنے آیا اور بائیں طرف چلا گیا۔ اب یہ ایک خاص وقت کے مطابق واپس آنا تھا۔ جسپال سنگھ آگے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ باڑ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ دوسری جانب کوئی نہیں تھا۔ وہ چند منٹ تک دیکھتا رہا۔ اسے دوسری طرف سے کال کا انتظار تھا۔ وقت لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کا فون بجا اور پھر بند ہو گیا۔ کال دوسری جانب ہی سے تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں گیٹ کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور تین اونٹ گیٹ سے باہر آ گئے۔ جیسے ہی تیسرا اونٹ نکلا، جسپال سنگھ گیٹ کے اندر تھا۔ سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ باڑ سے کوئی سو میٹر تک گیا ہوگا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

"کہاں پر ہو؟" ایک اجنبی نسوانی آواز میں پوچھا گیا تو جسپال نے اردگرد دیکھ کر اپنی لوکیشن بتا کر کہا۔

"بولو کیا بات ہے؟"

"اسی ڈائریکشن میں آگے بڑھتے جاؤ۔ ایک پکا کھال دکھائی دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ تو نہر پر آن پہنچو گے۔ جس طرف سے پانی آ رہا ہے، اس جانب بڑھ جانا۔ تمہیں دو کلومیٹر چلنا پڑے گا۔ نہر کے بائیں جانب بستی ہے۔ وہیں تمہیں تمہارے دوست مل جائیں گے۔ نمسکار۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جسپال سنگھ نے طویل سانس لی اور چل پڑا۔

دو کلومیٹر سفر کے بعد اسے بستی دکھائی دی۔ تب تک پچھلی رات کا مدقوق چاند بھی نکل آیا تھا۔ جس کی دھیمی روشنی میں وہ اردگرد دیکھ سکتا تھا۔ نہر پر پُل تھا۔ جس کے ساتھ ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس میں سے بانیتا کور نکلی اور اس کے ساتھ آ لپٹی۔ بانیتا کور کی گرفت میں کیا تھا، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اس قدر خلوص اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ جیسے کوئی بہن اپنے بھائی سے مل رہی ہو یا کچھ بھی وہ بڑا انہونا جذبہ تھا۔ تبھی اس نے گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

"چلو آؤ، جلدی نکلیں۔"

وہ تیزی سے کار میں آ بیٹھے۔ ایک لڑکا ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، ساتھ میں سندیپ کور تھی، وہ بھی ملی، تب تک کار چل پڑی۔ جب تک وہ بڑی سڑک تک نہ پہنچ گئے، تب تک ان میں خاموشی رہی۔ تب پہلا سوال جسپال ہی نے کیا۔

"بانیتا۔! یہ بارڈر پر کیا سیٹنگ ہے؟ پچھلی بار اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو گئے تھے کام سے، اس بار تو آرام سے آ گیا ہوں۔"

"پہلے پچھلی بار کی بات سن لو، عین وقت پر سب بدل گیا تھا، جن کے ساتھ سیٹنگ تھی، انہیں بدل دیا گیا۔ خیر ان سب سے بدلہ تو لے لیا، کوئی بھی نہیں بچا۔"

"کسی قسم کی کوئی انکوائری......"

"بالکل نہیں ہوئی۔ سارے چور ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہوتا یہاں اور پھر مجبوریاں کیا کچھ نہیں کروا دیتی ہیں۔ سب چلتا ہے۔" بانیتا کور نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجبوریاں، کیسی مجبوریاں؟" جسپال نے پوچھا۔

"اب دیکھو۔! ایک لڑکی جو اپنے گھر جانے اور اسے بسانے کا خواب رکھتی ہے۔ انہیں کوئی مجبوری ہی

ان ویرانوں میں نوکری کے لیے لاتی ہے، اب دیکھو یہ بی ایس ایف نے لڑکیوں کو بھرتی کیا ہے سرحدوں کی حفاظت کے لیے، کیا مرد سارے مر گئے ہیں؟ یا ہیجڑے ہو گئے ہیں کہ وہ فورسز میں نہیں آتے، لڑکیوں کو کیوں بھرتی کیا گیا ہے، صرف مجبور لڑکیوں کو اپنی عیاشی کے لیے۔ ان میں ننانوے فیصد غریب گھر کی ہیں۔ کیا ان کا حق نہیں کہ وہ اپنا گھر بسائیں؟ وہ اپنے گھر کا خواب لے کر ان سرحدوں کی حفاظت پر مامور کر دی گئی ہیں۔ لیکن ان سے کوئی خواب نہیں چھین سکتا۔ وہ اگر آفیسروں کے پہلو گرم کرتی ہیں تو دوسری طرف پیسہ بنا رہی ہیں۔ اب جس لڑکی سے تمہاری بات ہوئی، اسے چھ لاکھ دیئے ہیں، ایک ہی رات میں اس نے اتنا کما لیا۔" بانیتا کور کا لہجہ ویسا ہی تلخ رہا تھا۔ تبھی سندیپ کور بولی۔

"ایک بات اور ہے میری جان۔! پرانے زمانے میں جب لوگ سفر کرتے تھے تو عورت کو بوجھ اٹھوا کر آگے آگے چلاتے تھے۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو پہلے اس کا شکار یہی عورت بنتی تھی۔ یہ یہاں کے ہندو کی ذہنیت ہے کہ وہ خطرے کے وقت عورت کو آگے کر دیتا ہے اور خود پیچھے رہ کر وار کرتا ہے۔"

"خیر کچھ بھی ہے، کرپشن ہر جگہ ہے اور یہ ناانصافی کی پیداوار ہے، جہاں ناانصافی ہوگی، وہیں کرپشن بھی ہوگی۔ جب تک کوئی بڑا نہیں کرتا، تب تک چھوٹے کی ہمت نہیں پڑتی، بڑا لوٹتا ہے تو چھوٹے اس میں حصے دار بن جاتے ہیں۔" بانیتا کور نے کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں، کیا روٹ ہے؟"

"ہمیں جے پور کے قریب جانا ہے اور اس کے بعد وہاں سے امرتسر کے لیے نکلیں گے۔" بانیتا کور نے یوں کہا جیسے وہ پکنک پر جا رہی ہو۔ جسپال نے سیٹ کے ساتھ سر ٹکا لیا۔ کار تیز رفتاری سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

☆......☺......☆

وہ تیسرے دن کی اُجلی صبح تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے گھر کے ایک کمرے میں میرے ساتھ، سرمد اور جنید بیٹھے ہوئے تھے۔ نور نگر میں فہیم اور ارونڈ پہنچ چکے تھے اور وہ ہمارے ساتھ آن لائن تھے۔ ان کے قریب ہی رونیت، کور اور مہوش موجود تھیں۔ وہ سب سمجھ چکے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ میں نے ان تین دنوں میں پلان تیار کر کے اس کی جزئیات بھی سمجھ لی تھیں۔

ملک میں چند لوگ تھے جو انتہائی طاقت ور تھے۔ انہوں نے خود کو مضبوط رکھنے کے لیے اور عالمی سطح کی شخصیت بننے کے لیے مختلف خفیہ تنظیموں سے رابطہ کر رکھا تھا۔ ایسے لوگ صرف ہونٹ ہلاتے ہیں اور ان کا کام ہونے لگتا ہے۔ کارندوں کا ایک جال انہوں نے پھیلایا ہوا ہوتا ہے جو یہ سب کام کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ کسی بھی جرم میں سامنے نہیں آتے اور نہ ہی ان کا کہیں ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہی وہ انسانیت دشمن لوگ ہوتے ہیں جن کا شمار اصل مجرموں میں ہوتا ہے۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان کے بارے میں علم تو ہوتا ہے کہ جرم کے ڈانڈے کہاں مل رہے ہیں، لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے، اگر کسی طرح سے ایسے لوگوں کو پکڑ بھی لیا جائے تو کرپشن کے اس نظام میں وہ آسانی سے نکل جاتے ہیں۔ بعض اداروں میں تو ان کے اپنے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں جو انہیں پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں۔ ایسے حالات سے یہ لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں اپنی نیک نامی کا یوں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ عوام یہی سمجھتی ہے کہ ان سے بڑا کوئی نیک نام ہے

ہی نہیں۔ پھر وہ لوگ جوان کی نشاندہی کرتے ہیں، انہیں پکڑتے ہیں، کسی بھی حوالے سے ان کے نقصان کا باعث بنتے ہیں، جلد یا دیر غیر طبعی موت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ کرپٹ نظام کا سب سے بڑا ظلم نہیں ہے کہ جج حضرات ایسے لوگوں کا مقدمہ سننے سے معذرت کر لیتے ہیں۔ جب عدالتیں ہی خوف کا شکار ہوں تو انصاف کہاں؟

ان میں وہ لوگ جن کا کہیں نہ کہیں سے ''را'' کے ساتھ رابطہ تھا، وہ ہمارا ٹارگٹ تھے۔ سب سے پہلا ٹارگٹ ہمیں مل چکا تھا اور یہ ٹارگٹ کہیں آسان تھا۔

بنیادی طور پر وہ فیصل آباد کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ دور طالب علمی ہی سے وہ طلبہ سیاست میں حصہ لینے لگا تھا۔ غنڈہ گردی سے فرصت ملتی تو پڑھتا بھی۔ غنڈہ گردی ہی کو کام میں لا کر وکالت کی ڈگری حاصل کر لی اور وکیل بن گیا۔ یہیں سے اس نے سیاست کا آغاز کیا۔ پہلی بار وہ مقامی سطح پر کونسلر بنا، پھر اس کے بعد اچانک ہی سیاست کا پھیلاؤ ہوا اور وہ صوبائی سطح کا لیڈر کہلوانے لگا۔ اس کے دو نمبر دھندوں میں سب سے بڑا دھندہ رسہ گیری تھا۔ چوری، ڈکیتی اور اجرتی قتل کروانا اس کا گویا پیشہ بن گیا۔ اس کے ارد گرد اشتہاری اکٹھے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ رکن اسمبلی بھی بن گیا۔ اس کے ان دھندوں کو دیکھتے ہوئے بہت سارے ایسے لوگ بھی اس کے ساتھ جڑ گئے، جن کا اپنا پیشہ کچھ ایسا ہی تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، وہ طاقت ور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے دھندے کا پھیلاؤ پورے پنجاب میں ہو گیا۔ اس نے کچھ ایسی تنظیموں پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا، جو کسی نہ کسی حوالے سے شدت پسند تھیں۔ یہ اسے دہرا فائدہ دینے لگیں۔ ایک تو اس علاقے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی کہ کوئی بھی اس کے مقابلے میں الیکشن نہیں لڑتا تھا۔ دوسرے جب بھی اس کی مخالفت میں کوئی آواز بلند ہوتی اسے یہی لوگ دباتے تھے۔

دولت جب ہاتھ میں آتی ہے تو اس کا نشہ بڑھنے لگتا ہے۔ اس نشے میں نہ اسے دین کی خبر رہتی ہے نہ دنیا اور انسانیت کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غیر ملکی طاقتوں کا ایندھن بنتے ہیں۔ انہیں ملک وملت سے غرض نہیں رہتی۔ کسی بھی تنظیم کی آنکھ اور کان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو قوم سے غداری کرتے ہیں۔ وہ ''را'' کا مخبر بن گیا تھا۔ وہ ''را'' کا مخبر ہی کیوں بنا؟ اس میں اس کی را سے ہمدردی نہیں، اس فائدے سے دلچسپی زیادہ تھی جو اسے ملنے لگا تھا۔ فارن اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے ممالک میں کاروبار اور جائیداد میں اضافہ اسے ہوش ہی نہیں لینے دے رہا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کتنا دولت مند ہے، میری دشمنی کے لیے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میرے وطن کا دشمن ہے۔ محبّ وطن کا لبادہ پہنے وہ چوہا، اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔

ان تین دنوں میں اس کے بارے میں معلومات جمع ہوتی رہیں۔ یہ ساری باتیں کسی ثبوت کے بغیر صرف لوگوں کی بتائی ہوئی باتیں ہی تھیں۔ کہیں بھی کسی تھانے میں ریکارڈ تو کیا ایک درخواست تک نہیں تھی۔ یہ ساری معلومات ایسی تھیں کہ فورسز کسی طرح بھی ایکشن نہیں لے سکتی تھیں۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتہ نہ چلتا تو میں بھی شک وشبہ میں پڑ جاتا۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ فیصل آباد میں موجود سرمد کے ایک بندے نے اطلاع دی کہ وہ ایک شخص کو لے کر آ رہا ہے اس سے قیمتی معلومات مل سکتی ہیں، وہ بہت کچھ بتانے پر راضی ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔ ہم اسی کا انتظار کر رہے تھے جو تھوڑی دیر قبل ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ سرمد کے

لوگ اسے کھلا پلا کر اور فریش کر کے لانے والے تھے اور میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے تھا۔ اُدھیڑ عمری اور بڑھاپے کے درمیان تھا یا شاید مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا جسم لاغر تھا، آثار بتا رہے تھے کہ وہ کبھی بہت صحت مند جسم کا مالک رہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ مجھے دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہا۔

"تمہیں اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہنا ہے کہہ دو، کوئی سوال ہوا تو میں پوچھ لوں گا۔"

اس نے اپنا سر ہلایا اور ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اپنے بارے میں بتاتا چلا گیا۔

"میں اس کے پاس ملازم تھا۔ ان دنوں شہر میں میرا بھی طوطی بولتا تھا۔ میں پہلوان تھا اور اکھاڑا کرتا تھا۔ ہر جمعہ کے دن دنگل ہوتا تھا۔ ارد گرد علاقے کے تقریباً بھی پہلوان گرا چکا تھا۔ میرے اپنے بیوی بچے تھے۔ اپنا گھر تھا۔ بڑا بیٹا پڑھ رہا تھا۔ اخراجات بڑھ رہے تھے۔ انہیں دنوں میں اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کئی دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے اپنے پاس بطور 'بدمعاش' رکھ لیا۔ یہ ایک طرح سے لوگوں پر دہشت ڈالنے کے لیے تھا کہ فلاں پہلوان بھی اس کے ساتھ ہے۔ تقریباً آٹھ سال میں نے اس کے پاس کام کیا، اکھاڑا ختم ہو گیا اور مجھے بھی حرام کی کمائی کی لت پڑ گئی۔ میرا کام زمینوں پر قبضے کرنا، غنڈہ گردی اور ایسے کئی کام تھے۔ فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل میں سالانہ فنکشن ہوا کرتا تھا، وہیں پر ایک طوائف یہاں لاہور سے گئی، جس نے اور لوگوں کے ساتھ میرا بھی دل لوٹ لیا۔ میں اس کا ہو گیا۔ میں اس کے چکر میں پڑ گیا، جس پر اس نے مجھے اس طوائف کو اٹھا لانے کو کہا۔ میں لے آیا۔ مگر اس مارا ماری میں مجھ سے ایک بندہ قتل ہو گیا۔ اس نے مجھے پولیس سے تو بچا لیا، مگر میں اس کے جال میں پھنس گیا۔ دو چار برس کے بعد وہ طوائف تو اپنے ٹھکانے کو پلٹ گئی لیکن میری زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ مجھ سے منشیات کا دھندا کروانے لگا۔ انہیں دنوں اس سے بہت سارے لوگ بھی آ کر ملنے لگے۔ ایک دن میرے سامنے ایک نشئی مر گیا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا تھا۔ اس کے خاندان میں دو بچے اور ایک بیوی تھی جو لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ اس دن مجھے اپنے دھندے سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میں یہ کام اب نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ میں اب یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ میں مسلسل انکار کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے مجھے منشیات ہی کے کیس میں اندر کروا دیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اس دوران اس نے میرے گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میرے بیٹے کو بھڑکایا گیا۔ اس نے جذبات میں آ کر انہی کا ایک بندہ مار دیا۔ میری بیوی اور میری بیٹی اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے میری بیوی کو قتل کر دیا اور میری بیٹی کو اٹھا لیا۔ جو آج تک مجھے نہیں ملی۔"

"تم جیل سے کب رہا ہوئے۔"

"ایک سال پہلے۔" اس نے جواب

"اور تمہاری بیٹی ......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دو سال پہلے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"بیٹا، جیل میں ہے۔ اس سے ملے؟" میں نے پوچھا تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں ملا اور نہ ہی میری ہمت پڑی ہے۔ وہ کہاں ہے میں نے یہ بھی پتہ نہیں کیا؟"

''اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''بہت کچھ، میرا ایک منہ بولا بیٹا بنا ہوا ہے، وہ اب بھی اسی کے پاس ہے۔ اسے اندر کی ساری باتیں پتہ ہیں۔ وہ مجھ سے اب تک دو بار ملا ہے اور وہ بھی خفیہ اس نے مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ پتہ لگا رہا ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے، پتہ لگتے ہیں ہم نے اسے مارنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا اور پھر وہ سب بتاتا چلا گیا جو اسے اس کے منہ بولے بیٹے نے بتایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے لاہور والے گھر میں ایک عورت ہے جو یہاں کی نہیں ہے، بلکہ کسی دوسرے ملک کی ہے۔ سب کچھ سن لینے کے بعد میں نے اس کے منہ بولے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو سرمد نے کہا۔

''اسے بھی دیکھ لیا ہے۔ اسی نے تو اس بوڑھے اچھے پہلوان کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا ہے بالکل درست ہے۔''

''تو پھر دیکھتے کیا ہو، چلو نکلتے ہیں، وہ ابھی اپنے گھر ہی میں ہے نا۔'' میں نے ایک دم سے پوچھا۔

''جی، ابھی تک وہ اپنے فارم ہاؤس ہی میں ہے۔ ابھی تو اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔'' سرمد نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''پلان کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سب تیار ہے، بس نکلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ تو میں اٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم اس فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ ہم لوگ ایک فور وہیل میں تھے لیکن ہمارے پیچھے اور پہلے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ ہمیں داخلی گیٹ پر ہی روک لیا گیا۔ میں نے ڈیش بورڈ پر پڑا پسٹل اٹھا لیا۔ اس کا میگزین دیکھا اور سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ ایک باوردی سیکورٹی گارڈ نے قریب آکر کہا۔

''کون لوگ ہیں آپ اور کس سے ملنا ہے؟''

''بتاؤ اسے؟'' سرمد نے اپنے ایک لڑکے سے کہا۔ وہ نیچے اترا اور جاتے ہی اس کی گن پر ہاتھ مارا، گن کھینچ کر اپنے ہاتھ میں کرتا ہوا بولا۔

''ہم کون ہیں یہ تو تیرے صاحب کو بھی نہیں پتہ۔'' اتنا کہہ کر اس نے گھما کر گن اس کے سر پر ماری۔ قریب کھڑے چند سیکورٹی والے اس کی طرف بڑھے۔ تب تک سرمد نے فور وہیل آگے بڑھا دی۔ ہمارے پیچھے ہی ایک فور وہیل اور آن رکی تھی۔ اس میں سے کئی لڑکے نکل آئے تھے۔ انہوں نے گیٹ والی سیکورٹی کو فوراً قابو کیا۔ تو تیسری فور وہیل ہمارے پیچھے آنے لگی۔ سرمد نے سارا پلان کر رکھا تھا۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔

''بڑا زبردست پلان کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''تین دن سے یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں دو بندے بنا لیے ہوئے ہیں جو سب بتا رہے ہیں۔ بس چند منٹ مزید۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پورچ کی طرف سے فور وہیل رہائشی عمارت کے ساتھ دائیں جانب موڑ لی۔ تب تک سامنے سے کئی سیکورٹی والے آ گئے، انہوں نے گنیں سیدھی کی ہوئی تھیں۔ لیکن ہائی روف سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ وہ ایک کے بعد ایک گرنے لگے۔ سرمد نے فور وہیل نہ روکی، انہیں روندتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ سامنے بڑے بڑے گہرے سبز لان تھے، جن میں فوارے چل رہے تھے۔ ایک سفید فوارے کے پاس کافی سیکورٹی گارڈ تھے۔ ان کا رخ بھی ہماری طرف ہو گیا۔ وہ جو تیسری فور وہیل تھی، وہ رہائشی عمارت کے بائیں جانب سے پچھلی جانب گئی تھی۔ وہ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ شدید فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔

''وہ سامنے کھڑا ہے۔'' سرمد نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ اسے میں نے کئی بار اخباروں میں

اور ٹی وی پر دیکھا تھا۔ وہ دو سو میٹر سے زیادہ فاصلے پر موجود سبز لان میں سفید فوارے کے پاس سفید کرتے اور شلوار میں ملبوس کھڑا ہے اور اس کے ساتھ چپکی ہوئی گلابی لباس میں کوئی خاتون تھی ۔ ان کا رخ ہماری طرف ہی تھا۔

''وہیں چلوان کے پاس۔'' میں نے سرمد سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ فور وہیل بڑھاتا چلا گیا۔ وہ ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سیکورٹی والے سامنے نہیں بچے تھے۔ میں نیچے اترا اور ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے یوں اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ تیزی سے بولا۔

''کون ہو تم؟''

''بتاتا ہوں اتنی جلدی کیا ہے؟'' میں نے کہا اور انہیں مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے ان کے پیروں میں دو فائر کر دیئے ۔ وہ سہم گئے ۔ میں پسٹل سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، اس بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں بینچ پر جا بیٹھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کون ہو تم ؟'' اس نے اپنے لہجے کو رعب دار بناتے ہوئے پوچھا، حالانکہ اس میں کھوکھلا پن صاف پتہ چل رہا تھا۔ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے؟''

''کون اچھا اور کس کی بیٹی؟'' اس نے حیرت سے کہا تو میں اٹھا اور ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے پیچھے چھپی ہوئی عورت چیخ پڑی۔ تبھی سرمد آگے بڑھا اور اس نے اس عورت کا بازو پکڑ کر کہا۔

''اس سے ملو۔! یہ ہے رنجنا عرف پروین چوہدری۔ بھارت سے تعلق ہے اور اس بے غیرت کی عیاشی کا سامان ہے۔''

''اسے سائیڈ پر لے جاؤ، اس سے بعد میں پوچھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس سے پوچھا۔

''بول، اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں پتہ کہاں ہے؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تمہیں ایسے یاد نہیں آئے گی، اندر چل، وہاں پوچھتا ہوں۔'' میں نے اسے گردن سے پکڑا اور اندر کی جانب لے کر چل پڑا۔ سرمد باہر سیکورٹی والوں اور عملے کے لوگوں کو قابو میں کر کے تلاشی لینے لگا تھا۔ وہ چھ فور وہیل پر تھے۔ انہوں نے چند منٹوں میں وہاں پر قابو پا لیا تھا۔ یہ کسی کو ڈر نہیں تھا کہ وہاں پولیس یا کوئی دوسری فورس آئے گی۔ انہوں نے تب ہی آنا تھا، جب ہم وہاں سے نکل جاتے۔

میں انہیں لاؤنج میں لے آیا۔ وہ دونوں سامنے کھڑے تھے۔ میں نے رنجنا کو گردن سے پکڑ کر کہا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لیے جتنی جلدی بولو گی، اتنا کم تشدد ہوگا، بولو کب سے یہاں پر ہو؟''

''ایک سال سے'' اس نے تیزی سے جواب

''را سے تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اسی لہجے میں کہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا، پھر پسٹل اس کی گردن پر رکھ کر پوچھا۔

''کب سے ''را'' کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''میرا ان سے کوئی تعلق نہیں میں......'' لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں نے تیزی سے پسٹل نیچے کیا اور اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ وہ ایک دم سے چیخ اٹھا۔ وہ تڑپنے لگا تھا

''اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا تو پھر سے حیرت کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا کہ میں

پل پھر میں بات بدل دیتا ہوں، وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ آخر میں اس سے پوچھنا کیا چاہتا ہوں۔
"میرے پاس ہے۔" اس نے تڑپتے ہوئے تیزی سے
"اور کب سے ملک دشمنی کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا تو بولا۔
"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں نے کچھ نہیں کیا۔"
"یہ کاغذات ملے ہیں اور یہ دو لیپ ٹاپ، اس کا ڈیٹا سب بتا دے گا۔" ایک لڑکے نے آ کر بتایا۔ اگرچہ یہ اس کی بات درست تھی لیکن یہ ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا کہ ثبوت پکڑے جا رہے ہیں۔
"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔
"خدائی فوجدار سمجھ لو۔ اگر تعاون کرو گے تو بہت کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔" میں نے ایک نیا پانسہ پھینکا۔
"میں تعاون پر تیار ہوں۔"
"تو پھر چلو ہمارے ساتھ۔" میں نے کہا تو وہ درد کی شدت سے سسکتے ہوئے بولا۔
"جو بات کرنی ہے یہیں کر لیں۔"
"یہاں دشمن ملک کے لیے کیا کام کرتے ہو؟"
"میں نے کوئی راز نہیں دیا، نہ کبھی غداری کی ہے، بس یہی شراب کا دھندہ اور......" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر گھونسہ مارا، پھر دولڑکوں کو اشارہ کیا کہ اسے اٹھا کر گاڑی میں پھینکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اگلے پانچ منٹ میں ہم چند لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے تھے۔ سرمد نے تلاشی سے کافی کارآمد چیزیں لے لی تھیں۔ میرا اس پر تشدد کرنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔
سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں سیف ہاؤس کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ دونوں تھے۔ رنجنا فرش پر پڑی ہوئی تھی اور وہ بھی اس کے پاس پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں موت کا خوف پھیلا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے رنجنا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"تمہارے بارے میں تو سنا ہے کہ تم بڑی ظالم قسم کی فائیٹر رہی ہو۔ یہاں کتنا چھوئی موئی بنی ہوئی ہو۔ ذرا بھی شک نہیں ہوتا۔"
اس نے میری طرف دیکھا اور دردمندی والی مسکراہٹ میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیوں مذاق کرتے ہو، کہاں سے پتہ چل گیا ایسی جھوٹی بات کا۔"
"انبالہ میں سیوا داس عرف ہردیال سنگھ مارا جا چکا ہے۔ تم دونوں کو صرف ایک شرط پر چھوڑ سکتا ہوں، سب کچھ سچ سچ بتا دو، ورنہ یہی کمرہ تمہاری قبر بن جائے گا۔" میں نے یہ کہا ہی تھا کہ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پوری قوت سے گھونسہ میرے پیٹ میں مارا۔ میں اگر اس کی طرف سے محتاط نہ ہوتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا، لیکن میں ذرا سا ٹیڑھا ہوا تھا کہ وہ مجھ پر آن پڑی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلہ دبا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔
"ہماری نہیں تمہاری قبر بنتی ہے، ہماری تو چتا جلتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زور لگایا۔ وہ صرف زور نہیں لگا رہی تھی، اس کے علاوہ وہ میری گردن پر کچھ ٹٹول رہی تھی۔ میں ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے پوری قوت لگا کر اسے خود سے پرے کیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت نرم ہوئی تو میں نے خود کو آزاد کروا لیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے یوں گھمایا کہ وہ دہری ہوتی چلی گئی۔ میں نے دونوں پاؤں اس کی بغل میں رکھے اور بازو کھینچ لیا۔ اس کی فلک شگاف

چیخ نکلی، جس کے ساتھ ہی تڑپنے لگی۔ اس کا بازو جڑ سے نکل چکا تھا۔ میں اٹھا اور دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے لڑکے سے کہا۔

''پٹرول لاؤ، اس کی چتا جلا دی جائے۔''

وہ لڑکا فوراً باہر نکل گیا۔ میرے لفظ سننے کے ساتھ ہی گھگھیائے ہوئے انداز میں بولی۔

''میں سب بتا دوں گی، پلیز مجھے بچاؤ۔''

''اب وقت گذر چکا ہے رنجنا۔'' میں نے کہا۔

''پلیز معاف کر دو۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ وہ چیختی رہی چلاتی رہی، میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا، میں اس کی جانب بڑھ گیا۔

''کیا تم بھی اس کے ساتھ مرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''لگتا تو یہی ہے، لڑکے پچھلے آٹھ گھنٹوں سے پوچھ رہے ہیں اور تم کچھ بھی نہیں بتا رہے ہو۔ چلو اس کے ساتھ مر جاؤ۔ ہندو عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ ستی ہوتی ہیں، یہاں تم اس عورت کے ساتھ ستی ہو جاؤ۔ اچھا لگے گا نا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔ وہ لڑکا پٹرول کا ایک بڑا کین لے آیا تھا۔ میں نے وہ کین کھولا اور رنجنا پر پٹرول چھڑکنے لگا۔ وہ زور زور سے چلانے لگی۔ میں نہیں رُکا۔ جب وہ اچھی طرح بھیگ گئی۔ میں نے کین میں بچا پٹرول اس پر چھڑکنا شروع کیا تو وہ بھی چلانے لگا۔

''سب بتاتا ہوں۔ سب بتاتا ہوں۔''

میں جانتا تھا کہ دوسری طرف بیٹھے کچھ لوگ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں سنانے کے لیے ہی اونچی آواز میں کہا۔

''میں جا رہا ہوں۔ یہ اگر شام تک سب کچھ سچ بتا دیں تو ٹھیک، ورنہ انہیں جلا دینا، میری طرف سے اجازت ہے، صرف ماچس کی ایک تیلی ضائع کرنا ان پر۔'' یہ کہہ کر میں اس کمرے سے نکل آیا۔

مجھے پوری طرح احساس تھا کہ اب وہ سب کچھ اگل دیں گے۔ میں کمرے سے باہر آ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اب مجھے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں جانا تھا۔

☆......☺......☆

اُوگی پنڈ کے مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ سرخ حویلی کی چھت پر منڈیر کے پاس جسپال سنگھ کے ساتھ ہرپریت کھڑی تھی۔ ان دونوں کا رخ ڈھلتے ہوئے سورج کی طرف تھا۔ ان کے چہرے یوں روشن تھے جیسے سونے سے بنے بت چمک رہے ہوں۔ ہرپریت کور کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اداسی بکھری ہوئی تھی۔

''جسپال۔! اب تو یوں لگتا ہے کہ نہ تمہارے جانے کا غم ہوتا ہے اور نہ آنے کی خوشی، جیسے یہ سب ایک روٹین بن گئی ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے یہاں آنے پر خوشی ہوتی اور یہاں سے جانے کا دکھ بھی محسوس کرتے ہو؟''

جسپال سنگھ نے ایک گہری سانس لی اور اس سوال میں چھپی ہوئی خواہش کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہم جہاں بھی ہیں، ایک دوسرے کے ہی ہیں، کیا ملن پھیرے لے لینے ہی کا نام نہیں؟ کیا محبت کی ڈور صرف شادی کر لینے ہی سے مضبوط ہوتی ہے؟ ایسا نہیں ہے میری جان، میں دنیا میں جہاں بھی ہوتا ہوں، یہاں تیرے لیے ہی تو آتا ہوں۔ یہ کیا ہے؟ مجھ سے زیادہ تم بہتر جانتی ہو۔''

''لیکن اگر ہم مل جاتے ہیں، ہماری شادی ہو جاتی ہے تو پھر کیا ہے؟'' ہرپریت نے کھل کر کہہ دیا۔

'' جب فرض زیادہ اہم ہو جائے تو مزید ذمہ

داریاں بوجھ بن جاتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں کس راستے کا راہی ہوں۔ نجانے کب کوئی......" اس نے کہنا چاہا لیکن ہرپریت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند لمحے یونہی رہنے کے بعد وہ بولی۔

"ربّ نہ کرے کچھ ایسا ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے طویل سانس لی، پھر بولی۔

"میں بوجھ نہیں ہوں، تیری ذمہ داریوں میں حصہ دار بن جاؤں گی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن میں......" اس نے کہنا چاہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ جمال کا فون تھا اس نے تیزی سے رسیو کیا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ہردیال سنگھ باجوہ، یہ نام ہے اس بندے کا، جس کا اصل نام سیوا داس ہے۔ ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ ذات کا چمار ہے، پڑھ لکھ گیا اور اب 'را' کے لیے کام کررہا ہے۔ اس وقت انبالہ میں ہے۔ میں نے جو فیصل آباد میں بندہ پکڑا ہے، یہ اس کا سورس تھا۔ یہی اسے فیڈ کررہا ہے۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے سے پہلے اسے ختم کرنا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" اس نے انتہائی اختصار سے جواب دیا تو جمال نے فون بند کردیا۔

"کوئی نیا کام؟" ہرپریت نے یوں پوچھا جیسے یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ اب بس، ہماری باتیں ختم؟

"ہاں۔! لیکن کوئی بات نہیں، میں کون سا کہیں، جا رہا ہوں۔ تم ایسے کرو، اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے چھت سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ہرپریت بھی اس کے ساتھ چل دی۔

جسپال اپنے کمرے میں آگیا تو ہرپریت نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ جسپال نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور بیڈ پر آن بیٹھا۔ پھر اس نے فون اٹھا لیا۔ جلد ہی انبالہ میں موجود بندے سے رابطہ ہو گیا۔ اسے ساری بات سمجھا کر وہ انتظار کرنے لگا کہ وہ کب آپریشن کا آغاز کرتے ہیں۔

انبالہ شہر کے درمیان سے گذرنے والی مین سڑک جو آگے جاکر سادھو پور سے آنے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی مین روڈ پر دائیں ہاتھ پر ایک بڑی سڑک نکلتی ہے۔ اسی سڑک پر کافی آگے جاکر ایک منوا چوک آتا ہے۔ یہ "پتی کلاں" کا علاقہ ہے۔ منوا چوک سے کچھ آگے سونیا کالونی ہے۔ یہ کچھ پرانی اور کافی گنجان آباد کالونی ہے۔ سونیا کالونی کا ایک راستہ رام باغ کی طرف سے بھی آتا ہے۔ رام باغ اور منوا چوک پر ہائی ایس وین موجود تھیں۔ ان دونوں کے ڈرائیور نے آپس میں وقت کا تعین کرلیا ہوا تھا اور ان کے پاس سیل فون آن تھے۔ ان کے پیچھے تین تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو اسلحہ سے پوری طرح لیس تھے۔ دونوں طرف سے وہ اس لیے آکر کھڑے تھے کہ ہردیال سنگھ عرف سیوا داس نے گھوتنک اسپورٹس کلب سے لان ٹینس کھیل کر واپس آنا تھا۔ وہ ان دونوں راستوں ہی کو استعمال کرتا تھا۔ ان میں سے کسی راستے سے ہوتا ہوا وہ لکشمی نرائن مندر کے پاس سے ہوتا ہوا اس کے عقب میں موجود چوک میں جاتا، جس سے اگلی گلی میں اس کا دو منزلہ گھر تھا۔ یہ اس نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ لیکن گھر میں ایک رکھیل رکھ چھوڑی تھی، وہ ایسی رکھیل، ہر دوسرے تیسرے برس بدل لیتا تھا۔ بچوں کا جھنجٹ اس نے پالا ہی نہیں تھا۔ اس نے را کے لیے بہت سارے کام کیے تھے۔ اس کی انہیں خدمات کو مدنظر رکھ کر انہوں نے ملک سے باہر کے ٹاسک بھی اسے دینا شروع کر دیئے تھے۔ وہاں سب کی نظر میں وہ ایک بزنس مین

تھا، جس کا گھوتک کمپلکس ہی میں آفس تھا۔ دراصل یہ اس کا آپریشن روم تھا، جہاں سے وہ اپنے سورس کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا۔

اس وقت ساڑھے سات ہو چکے تھے، جب منوا چوک کی طرف سے اس کی سیاہ ہنڈائی نمودار ہوئی۔ اس کا ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ رام باغ کے لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ وہ طوفانی رفتار سے اس کے گھر کی جانب چل پڑے۔ وہ اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کے اردگرد اگر سیکورٹی ہے تو کتنی اور کیسی ہے؟

جیسے ہی سیاہ ہنڈائی منوا چوک والوں کے پاس سے گذری تھی، وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ لکشمی نرائن مندر کے پاس جا پہنچے۔ وہاں تک انہیں سب کلیئر ملا تھا۔ کسی بھی قسم کی کوئی چھپی ہوئی سیکورٹی کا شائبہ تک نہیں ملا۔ جیسے ہی اس کی سیاہ ہنڈائی چوک کراس کر کے گلی میں داخل ہوئی، تو دوسری جانب سے وین بھی اندر آ گئی۔ اسی کے ساتھ ہی پیچھے منوا چوک سے آنے والوں کی وین رک گئی۔ ہردیال سنگھ عرف سیوا داس جیسے ہی اپنی کار سے نکلا ہر وین سے دو آدمی نکل کر انتہائی تیزی سے اس کے پاس آ گئے۔ ہردیال سنگھ عرف سیوا داس چالاک اور کائیاں شخص تھا، وہ سمجھ گیا کہ یہ سب اتفاق نہیں ہے۔ وہ واپس کار میں بیٹھنے لگا تو ایک بندے نے بھاگ کر اپنی ٹانگ دروازے میں اڑا دی۔ تب تک وہ واپس کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن بند نہ کر پایا۔ دوسرے نے اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ آدھا باہر آیا تھا کہ ایک بندے نے اس کے سر پر پسٹل رکھ کر فائر کر دیا۔ پسٹل پر سائیلنسر تھا۔ زیادہ آواز نہیں ابھری۔ ڈرائیور کو اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سہما ہوا، ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی ایک بندے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہارے بڑے پوچھیں گے کہ اسے کس نے مارا، کہہ دینا ”ویرتا“ نے مارا ہے۔ وہ سب سمجھ جائیں گے۔ کہنا، اب دوبارہ غلطی نہ کریں۔“ یہ کہتے ہی وہ پلٹا اور وین کی جانب بڑھا۔ دونوں وین بیک ہوئیں اور گلی کی نکڑ تک جا کر جدھر سیدھی ہوئیں، اسی جانب چل پڑیں۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے، جب جسپال سنگھ کو خبر مل گئی کہ ہردیال سنگھ عرف سیوا داس کو مار دیا گیا ہے۔ وہ بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ بھارتی نشریاتی ادارے اس قتل کو کیا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ رات گئے تک یہی دیکھتا رہا۔

اس وقت جسپال سنگھ سو رہا تھا، جب ہرپریت نے لیپ ٹاپ پر اخبار پڑھ لیا تھا۔ اسی وقت انوجیت سنگھ گھر میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں کلجیت سنگھ بیٹھی ہوئی پاٹھ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ”جپ جی“ پکڑی ہوئی تھی، جسے وہ پورے دھیان سے پڑھ رہی تھی۔ کلجیت کور کی اس پر نگاہ پڑی تو اس نے ”جپ جی“ کو بند کیا اور اسے ملنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پاؤں پڑتا ہوں ماں جی۔“ انوجیت نے کہا۔ تو ساتھ کمرے میں بیٹھی ہرپریت کور نے بھی سن لیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلی اور اپنے بھائی سے آملی۔

”اچھا میں فریش ہوتا ہوں، تم جسپال کو جگا لاؤ، اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں، مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔“ انوجیت نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تو ہرپریت نے پوچھا۔

”آپ کو پتہ ہے ویر، جسپال ادھر ہی ہے؟“

”ہاں مجھے پتہ، میں اسی لیے راتوں رات چنڈی گڑھ سے یہاں آیا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تبھی ہرپریت کور نے

پریشان لہجے میں پوچھا۔
"ویر جی، خیر تو ہے نا؟"
"ہاں، ہاں خیر ہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ہرپریت چند لمحے وہاں کھڑی رہی، پھر اوپر جسپال کے کمرے کی جانب چل دی۔
ناشتا سب ہی نے بڑے خوشگوار ماحول میں کیا۔ تبھی انوجیت سنگھ نے جسپال کو ساتھ لیا اور ٹہلنے والے انداز میں باہر لان کی طرف نکل پڑا۔ وہاں سفید پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد انوجیت سنگھ نے کہا۔
"جسپال ویرے۔! کل دوپہر کے وقت میرے پاس ایک پارٹی لیڈر آیا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے آپ کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی۔ میں اسے وہی کچھ بتایا، جو ہم سب کو بتاتے ہیں۔ وہ میری بات سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ ساری بات سن کر اس نے بڑی عجیب سی بات کہی۔"
"کیسی عجیب بات؟" جسپال سنگھ نے سکون سے پوچھا تو وہ الجھتے ہوئے بولا۔
"ملک میں ہونے والے چند پراسرار قتل میں آپ بھی شک کے دائرے میں ہیں۔ آپ کی بھی تفتیش ہو رہی ہے بڑے پیمانے پر۔"
"اسے کس نے بتایا؟" جسپال نے کسی تردد کے بغیر اسی سکون سے پوچھا۔
"میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ اس نے تو بہت گھما پھرا کر بات کی تھی، اس کا لب لباب یہ تھا کہ سیاست کوئی ایسا کھیل نہیں ہے، جسے بس یونہی کھیلا جاتا ہے۔ یہ طاقت کی گیم ہے اور طاقت ہی سے حاصل کی جاتی ہے۔ خفیہ والے چاہے جو بھی ہوں لیکن ہیں تو انسان۔ اگر وہ اتنے ہی محب وطن ہوں تو ملک سے کرپشن اور جرم ختم نہ ہو جائے۔ یہ جو سیاست دان اتنے بڑے بڑے گھپلے کر کے بھی دندناتے پھر رہے ہیں، انکا خاتمہ نہ ہو جائے۔ خفیہ والوں کی بھی خواہشیں اور خواب ہیں۔ یہ سارا کھیل انہی کے ساتھ مل کر کھیلا جاتا ہے۔ یہیں سے کرپشن کی شروعات ہوتی ہیں۔" انوجیت سنگھ نے الجھتے ہوئے بتایا تو جسپال بولا۔
"اصل میں وہ چاہتا کیا ہے؟"
"مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کھیل کی وزارت مل رہی ہے۔ بلا شبہ اس میں پارٹی کا بہت ہاتھ ہے، خاص طور پر رتن دیپ سنگھ جی کا۔ انہیں مجھ میں کوئی کمزوری دکھائی نہیں دی تو پرانی فائلیں نکال کر اور آپ کی ذات کو ٹارگٹ بنا کر مجھ سے یہ کہا جا رہا کہ میں یہ وزارت نہ لوں اور خاموش ہو جاؤں۔ وہ کوئی اپنا بندہ لا رہے ہیں۔" اس نے صاف انداز میں اصل بات کہہ دی۔
"کیا اس نے یہ بتایا کہ تفتیش کہاں تک پہنچ گئی ہے اور وہ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟" جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔
"یہ بات تو میں تب پوچھتا نا جب میں دلچسپی لیتا۔ اس طرح پوچھنے کا مطلب تھا کہ میں ڈر گیا ہوں، خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ یا واقعی آپ ایسے ہیں، جیسا وہ کہہ رہے ہیں۔"
"تو پھر تم فکر مت کرو۔ میں دیکھ لوں گا۔ نام کیا ہے اس پارٹی لیڈر کا؟"
"نہیں۔! اسے کچھ نہیں کہنا، وہ بھی اسی تاڑ میں ہوں گے کہ......" انوجیت نے جلدی سے کہا۔
"اوکے، تم فکر نہ کرو۔" جسپال نے اس سے کہا اور بات بدل دی۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اٹھ گئے۔ انوجیت کی اس بات نے اسے بہت کچھ

سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☺......☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اس صحافی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پاکستانی ہو کر بھی غیر ملکی ایجنٹ بنا ہوا تھا۔ وہ ایک مشہور چینل کا اینکر پرسن تھا۔ اس نے اپنی صحافت کا آغاز ویسے ہی ایک رپورٹر کی حیثیت سے کیا تھا، جیسے کوئی نیا بندہ صحافت میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی چینل نہیں تھا۔ ابتدا میں جب وہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو اسے ادب ہی سے لگاؤ تھا لیکن لکھنا اسے نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لکھنے لکھانے کی کوشش ضرور کرتا رہتا تھا۔ اس کی تحریر میں اس کے ذہن کی عکاسی جھلکتی رہتی تھی۔ اس کی تحریر پڑھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی جنسی مریض ہے۔ ایک خاص طبقے میں شمار ہو جانے کی دھن میں وہ بہت کچھ ایسا بھی لکھتا جسے ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی تحریر کی اتنی رسائی نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ محدود رہا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد اس نے ایک اخبار جوائن کیا۔ بے جان تحریروں اور بوسیدہ خیالات کی پیشکش اسے اچھا صحافی ثابت نہ کر سکی۔ کئی برس کی محنت کے بعد بھی وہ نہ تو مشہور ہو سکا اور نہ ہی اس کی کوئی خاص تحریر سامنے آسکی۔ وہ مایوسی کی حدوں کو چھونے لگا۔

وہ صحافت چھوڑ کر کسی نوکری کی تلاش میں تھا کہ اسے لاہور ہی کے باغ جناح میں ایک آدمی ملا۔ اس نے فلسفیانہ انداز میں دولت کی اہمیت بتانی شروع کر دی۔ اس کے ذہن میں یہی ڈالا گیا کہ اگر وہ دولت مند صحافی ہو گا تو شہرت خود بخود کھنچی چلی آئے گی۔ صحافی اس شخص سے باقاعدہ ملنے لگا تا کہ شہرت حاصل کرنے کے گر سیکھ سکے اور وہ اسے اپنی لائن پر لاتا چلا گیا۔ ایک طرح سے وہ اس کا استاد بن گیا اور وہ اس کا شاگرد۔ یوں محض ایک برس کی محنت سے اس نے صحافی کے دماغ میں ایسے خیالات بھر دیئے، جس سے ملک کے ملت کے بارے میں اس کے جذبات سرد پڑ گئے اور اس کی جگہ صرف دولت نے لے لی۔

ایک برس میں اس نے تیزی سے دو اخبار بدل لیے۔ وہ کالم نگاری کرنے لگا۔ اسے لکھے لکھائے کالم ملنے لگے، جسے عوام پسند کرنے لگے۔ اس کے گرد ایک ٹیم بنادی گئی، جو اس کے لیے لکھنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹی وی چینل آگئے۔ وہ ایک چینل کا اینکر پرسن بن گیا۔ اس کی ٹیم اس کے لیے کام کرنے لگی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے لگا، دولت اس کے گھر کی باندی بن گئی لیکن۔۔! وہ ملک و ملت کا سب سے بڑا دشمن بن گیا۔ وہ تازہ ترین معلومات دہشت گردوں کو دینے لگا۔ ایک خاص طبقہ کی وکالت کرتے ہوئے، ان کے پروپیگنڈا اخباروں میں نام بدل کر لکھنے لگا۔ کئی ملکوں کے ٹور لگنے لگے۔ وہ قوم کا مورال گرانے کی انتھک کوشش کرنے لگا۔ چونکہ ان کی رسائی ان ذرائع تک بھی ہو جاتی ہے جہاں معلومات بہت محدود طبقے تک ہوتی ہے تو دشمن دہشت گرد اپنے پلان بنانے میں اس کا تعاون حاصل کرنے لگے۔ وہ اس کے ذریعے معلومات لیتے اور فول پروف پلان بنا لیتے۔ یہ سارا کوڈ اور ڈی کوڈ کا کھیل تھا۔ جو وہ کھیل رہا تھا۔ عالمی سطح پر خود کو سیکولر ثابت کر کے ایک خاص عالمی طاقت کی ہمدردیاں حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط صحافی بن گیا جس کے پیچھے عسکری اور خفیہ تنظیمیں موجود تھیں۔

کچھ عرصے سے اس کے ٹی وی پروگراموں کا موڈ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ ایسے پروگرام ترتیب دینے لگا تھا، جس میں غیر محسوس انداز سے دہشت گردوں کی ہمت افزائی اور ملکی فورسز کو مذاق کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ حالات کو ایسی نہج پر لایا جائے

کہ عوام اپنی فورسز کو نکمی اور بزدل سمجھنا شروع کر دے اور فورسز کا مورال بھی گر جائے۔

سرمد اور اس کی ٹیم اس صحافی کے بارے میں کام کر رہی تھی۔ میں کسی اپ ڈیٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں میرا اسیل فون بجا۔

نورنگر سے اروند سنگھ کا فون تھا کہ شمس الدین اور قمر الدین کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد شمس لائن پر تھا۔ میں نے اس کی آواز سن کر کہا۔

"ہاں بولو شمس؟"

"سر! جس صحافی کے بارے میں آپ نے بتایا تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے تھا کہ میں "را" کے ایک ایسے بندے کے کمپیوٹر تک رسائی کر گیا ہوں جہاں ایک بڑا منصوبہ بن گیا ہے اور وہ بہت جلد یہاں پر اپلائی ہونے والا ہے۔"

"اس منصوبے کی تفصیلات کیا ہیں؟"

شمس نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔

اس صحافی کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ "را" کو چند ایسے لوگوں کے بارے میں رپورٹ دے چکا ہے جو محبِ وطن تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو "را" کے ایک مخصوص ایجنڈے کو پھیلانے میں رکاوٹ تھے۔ اس رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب تک یہ بندے ختم نہیں ہو جاتے ہیں، ان کا ایجنڈا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ "را" کے بڑوں نے انہیں ختم کرنے کا منصوبہ ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے لیے ایک ٹیم بھی تیار کر لی تھی۔ جن چند لوگوں کو انہوں نے ختم کرنا تھا، ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔

"سر اس کے علاوہ بھی ایک بات سمجھ میں آ رہی ہے؟" شمس بتایا۔

"وہ کیا؟"

"یہ لوگ اپنا یہ منصوبہ اس طرح رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ عوام میں بھی دہشت پھیل جائے۔ اس کے لیے یہاں پر جو انہوں نے تنظیم پالی ہوئی ہے، وہ اس سے بھی کام لیں گے۔" اس نے بتایا تو میں چند لمحے خاموش رہا، وہ بہت بڑی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"شمس۔! ایک بار پھر سے اس ساری رپورٹ کو غور سے پڑھو، ممکن ہے کہیں ڈی کوڈ ہونے میں غلطی لگ گئی ہو۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ ممکنہ جگہوں کو حفاظت میں لیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں دوبارہ یہ دیکھ لیتا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔ ملک میں آگ لگانے کا منصوبہ طے پا گیا تھا۔ کسی بھی تنظیم یا سیاسی پارٹی کا بندہ مارا جاتا ہے تو اس تنظیم یا پارٹی کے لوگ احتجاج کے نام پر ایسی افراتفری مچاتے ہیں کہ اس میں نجانے کتنوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ آگ لگانا، لوٹ کھسوٹ اور نجانے کیا کچھ۔ یہی وقت ہوتا ہے جب ابن الوقت قسم کے سیاست دان اپنی سیاسی دکان چمکاتے ہیں۔ مجھے اس منصوبے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا، اس لیے میں اسے ہر حال میں روکنا چاہتا تھا۔

مشرقی افق پر سورج نکلنے کی سرخی پھیل رہی تھی۔ میں لاونج سے نکل کر لان میں آ گیا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا مجھے سکون دے رہی تھی۔ ایسے میں وہاں موجود باورچی مجھے ایک کپ چائے تھما گیا۔ میں اس کے سپ لے رہا تھا کہ سرمد آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تب وہ چند منٹ بعد بولا۔

"وہ صحافی، ابھی تھوڑی دیر بعد ائر پورٹ پہنچنے والا ہے، وہاں سے اس نے کراچی جانا ہے، شام تک

واپس لوٹے گا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اگر اسے ابھی اٹھالیا تو اس کانفرنس سے اس کے اغوا کا چرچا پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔" اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

"تو پھر کیا کہتے ہو؟"

"اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔" سرمد نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

"ہم اسے کچھ نہیں کہتے، اُسے جانے دو۔"

"ہاں، ایسا ہی کرنا ہوگا۔" وہ بولا۔

"لیکن تم اپنی پوری ٹیم کو الرٹ کرو، وہ ہمیں فالو کرے۔ تم اور میں کہیں جا رہے ہیں، آؤ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کپ وہیں چھوڑ دیا۔ وہ نا سمجھتے ہوئے بھی میرے ساتھ اٹھ گیا۔

ابھی سورج نکلا نہیں تھا کہ میں اور سرمد ماڈل ٹاؤن والے گھر سے نکل پڑے۔ اس دوران میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ ہمارا رخ باغ جناح کی طرف تھا۔

ایوان تجارت روڈ کی طرف سے گیٹ میں داخل ہوئے اور وہیں کار پارک کر دی۔ میں کار سے باہر نکل کر اس بندے کی کار کو دیکھنے لگا، وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ یہاں آ گیا ہوگا؟" سرمد نے یونہی مجھ سے پوچھا۔

"اس کا معمول ہے۔ پچھلے ہفتے سے ہمارا ایک بندہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ بندہ سمجھو، اس صحافی کی ماں ہے۔ یہ بھی ایک چھوٹے اخبار کا مالک ہے۔ نام نہاد اخبار، جس پر وہ بلیک میل کرتا ہے۔ اصل میں تو یہ ایجنٹ ہے۔ یہاں اس لیے آتا ہے کہ خفیہ پیغام یا کوئی ہدایات اپنے چیلے چانٹوں کو دے سکے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک پرانی سی پھٹیچر کار وہیں آن رکی۔ میں نے سرمد کو اشارہ کر دیا۔ جس وقت وہ باہر نکلا، ہم اس کے پاس چلے گئے۔ میں نے اپنے بازو پھیلا لیے، جیسے مدتوں بعد اس سے ملا ہوں اور اس سے گلے ملنا چاہتا ہوں۔

"ارے رضوانی صاحب۔! کیسے ہیں آپ؟" یہ کہتے ہوئے میں اس کے گلے لگ گیا۔ وہ مجھے ذرا سا اپنے ساتھ لگا کر پیچھے دھکیلتے ہوئے شک بھرے لہجے یوں بولا، جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

"ہم نے آپ کو پہچانا نہیں میاں، کون ہیں آپ، پہلے تو دیکھا نہیں آپ کو؟"

"مجھے یہ اندازہ تھا کہ آپ مجھے پہچان نہیں پائیں گے۔ اسی لیے ساتھ میں جان پہچان لایا ہوں۔"

"جان پہچان اپنے ساتھ لائے ہیں، میاں میں اب بھی نہیں سمجھا؟" اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

"ارے رضوانی صاحب آپ کو بھلا سمجھنے کی کیا ضرورت ہے، آپ تو خود ایک عالم کو سمجھاتے ہیں، آئیں یہاں میں آپ کو دکھاؤں۔" میں نے کہا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ چار قدموں پر کار کھڑی تھی۔ اس وقت تک سرمد نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے اندر کچھ دیکھنا چاہا، میں نے اسے دھکا دیا تو وہ سیدھا سیٹ پر جا پڑا، اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرمد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ میرے نیچے تڑپنے اور مچلنے لگا تو میں نے اسے قابو کر لیا۔ پھر بڑے آرام سے اسے کہا۔

"سکون سے لیٹے رہو میاں، زیادہ مچلے تو کچھ ٹوٹ جائے گا، پھر مت دوش دینا ہمیں۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ سرمد اسے اپنے ہی سیف ہاؤس میں لے گیا۔ اسے لے جا کر ایک کمرے کے ننگے فرش پر بٹھایا تو اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

''دیکھو، تم لوگوں کو بلیک میل کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ظاہر ہے بندہ وہی بلیک میل ہوتا ہے جو غلط کام کر رہا ہو۔ تم کسی کی پگڑی اچھالو، مجھے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ شریف آدمی بے چارہ کیا بولے گا۔ حکومتوں سے مراعات لو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن میرے وطن سے غداری کرو، یہ برداشت نہیں ہے میاں۔'' میں اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''خفیہ سے ہو؟''

''نہیں، خدائی فوجدار ہوں۔'' میں نے جواب

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کہ اب تک تو نے جو بے غیرتی کی ہے، وہ بیان کر دو لیکن جو کہنا، وہ سچ ہو۔'' میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

''دیکھو تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے، میں ایک محبِّ وطن صحافی ہوں اور......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو ایسے نہیں مانے گا۔ تیرا سارا کچا چٹھا میرے پاس آ گیا ہے، وہ دکھا دیا تو پھر تیرا ریشہ ریشہ الگ ہونا فرض ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر بولا۔

''یار میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ایسا کچھ نہیں ہے، غلط فہمی ہو سکتی ہے، اسے دور کیا جا سکتا ہے۔''

''سرمد۔! اسے دکھاؤ کہ اس نے اور اس کے چیلے چانٹوں نے کیا رپورٹ بھیجی ہیں اور اس کے نتیجے میں کیا ہونے والا ہے؟ تو اسے دکھا، میں اس کے پوتے پوتیوں کو لے آؤں۔'' میں نے کہا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''خدا کے لیے انہیں مت لانا، انہیں کچھ مت کہنا، میں بتا دیتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے، اس میں میرا کتنا قصور ہے۔''

''تیری ان رپورٹس پر کتنے لوگ مرنے تھے۔ تجھے پتہ ہے؟ کوئی اندازہ، کتنے بچے اس میں مرنے تھے، کتنے لوگوں کی گود سونی ہو جانی تھی، کتنے یتیم ہو جانے والے تھے۔'' میں ایک دم سے جذباتی ہو گیا اور میں نے گھما کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

''میں نے ایسے تو نہیں چاہا تھا، میں تو جمہوریت کے لیے یہ سب......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر فرش پر پھینک

''جمہوریت کا انسانوں کے قتل سے کیا تعلق بے غیرت، وہ جمہوریت جو یہاں کے جاگیرداروں وڈیروں اور سرمایہ داروں کی لونڈی ہے، جہاں انسان سسک رہے ہیں، اور تیرے جیسے بے غیرت اس ملک فروخت کر رہے ہیں۔ آج تیرے سامنے تیرا بیٹا یا پوتا مارا جائے، اسے زندہ جلا دیا جائے۔ ہاں۔! جلایا جائے لاؤ اس کے بیٹے کو اسے زندہ جلا کر دکھائیں اسے، پھر اسے پتہ چلے گا کہ کیسے اور کس جمہوریت کے لیے کام کر رہا ہے۔ کتنے انسانوں کا لہو پیئے گی تیری یہ نام نہاد جمہوریت؟ جمہوریت کے نام پر تم لوگ جو کھیل کھیل رہے ہو، اب وہ ختم، تیرا بیٹا جلے گا تو اس کے خون کی بو سے تجھے پتہ چلے گا کہ ملک کیا ہوتا ہے، آزادی کیا ہوتی ہے؟'' میں بے حد جذباتی ہو رہا

تھا۔ سرمد میری حالت سمجھ گیا اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر بٹھایا اور اس سے کہا۔

''جو کہنا ہے کہو، ورنہ تیرا بیٹا لینے جا رہا ہوں۔''

''میں سب بتا دیتا ہوں۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میں نے خود پر قابو پالیا۔ وہ کہتا چلا گیا اور میں غور سے سنتا رہا۔ دوپہر ہونے تک اس نے سب کچھ اگل دیا۔

سب کچھ سن لینے کے بعد میں نے صفدر اسماعیل کو کال کی۔ وہ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔ میں نے اسے فوراً ماڈل ٹاؤن والے گھر پہنچنے کو کہا۔ اس نے پندرہ منٹ بعد آجانے کا کہا۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ سرمد نے مجھے وہ ساری رپورٹس دے دی تھیں جو میرے ہاتھ میں تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے شیطان مجھ پر قہقہے لگا رہا ہے۔ کتنے لوگوں کا خون رائگاں جانے والا تھا۔

میرے وہاں پہنچ جانے سے پہلے صفدر اسماعیل پہنچ چکا تھا۔ میں نے رپورٹس اسے تھما کر کہا۔

''یہ لے جاؤ اور شام تک ان سب لوگوں کی گرفتاری ہو جانی چاہئے۔''

''یہ یہاں کے سہولت کار ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔! انہی سے پتہ چلے گا کہ کتنے لوگ آچکے ہیں اور کتنے آنے والے ہیں۔ تین لوگ آج کل میں آنے والے ہیں، انہیں میں خوش آمدید کہوں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رپورٹس دیکھتا رہا، پھر چلا گیا۔

☆......☺......☆

انوجیت سنگھ اوگی پنڈ سے آئے ہوئے لوگوں سے مل کر لاؤنج آ گیا تھا۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی یہاں سے چندی گڑھ کے لیے نکلے گا تو رات تک امرتسر پہنچے گا۔ وہاں سے وہ جہاز پر جا سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی ملازم کو فون کر رہا تھا جو اس وقت امرتسر میں تھا۔ ایسے میں ہرپریت کور اندر سے لاؤنج میں آ گئی۔ انوجیت فون پر بات کر رہا تھا جس کے باعث وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا چاہتا ہے۔ اس نے فون بند کیا تو وہ بولی۔

''پتہ ہے، بے بے جی کہہ رہی ہیں کہ ابھی نہیں جانا، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''او بات تو خیر کی ہے نا؟'' انوجیت نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ، یہ تو وہی بتائیں گی۔''

''اچھا بتاؤ بے بے جی ہیں کہاں؟'' اس نے پوچھا تو وہ بولی۔

''وگی پنڈ گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔''

''اوکے، جب آجائیں تو بتانا، میں تب تک جسپال کے پاس ہوں، اوپر ہی ہے نا وہ۔'' انوجیت نے پوچھا تو ہرپریت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جسپال سنگھ ابھی اپنے اوپر والے کمرے میں تھا اور لیپ ٹاپ میں کھویا ہوا تھا۔ انوجیت اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تو اس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔

''وہ تیرا بلیک میل کرنے والا بندہ اب نہیں رہا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' انوجیت بری طرح چونک گیا۔ اس کی آواز اس قدر اونچی ہو گئی کہ وہ خود سہم گیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ دروازے میں کھڑی ہوئی ہرپریت پر پڑی، جس کے چہرے پر بھی کافی حد تک حیرت تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ یوں ہو گئی جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

''بے بے جی آ گئی ہیں، لاؤنج میں تم دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے آتے ہیں۔'' انوجیت نے کہا تو وہ چلی گئی، تب چند لمحوں بعد جسپال نے کہا۔

''اس کی موت ایک حادثہ کی صورت میں ہوئی ہے

،وہ اپنی کار میں تھا کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے اسے ٹکر مار دی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔"

"لیکن ان کا مقصد تو نہیں مرا، اس کی جگہ کسی دوسرے کو......" انوجیت نے کہنا چاہا تب جسپال نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔

"وہ کسی دوسرے طریقے سے مر جائے گا۔"

"اوہ!" انوجیت صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"جاؤ سنو، پھوپھو کیا کہہ رہی ہیں۔" جسپال نے کہا اور اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے لگا۔ تبھی اس کی نگاہ ایک خبر پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ اس کے امرتسر ہی کے کسی بندے نے اطلاع دی تھی کہ ہرمندر صاحب میں کسی بھی وقت لڑائی کا اندیشہ ہے۔ دو دھڑے آپس میں الجھ رہے ہیں۔ صبح ان کی میٹنگ ہے۔ وہیں پر ہو سکتا ہے ان میں کوئی تصادم ہو جائے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی، جو ہر طرح سے سکھی کے اتحاد کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ وہ چونک گیا۔ اس نے اسی وقت بانیتا کور کو فون کیا جو اس وقت امرتسر ہی میں تھی۔ اس کے ساتھ نوتن کور، سندیپ کور اور گرلین کور تھیں۔

"ہاں بول ویرے، کیا بات ہے؟"

تب جسپال سنگھ نے اپنی بات بتاتے ہوئے کہا

"یہ نہیں ہونا چاہئے، اس سے پوری دنیا میں بدنامی ہو گی۔ اسے روکنا ہو گا۔"

"یہ بڑا سیریس معاملہ ہو گیا ہے۔ چند ماہ پہلے بھی اسی مسئلے پر تلواریں اور کرپانیں نکل آئی تھیں۔ کافی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اصل میں حکومت اس کے پیچھے ہے اور وہی انگریز والا حربہ آزما رہی ہے کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔"

"کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اس کا اصل ذمے دار کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں پتہ کر کے بتاتی ہوں، ویسے اندازہ ہے مجھے، وہی لوگ ہیں جو اس وقت حکومت کر رہے ہیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔" اس نے تیزی سے جواب

"کنفرم، کسی ایک بندے کا نام پتہ کرو، میں بھی پتہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی اس کے سیل فون پر انوجیت کی کال آ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے بلایا جا رہا ہے۔ اس نے فون بند کیا اور نیچے جانے کے لیے اٹھ گیا۔

لاؤنج میں کلجیت کور کے پاس انوجیت بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے صوفے پر ہرپریت تھی۔ چائے لگ چکی تھی۔ وہ ایک تیسرے صوفے پر بیٹھ گیا تو ہرپریت چائے بنانے لگی۔ جب وہ چائے سرو کر چکی اور صوفے پر بیٹھ گئی تب کلجیت کور نے جسپال سنگھ کی طرف دیکھ کر دردمند سے لہجے میں کہا۔

"پتر! اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میری تم لوگوں سے بنتی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے پھوپھو۔" اس نے تیزی سے پوچھا حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ جب مائیں ایسی جذباتی شروعات کریں تو اصل میں مدعا کیا ہوتا ہے۔

"میں نے زندگی میں دکھ بھی بہت دیکھے اور رب جی نے گرو مہاراج کی کرپا سے سکھ بھی بہت دیئے ہیں۔ بس اب تو فرض نبھانا رہ گیا ہے۔ اب تم سب کو شادی کر لینی چاہئے بس۔"

"تو کر دیں، اس میں پوچھنے والی بات کون سی ہے، ان دونوں کے لیے کوئی لڑکی اور لڑکا دیکھا؟" جسپال نے پوچھا۔

"میں نے انوجیت کے لیے لڑکی دیکھ لی ہے، بڑی سندر ہے اور ہرپریت کور کے لیے بھی ایک لڑکا ہے نظر میں۔" یہ کہہ کر اس نے جسپال کا چہرہ دیکھا تا کہ اس کا ردعمل جان سکے، کوئی ردعمل نہ دیکھ کر وہ بولی۔

"اگر تمہاری کوئی مرضی ہے تو مجھے بتاؤ......" کلجیت کور نے کہا اور خاموش ہوگئی۔ تبھی انوجیت بولا۔

" جیسے آپ کی مرضی بے بے جی، جب دل چاہے دن رکھ لیں۔"

"اور تم کیا کہتے ہو پتر؟" کلجیت کور نے جسپال سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جو انوجیت نے کہا، لیکن ابھی میں امرتسر جا رہا ہوں، واپسی پہ......" وہ بولا تو ہرپریت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں۔! دونوں ادھر رہیں گے۔ نہ وہ چنڈی گڑھ جائے گا اور نہ تم امرتسر۔ یہ کام ختم کر کے ہی جائیں گے۔"

"جیسے تمہارا حکم۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا ہوتی کو ڈنر کے بارے میں بتادوں۔"

ہرپریت کور اٹھ کر اندر چلی گئی تو کلجیت کور نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ویسے تو تمہارے بارے میں کون نہیں جانتا، کل وہ لڑکی کے ساتھ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو، بھوپندر سنگھ برار کی بیٹی ہے۔ وہ کل ڈنر ہمارے ساتھ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے بے بے جی، جیسے آپ چاہیں۔" انوجیت نے کہا اور اٹھ گیا۔

بھوپندر سنگھ برار ساتھ ہی کے گاؤں رسول پور کلاں کا ایک بڑا زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ انڈسٹریلسٹ بھی تھا۔ پورے پنجاب کے علاوہ لندن میں بھی اس کا کاروبار تھا۔ وہ سب انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

جسپال کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔ وہ اپنا فیصلہ تو ہرپریت کو سنا چکا تھا۔ اس نے بھی کوئی ردعمل نہیں دکھایا تھا۔ سو وہ بھی خاموش رہا۔

جسپال سنگھ دوبارہ اوپر والے کمرے کے باہر بنے شیڈ پر پڑی کرسی پر آن بیٹھا۔ شام ہونے کو تھی۔ اس کا ذہن کل ہرمندر میں ہونے والے دنگے کی طرف تھا۔ وہ کسی صورت بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ اس نے امرتسر میں موجود اپنے لوگوں کو اس کے بارے میں الرٹ کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی کا جواب نہیں آیا تھا اور نہ ہی بانیتا کور نے کسی سے متعلق کوئی بات کی تھی۔ ایک خاموشی تھی، جس کی وجہ سے جسپال پریشان ہو رہا تھا۔ وہ خود رابطہ کر کے کسی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہاتھ میں سیل فون پکڑے، سوچوں میں گم تھا۔ ایسے میں جمال کا فون آ گیا۔ اس نے کوڈ ورڈ میں یہی بتایا کہ اپنی میل دیکھو۔ وہ اٹھا اور اپنے لیپ ٹاپ تک جا پہنچا۔

اس میل میں پوری تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ دلی ہیڈ کوارٹر سے "را" کے تین ایجنٹ امرتسر پہنچ جانے والے تھے۔ انہوں نے پاکستان آنا تھا۔ وہ تینوں ہی سکھوں کا روپ دھارے ہوئے تھے اور ٹرین کے ذریعے ننکانہ صاحب جانا تھا۔ ان میں ایک کا اصل نام، روہن کمار، جو کرناٹک سے تھا، دوسرا ابنگا ٹکر جو مدھیہ پردیش کا رہنے والا تھا، تیسرا اویناش چوپڑہ جو دھ پور سے تعلق رکھتا تھا۔ ان تینوں کو میجر کنور راٹھور نامی آفیسر نے سرحد پار کا ٹاسک دیا تھا۔ خاص طور پر انہیں اس لیے چنا گیا تھا کہ یہ تینوں پہلے بھی سکھوں کے خلاف کام کر چکے تھے۔ انہوں نے سکھوں کا روپ دھارا ہی اسی لیے تھا کہ وہ انہی میں سے بن کر نہ صرف اندر کی باتیں معلوم کریں بلکہ جہاں کہیں بھی انہیں یہ شک پڑے کہ کوئی خالصتان کے لیے جدوجہد کرنے والا سنگھ موجود ہے، اس کا خاتمہ کرنا ہی ان کی ذمہ داری تھی اور انہوں نے یہ کیا۔ انہوں نے کل کا ایک دن ہرمندر

صاحب میں گزارنا تھا اور کل شام ہی اٹاری سے نکلنا تھا۔ انہوں نے ننکانہ صاحب جانا تھا۔ اس کے بعد ننکانہ رہنے کی بجائے لاہور میں آ کر گم ہو جانا تھا۔ یہاں انہوں نے مختلف مقامات پر بم دھماکے کروانے تھے۔ اگر کوئی پکڑا جاتا تو اس نے خودکشی کرنا تھی، ورنہ اسی طرح سکھ یاتری بن کر واپس بھارت لوٹ جانا تھا۔ ان تینوں کی تصویریں دستیاب نہیں ہو پائی تھیں۔ لیکن مل جانے کی امید تھی۔

سب کچھ پڑھنے کے بعد جسپال سنگھ چونک گیا۔ کل ہرمندر صاحب میں خصوصی طور پر رکھا گیا اردااس اور ان تینوں کی وہاں پر آمد یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بڑی سازش تھی، جو یہاں کے کسی طاقت ور بندے کی مدد ہی سے ہو سکتی تھی۔ دوسری حکومت ہی ہو سکتی تھی۔

جسپال سنگھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ انہیں ہر حال میں پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اس نے بانیتا کور سے رابطہ کیا۔ اسے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے امرتسر آنے کا کہا اور اٹھ کر تیار ہونے لگا۔ اس دوران اس نے امرتسر کے ہیڈ کو اطلاع دے دی کہ وہ پہنچ رہا ہے۔

اس وقت سورج مغربی افق میں ڈوبنے کو تھا، جب جسپال سنگھ تیار ہو کر لاؤنج میں آیا۔ سامنے ہی صوفے پر انوجیت سنگھ اور کلجیت کور بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سکون کا سانس لیا کہ اس کا سامنا ہرپریت کور سے نہیں ہوا۔ وہ کلجیت کور کے پاس جا بیٹھا اور سکون سے کہا۔

''پھوپھو جی، میں ذرا امرتسر تک جا رہا ہوں کل تک واپس آ جاؤں گا۔''

اس کے یوں کہنے پر انوجیت سمیت کلجیت کور نے [illegible] کر دیکھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔

''ٹھیک ہے پتر، جیسے تم چاہو۔''

''ٹھیک ہے پھر، میں چلتا ہوں، ست سری اکال۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر فتح بلاتے ہوئے بولا۔

''ست سری اکال پتر۔ واہگرو کا خالصہ، واہگرو جی کی فتح۔'' کلجیت کور نے کہا تو انوجیت خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جسپال نے جب باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے تو وہ لپک کر اس کے پیچھے گیا اور پوچھا۔

''بھائی جی یہ اچانک......''

''اچانک نہیں ہے چھوٹے، تو فکر نہ کر میں کل اپنی بھابی یہاں آ کر ضرور دیکھوں گا۔'' اس نے انوجیت کا کاندھا تھپتھپایا اور پورچ میں کھڑی فور وہیل میں جا بیٹھا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ جالندھر شہر جا پہنچا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ یہاں نکلتے ہی اس کی نگرانی شروع ہو گئی ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انوجیت کا یہاں ہونا تھا۔ خفیہ والے کبھی بھی اسے یوں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جسپال سنگھ سیدھا مین روڈ جا نکلا۔ وہاں اس نے فور وہیل پارک کی اور بڑے اطمینان سے مال میں چلا گیا۔ وہاں وہ خریداری کے بہانے داخل ہوا اور چیزیں دیکھنے لگا۔ جیسے ہی اس کے سیل پر باہر کھڑی کار کا نمبر آیا وہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ سامنے سیاہ رنگ کی ہنڈائی کھڑی تھی۔ وہ اس میں جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔ وہ جالندھر سے نکلتا چلا گیا۔

جس وقت وہ امرتسر کے مضافات میں پہنچا تو رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ اس دوران ان تینوں کی اصل تصویریں اس تک پہنچ چکی تھیں جو اس نے آگے بھیج دی تھیں۔ وہ سلطان ونڈ بائی سے گذر کر دائیں

ہاتھ پر موجود راجندر کالونی کی جانب مڑ گیا۔ وہیں ایک گھر میں اس کے نیٹ ورک کا ہیڈ انتظار کر رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں وہ وہاں جا پہنچا۔

وہاں ہیڈ کے ساتھ دو لوگ مزید تھے۔ وہ اسی نیٹ ورک کا حصہ تھے۔ انہوں نے میز پر کاغذ پھیلائے ہوئے تھے۔ جس پر ایک سکھ لڑکا پینسل سے تیزی کے ساتھ تصویر بنا رہا تھا۔

"کسی حد تک ان کی تصویریں بنائی ہیں۔" ہیڈ نے ایک تصویر اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ پہلے ان کی اصل تصویر دیکھ چکا تھا۔ اب ان میں روہن کمار سکھ کے روپ میں تھا۔

"ہاں اس سے کچھ اندازہ تو ہو جائے گا، لیکن وہ کس طرح کے ہوں گے یہ حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں صرف ان تصویروں پر انحصار نہیں کرنا ہے۔" جسپال نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ خیر یہ صبح تک مختلف پوز بنا دیں گے۔ جس سے سمجھنے میں آسانی ہوگی، اب ہمیں اجیت نگر چلنا ہے، وہیں باقی دوست بھی ہیں۔" ہیڈ نے کہا تو وہ وہاں سے ہیڈ کے ساتھ نکل پڑا۔

اجیت نگر ہرمندر صاحب کے شمال میں تھا۔ وہی پرانی گلیاں، چھوٹی چھوٹی سی بل دار، جو کسی پلاننگ کے تحت نہیں بنائی گئی تھیں۔ ان گلیوں میں بمشکل چھوٹی گاڑی جا سکتی تھی۔ اس نے اپنی فور وہیل ان گلیوں کے باہر ہی روک دی۔ تبھی ایک نوجوان آگے بڑھا تو ہیڈ سے جسپال نے پوچھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟" جسپال نے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہاں اردگرد سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں، آپ انہیں بریف کر دیں۔ ظاہر ہے انہیں بتانا تو ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔" ہیڈ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" جسپال سمجھ گیا۔

"چابی اگنیشن میں رہنے دیں، یہ لڑکا سنبھال لے گا۔" ہیڈ نے کہا تو وہ دونوں چلتے ہوئے ان ٹیڑی میڑھی گلیوں میں گھس گئے۔ وہ ایک پرانی طرز کے مکان میں داخل ہو گئے۔ جو اندر سے کافی گنجلک تھا۔ کافی سارے کمروں میں سے وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے، جو کافی کشادہ تھا، وہاں قالین بچھا ہوا تھا اور ان پر میٹرس پڑے تھے۔ پانچ سکھ نوجوان وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہیں دیکھتے ہی کھڑے گئے اور ساتھ ہی میں فتح بلا دی۔

"واہ گرو جی کا خالصہ، واہ گرو جی کی فتح۔"

"بھائیو! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا، ہم ابھی یہاں سے نکلیں گے۔ میری اب تک کی رپورٹ کے مطابق وہ تینوں یہاں امرتسر میں پہنچ چکے ہیں۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے، جب تک پوری تسلی نہیں ہو جاتی، تب تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالنا ہے۔ دوسری بات پوری تسلی کرنے کے بعد بھی یہ حتی الامکان کوشش کرنی ہے کہ زندہ ہی رہیں۔ ان کے اندر سے بہت کچھ نکلے گا۔ کیونکہ یہ سکھی کا روپ دھار کر آنے والے ہندو بنیئے کتنا سکھی کو نقصان پہنچا چکے ہیں، کم از کم اس کا اندازہ تو ہو۔" جسپال نے کھڑے کھڑے کہا۔

"اس کے علاوہ کوئی مزید بات؟" اُن میں سے ایک نے کہا۔

"ساری بات آپ کے یہ جتھے دار ہی آپ کو بتائیں گے، یہی آپ کو حکم دیں گے، آپ کے سب کچھ یہی ہیں۔" جسپال نے کہا اور پلٹ کر ہیڈ سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں چلوں، ہمارا رابطہ رہے گا۔"

"جی بالکل۔" ہیڈ نے کہا تو وہ دونوں اس کمرے سے نکلے اور پھر باہر کی جانب چل

پڑے۔ گلیوں سے نکل کر گاڑی تک آئے۔ وہیں سے ان کے راستے جدا ہو گئے۔

جسپال سنگھ کا رُخ حویلی کی طرف جانے کی بجائے اس پوائنٹ کی طرف تھا، جہاں بانیتا کور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ امرتسر کے مہنگے ریستوران میں سے ایک تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور اندر چلا گیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی میں ہلکی روشنی میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ٹیبل پر اسے بانیتا کور کے ساتھ نوتن کور اور گرلین کور دکھائی دیں۔ وہ اس طرف چلا گیا۔ اس نے جاتے ہی فتح بلائی، پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگوں کا سیٹ پورا نہیں ہے؟''

''تم سندیپ کی بات کر رہے ہو؟'' نوتن نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس پر وہ بولی۔

''وہ جالندھر میں ہے۔''

''کیا کرنے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں ایک اسی طرز کا ادارہ بنائیں، جیسا وہ سندیپ کور کا تھا۔ صرف لڑکیوں کے لیے۔ ظاہر ہے وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں بہت کچھ سکھایا جائے گا۔ وہ جو فارم ہاؤس ہے وہاں، اب اس کا ٹاسک اسے دے دیا ہے، اب وہ وہیں رہے گی۔ وہیں کام کرے گی۔''

''چلو یہ اچھا ہوا۔ اب جو منگوانا ہے، جلدی سے منگوالو، مجھے کام سے جانا ہے۔'' جسپال نے آہستگی سے کہا تو بانیتا کور بولی۔

''وہ میں نے تمہارے فون کال کے بعد ہی کہہ دیا تھا۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے؟''

''پہلے تو انہیں تلاش کرنا ہے، اور پھر جو بھی ان کے ساتھ ہو سکا۔'' اس نے اختصار سے کہا۔

''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''بس میرے فون کا انتظار۔ اس سے پہلے اپنے کچھ آدمی الرٹ رکھو، باقی میں دیکھ لوں گا۔'' اس نے جواب دیا تو سر ہلا کر رہ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ سب وہاں سے نکلے۔ ریستوران ہی سے ان کے راستے جدا ہو گئے۔ ان کا انداز ایسے ہی تھا، جیسے وہ سب ملنے ملانے اور کھانا کھانے اکٹھے ہوئے تھے۔ جسپال سنگھ وہاں سے سیدھا ہرمندر صاحب چلا گیا۔ اس نے پارکنگ میں گاڑی پارک کی اور سیدھا ہرمندر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہاں پر ماتھا ٹیکنے اور کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ کمپلیکس کی جانب چلا گیا۔ مین گیٹ پر ہی ایک نوجوان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہاسٹل کے اسی کمرے میں آ گئے، جہاں اس کی ملاقات سردار سرجیت سنگھ بندیال سے ہوئی تھی۔ اس کمرے میں بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہاں پر موجود نیٹ ورک الرٹ ہو گیا تھا۔

''بائی جی، کیا لاؤں کھانے پینے کو؟''

''کچھ نہیں تو بیٹھ میرے پاس۔''

''جی بائی جی۔'' وہ یوں اس کے سامنے دوزانو ہو گیا جیسے وہ کوئی اس کا بزرگ ہو۔

''میں نے تمہیں جو تصویریں بھیجی تھیں ان......'' وہ کہہ رہا تھا کہ نوجوان جلدی سے بولا۔

''اب تک کوئی نہیں آیا یہاں پر، چند لوگ پورے ہرمندر صاحب میں پھر رہے ہیں، انہیں بھی معلوم ہے۔ کل کے بارے میں بھی بڑی ٹینشن ہے۔ اب دیکھتے ہیں۔''

''کل کے بارے میں جو ٹینشن ہے نا، امید ہے وہ نہیں ہوگی، بس تھوڑی دیر ٹھہر جا، پھر اس کے بعد بات کرتے ہیں اس کے بارے میں۔'' جسپال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس نے تجسس سے پوچھا۔
"کوئی حل نکل آیا ہے اس کا؟"
"نہیں ابھی تک تو نہیں، ابھی تو سیاسی طور پر اسے حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ خالصہ کے لوگ ہیں درمیان میں، وہ میٹنگ جیسے ہی ختم ہوئی، اس کے بعد فون آئے گا۔" جسپال نے اسے سمجھایا تو وہ تیزی سے بولا۔
"میری اطلاع کے مطابق، سورن سنگھ ہی اس ساری گھٹنا کا ذمے دار ہے اور اسے وزیراعلیٰ کی پوری آشیرواد حاصل ہے۔"
"بظاہر ایسا ہی ہے لیکن اس کے پیچھے بہت بڑی سازش ہے، تم اسے چھوڑو، یہ میری سردردی ہے، تم نے یہ دیکھنا ہے کہ ان تینوں میں سے جو بھی یہاں داخل ہو، مجھے اطلاع دے دیں۔"
"ٹھیک ہے بائی جی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔
اس نے فیلڈنگ پوری کرلی تھی۔ اب حالات کیا بنتے، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ رات اس کے لیے اس قدر بھاری تھی، جس طرح زندگی اور موت کے درمیان کوئی بہت بڑی آزمائش تھی۔

☆......☺......☆

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ میں جنید کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تیزی سے پیچھے ہٹتی ہوئی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے کار بھگائے چلا جا رہا تھا۔ ہمارا رخ لاہور کے پوش علاقے کی طرف تھا، جہاں وہ صحافی رہتا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق وہ چند منٹ پہلے ہی گھر میں آیا تھا۔ سرمد وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس وقت وہ گھر کے اندر داخل ہوکر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمیں ان تک پہنچتے اتنا زیادہ وقت نہیں لگا۔ انتہائی خاموشی سے سرمد کے لوگوں نے گھر کو اپنے قبضے میں لے لیا ہوا تھا۔ میں جب اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں آمنے سامنے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے آتے ہی سرمد اٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔
"کچھ بتایا اس نے؟"
"میں نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ بولا تو میں اس صحافی کی طرف چند لمحے دیکھتا رہا پھر کہا۔
"زندگی چاہتے ہو یا موت؟"
"کون ہو تم لوگ اور میرے گھر میں گھسنے کی ہمت کیسے ہوئی تم لوگوں کو؟" اس نے انتہائی غصے میں کہا۔
"جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" میں نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اس نے جھٹکے سے میرا ہاتھ ہٹانا چاہا تو میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی اور اسے دیوار کی جانب اچھال دیا۔ وہ دھپ سے دیوار میں لگا اور دہرا ہوکر وہیں گر گیا۔ میں نے اسے اٹھا اور گھما کر پھر زور سے ڈائنگ ٹیبل کی طرف اچھال دیا۔ وہ ایک کرسی پر گرا، جو ٹوٹ گئی۔ اس کا سر ٹیبل میں لگا، جہاں سے خون بہنے لگا۔ میں نے اسے پھر جا پکڑا اور تیسری طرف دیوار میں مارا تو وہ شوکیس میں جا لگا، جس کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ وہ چیخنے لگا تھا۔ تبھی میں نے اسے پکڑا اور زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔
"خاموش۔!"
"تمہیں نہیں پتہ میں کیا کرسکتا ہوں، تم مجھے مار......"
"میں تمہیں مارنے نہیں آیا لیکن مارنے سے دریغ بھی نہیں کروں گا، جب تم ہی نہیں رہو گے تو کرو گے کیا؟" میں نے کہا اور ایک گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ پرے جا گرا۔ تبھی وہ بولا۔
"کیا چاہتے ہو؟"
"ہاں! یہ بات ہوئی نا، بولو، آگے کا پلان کیا ہے، بتا

دو گے تو بچ جاؤ گے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"کون سا پلان، کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے یہ کہا ہی تھا کہ مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی دھنائی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ سرمد جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے کچھ دیر کی کوشش کے بعد اسے ہوش دلایا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں جنونی انداز میں کہتا چلا گیا۔

"وہ تین بندے، جو لاہور میں آ رہے ہیں اور جس کو تم گائیڈ کر رہے ہو، کیا تمہیں نہیں پتہ وہ کیا کرنے آ رہے ہیں؟ انہوں نے جو بم بلاسٹ کرنے ہیں، ان میں کتنے باپ مر جائیں گے، کتنے بچے یتیم ہوں گے، کتنی مائیں نہیں رہیں گی، میں ابھی تمہارا بیٹا تمہارے سامنے جلاتا ہوں، پھر تم ان کا درد محسوس کرنا اور بتانا کہ تماشہ دیکھنا کیسا لگتا ہے؟ جاؤ لاؤ اس کا ایک بیٹا اور کچن میں گیس کھول دو۔"

"نہیں، تم کچھ نہیں کرو گے، جو کہو گے وہی کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تڑپ اٹھا تھا۔

"تو بولو۔" میں نے کہا تو تیزی سے کہنے لگا۔

"تمہیں پتہ ہے یہاں کیسی لڑائی ہے۔ یہاں ایسے لوگ تیار کر دیے گئے ہیں جو یہاں پر دونوں دھڑوں کے لوگوں کو قتل کریں گے اور نام ان دونوں دھڑوں کا لگا کر فساد کو مزید بڑھائیں گے۔"

"یہ مجھے معلوم ہے کوئی نئی بات بتاؤ۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"میرے ذمے تو اتنا ہی ہے، آگے کچھ لوگ ہیں جو یہ سب دیکھتے ہیں۔"

"نام بتاؤ۔"

"وہ سب ڈیٹا، میرے لیپ ٹاپ میں ہے، میں وہ نکال کر دے سکتا ہوں۔" اس نے کہا تب میرے سامنے جنید آ گیا۔ اس کے پاس کافی کچھ تھا۔ تبھی میں نے اس صحافی سے کہا۔

"تو چلو پھر ہمارے ساتھ۔"

میں سرمد کو اشارہ کیا، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب تک میں باہر نکلا، وہ اسے اٹھا کر کار میں ڈال چکے تھے۔

ہمیں سیف ہاؤس تک پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ وقت لگ گیا۔ سرمد تو جاتے ہی کام سے لگ گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کھول کر شمس اور قمر کے ساتھ رابطے میں ہو گیا۔ وہیں اروند اور فہیم تھے۔ جنید اپنے ساتھ لائے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ اگلے دس منٹ میں چند اہم نام سامنے آ گئے جو یہاں سہولت کار تھے اور بہت بڑی سازش تیار کر چکے تھے۔

ان میں دو نام بہت اہم تھے۔ ایک بہت بڑا بزنس مین تھا اور دوسری سوشل ورکر خاتون تھی، یہ اس سازش میں بہت فعال تھے۔ میں نے انہیں اٹھا لانے کو کہہ دیا۔ بزنس مین لاہور کے قریب ہی ٹاؤن کا تھا کا تھا، جبکہ سوشل ورکر خاتون ابھی تک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے کو تو ابھی لایا جا سکتا تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن والی عورت کو لانے میں وقت لگتا۔ صحافی کو صرف اتنی معلومات تھی کہ ایسا ہونے جا رہا ہے۔ یہ سب کیسے ہو گا اور وہ لوگ کہاں پر ہیں، یہ اسے بالکل نہیں پتہ تھا۔ جیسے ہی مجھے اس سازش کا پتہ چلا، میری نیند اڑ چکی تھی۔ شاید اس کے بارے میں پتہ نہ چلتا، اگر اس صحافی کو نہ ٹٹولا جاتا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور صفدر اسماعیل کو فون کر دیا۔ وہ رات کے دوسرے پہر بھی جاگ رہا تھا۔

"جی فرمائیں۔"

"مجھے فوری طور پر دو بندے چاہئیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا تو اس نے تیزی سے جواب

"نام بتائیں۔"

میں نے نام بتائے تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''میں ابھی آپ کو دوبارہ کال کرتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ وہ نام ہی ایسے تھے کہ جن پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کا فون آیا تو وہ بولا۔

''انہیں لانے کے لیے کچھ بندے چلے گئے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں وہ بہت جلد آ جائیں گے۔''

''او کے میں انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اب ان کا انتظار تھا۔

رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جب اس بزنس مین کو لایا گیا۔ وہ فربہ بدن اور ناٹے قد کا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خشخشی داڑھی تھی۔ نین نقش موٹے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی سختی تھی۔ وہ مجھے گھورتا ہوا میرے سامنے آ بیٹھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بڑے سکون سے پوچھا۔

''تمہیں کیا دلچسپی ہے کہ تم اپنے ملک کے خلاف ہو رہے ہو؟''

''کون بہن...... کہتا ہے؟'' اس نے بھاری آواز میں انتہائی غرور سے گالی دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تم کون ہو یہ بات پوچھنے والے؟'' اس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے حقارت سے پوچھا۔

''جو بات پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ زیادہ بکواس نہیں کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو اس نے مجھے حیرت سے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''کیا کہا تم نے، اب تک کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ مجھ سے یوں بات کر سکے، تم......''

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں اٹھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ خون کی ایک دار اس کے منہ سے نکلی۔ وہ ابھی سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری وہ فرش پر لیٹ گیا۔ پھر میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکلتی، کچھ دیر بعد وہ بے دم ہو گیا۔ میں نے اشارہ کیا تو جنید کے ساتھ ایک دوسرے لڑکے نے اسے کھڑا کیا۔ میں نے اسے ٹھوڑی سے پکڑ کر کہا۔

''اب پتہ چلا کون ہوں میں، لیکن چھوڑو، جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔''

''میں نے...... کچھ نہیں کیا...... میں...... کیوں ملک دشمنی...... کروں گا۔''

''اس لیے کہ تیرا بزنس، دوسروں ملکوں کے ساتھ بھارت سے بھی ہو۔ کرو بزنس، کس نے روکا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ملک دشمنی اس حد تک کرو کہ اسے ختم کرنے کی سوچو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے جنید سے کہا ''ایک چھری اور ماچس لاؤ۔''

وہ بزنس مین میری جانب ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں میرے چہرے پر کیا کرختگی تھی، یا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف پھیلنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں میرے سامنے چھری آ گئی۔ میں نے اسے لیا اور اس کی ہتھیلی کھول کر درمیان سے گہرا زخم لگا دیا۔ وہ تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔ پھر میں نے ماچس سے تیلی رگڑی۔ شعلہ جل اٹھا۔ میں اس کی ہتھیلی کو الٹا تو خون ٹپکنے لگا۔ اسی زخم پر میں نے وہ شعلہ لگایا تو وہ مچھلی کی مانند تڑپنے لگا۔

''چھوڑ دو، خدا کے لیے چھوڑ دو، میں بے گناہ ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ چیخنے لگا تھا، تیلی بجھ گئی۔ تو میں نے دوسری جلالی۔ وہ خوف سے کانپنے

لگا۔ میں نے جلتی ہوئی تیلی اس کے سامنے کی اور کہا
"جب بم پھٹتا ہے تو لوگوں کے جسم کٹتے ہیں، جلتے ہیں۔ میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی بدن پر کیا اثر ہوتا ہے کٹنے کا اور جلنے کا۔ یہ دیکھو۔" میں نے دوبارہ تیلی کے شعلے سے اس کی ہتھیلی کو جلانے لگا۔ وہ تڑپنے لگا۔
"میں بتاتا ہوں، میں بتاتا ہوں۔"
"بکو۔" میں نے ختم ہوئی تیلی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔
"میرے ساتھ صرف اتنی ڈیل ہوئی ہے کہ چند غیر ملکی میرے پاس رہیں گے۔ اس کے عوض میری تجارت کسی روک ٹوک کے بغیر ہوتی رہے گی۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ ادھر کیا کر رہے ہیں۔ مجھے تو اپنے بزنس سے غرض ہے۔ میں نے کوئی ملک دشمنی نہیں کی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"ابھی تو تم بہت کچھ مانو گے۔ بتاؤ وہ لوگ کہاں کہاں پر ہیں۔" میں نے پوچھا۔
"وہ لوگ تین دن پہلے چلے گئے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی بھی ادھر نہیں ہے۔ میرا یقین کریں آپ۔ میں ان کے بارے میں ہر تفصیل بتانے کو تیار ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"تجھے پتہ ہے انہوں نے یہاں بم دھماکے کرنے ہیں۔ بے گناہ انسانوں کو مارنے والے ہیں وہ لوگ۔ اس قتل عام میں تم بھی شامل ہو۔" میں نے کہا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"میں نہیں جانتا۔"
"تم بہت کچھ جانتے ہو۔ سب بولو گے۔" میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے پاس کھڑے سرمد سے کہا۔
"اسے ان لوگوں کے حوالے کرو، جو اس کا ریشہ ریشہ الگ کر کے ہر ریشے سے پوچھیں۔ جب تک اس کے بدن کا ہر عضو نہ بولے، اس وقت تک اسے نہ چھوڑیں۔ اسے مرنے بھی نہ دینا اور یہ زندہ بھی نہ رہے۔"
جس وقت میں یہ لفظ کہہ رہا تھا، بالکل اسی وقت ایک دراز قد حسینہ کو کمرے میں لایا گیا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ سفید رنگ، سیاہ گھنے گیسو، متناسب جسم، بھاری سینہ، تیکھے نین نقش، لمبی گردن، کھلے گلے کا لباس پہنے، اسے نائیٹی ہی میں اٹھا لائے تھے۔ جس میں اس کی پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرش پر پڑے بزنس مین کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ بندہ بھی اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ لڑکے اس کے سامنے چیختے چلاتے، منتیں کرتے ہوئے بزنس مین کو گھسیٹ کر لے گئے۔ تبھی میں اس سوشل ورکر عورت سے کہا۔
"بیٹھو بی بی۔ جو پوچھا جائے، اس کا جواب دو، نہیں دو گی تو...... میں نہیں چاہتا کہ تمہارا حال بھی اس بزنس مین جیسا ہو۔"
"میں اب تک نہیں سمجھی کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔ میں قوم کی خدمت کر رہی ہوں، جس کا صلہ یوں بدتمیزی سے دیا گیا ہے۔ مجھے سلیپر تک نہیں پہننے دیئے گئے اور اٹھا کے یہاں لے آئے ہیں۔ آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہو؟" اس نے تیزی چیخنے والے احتجاجی لہجے میں کہا تو میں بولا۔
"یہ آخری بات تم نے ٹھیک کی، کیا چاہتے ہیں ہم۔ تو سنو! کب سے ملک دشمنی کر رہی ہو؟"
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا، کیوں کروں گی ملک دشمنی، یہ میرا وطن ہے اور میں......"
"بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ، کتنے غیر ملکی ہیں جن

کے ساتھ تمہاری ڈیل ہے۔"

"ڈیل کیا مطلب؟ میری این جی او کا معاہدہ ہے کچھ عالمی تنظیموں کے ساتھ، وہ لوگ یہاں کے کلچر، ثقافت اور غربت پر کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ یہاں آتے ہیں، میں انہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کرتی ہوں۔ اس کے عوض وہ ہمیں ادائیگی کرتے ہیں۔"

"کتنے ملکوں سے ہیں؟"

"کئی ملکوں کے نمائندے ہیں۔" اس نے بے پروائی دکھاتے ہوئے جواب دیا تو میں چونک گیا۔

"تم جانتی ہو کہ جب بم پھٹتا ہے تو جلتے بھی ہیں اور انہیں زخم بھی آتے ہیں۔ مر جاتے ہیں بے گناہ لوگ، جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے چھری اٹھالی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا مطلب؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کلائی پر ایک گہرا زخم لگا دیا۔ وہ بے تحاشا چیخی۔ گالیاں بکنے لگی۔ میں نے اس پر دھیان دیئے بغیر ماچس سے تیلی جلائی اور اس زخم والی جگہ کو شعلے سے جلانے لگا۔ وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگی۔ وہ گالیاں بھول گئی تھی۔ اس کی چیخوں سے کمرہ جیسے بھر گیا۔ تیلی بجھ گئی تو میں نے نئی جلالی۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"ان سب کی تفصیلات، جنہیں تم سہولت فراہم کرتی رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"میں بتاتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ تو میں نے جنید کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائیں۔ وہ اسے وہاں سے لے گئے۔

اس وقت میرا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔ میں کھلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک کپ چائے کا کہا اور چھت پر آ گیا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ میں نے چھت پر آ کر گہری گہری سانسیں لیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو پانا تھا۔ چند لمحے ٹہلتے رہنے کے بعد میں چھت کے فرش پر بیٹھ گیا۔

اس وقت میرے دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ پتہ نہیں کتنے غیر ملکی ہیں جو یہاں آ چکے ہیں۔ اتنے لوگ کیوں ہیں یہاں پر؟ اگر یہ لوگ دشمن ملک سے ہیں تو وہ کئی ملکوں کے لوگ یہاں کیوں اکٹھا کریں گے؟ کیا یہ صرف بم دھماکے چاہتے ہیں تو ان کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے اس دہشت گردی سے جو دشمن فائدہ اٹھائے گا، لیکن کیا اتنے سارے ملک پاکستان کے خلاف اکٹھا کر چکے ہیں؟ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ ممکن ہے یہ بم دھماکے والی بات سامنے کی ہو لیکن اس کے پیچھے کچھ دوسرا ہی چل رہا ہو۔ انہیں لمحات میں جب کہ میں انتہائی الجھن میں تھا۔ چھت کے فرش بیٹھا ہوا تھا۔ میری دونوں ہتھیلیاں بند تھیں۔ میری کلائیاں میرے گھٹنوں پر تھیں، بالکل ایسے جیسے کوئی یوگا کا آسن لگا کر بیٹھتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے سامنے کا اندھیرا چھٹ گیا۔ یوں جیسے اسکرین روشن ہو جاتی ہے۔

میرے سامنے رات کا منظر تھا۔ درختوں میں گھری ایک عمارت تھی، جس کے پس منظر میں سیاہ آسمان تھا۔ وہ عمارت روشن تھی۔ اس عمارت کی کئی کھڑکیاں تھیں، جن میں سے پیلی روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اسی روشنی میں درختوں کے گہرے سبز پتے تھوڑے تھوڑے روشن تھے۔ ان کئی ساری کھڑکیوں میں دو کھڑکیوں کے اوپر کئی رنگوں کی روشنیاں تھیں۔ نیلی پیلی، نارنجی، سبز، جامنی نجانے کتنی لکیریں، یوں جیسے کوئی آسمان کی طرف ٹارچ کرے تو ایک حد تک جا

کر روشنی غائب ہوجاتی ہے۔ وہ مختلف رنگوں کی روشنی کی لکیریں غائب نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ تاحد نگاہ دکھائی دی رہی تھیں یا جیسے مختلف سرچ لائیٹس کی روشنیاں گھوم کر ایک دوسرے میں پیوست ہوئے بنا آسمان کی جانب لکیر بناتی ہیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کئی روشنی کی لکیریں جا رہی تھیں اور کئی آرہی تھیں۔ مجھے ان کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ دو کھڑکیوں ہی سے کیوں؟ اچانک مجھے لگا، جیسے ان لکیروں کے ساتھ کوئی اوپر چڑھ رہا ہے، اور کوئی اتر رہا ہے۔ میں نے مزید غور کیا تو وہ بھیانک شکلوں والے جانور تھے۔

"یہ چائے......"

اس آواز سے میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے جنید کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا مگ تھا۔ اس کے پیچھے سرمد تھا جو چھت پر پڑی پلاسٹک کی کرسیاں قریب کر رہا تھا۔ ہم تینوں بیٹھ گئے تو چائے پینے کے دوران انہوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ بات صرف دھماکوں تک محدود نہیں پس منظر میں کچھ اور بھی ہے۔

"پھر کیا کیا اب تک تم لوگوں نے؟" میں نے پوچھا تو جنید بولا۔

"ہم جب انہیں اٹھا کر لائے تھے تو آتے ہوئے ان کا بہت کچھ اٹھا لائے ہیں، خاص طور پر لیپ ٹاپ اور ایسی کئی چیزیں، جن سے کچھ پتہ چلے۔ اب تک ان دونوں کے قریب ترین لوگ بھی اٹھا لیے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سیف ہاؤس میں رکھا ہوا ہے۔ اب دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔"

"اب تم لوگ درست سمت میں سوچ رہے ہو، سامنے کا منظر کچھ اور ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، پتہ لگائیں۔" میں نے کہا اور چائے کا آخری سپ لے کر مگ جنید کو واپس کر دیا۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ میں نے دوبارہ آسن جمایا۔ لیکن بند آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی رہا۔ میں چند منٹ یونہی بیٹھا رہا۔ جب کچھ نہ دکھائی دیا تو اٹھ گیا۔

اس وقت مشرق میں پوہ پھٹ رہی تھی۔ جب سرمد نے فون کر کے مجھے نیچے بلایا۔ میں تیزی سے نیچے گیا۔ جنید اور سرمد دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر انتہائی گہری سنجیدگی تھی۔ میں نے اس کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے تفصیل بتانی شروع کر دی جو انہیں اب تک کی محنت کے بعد پتہ چلا تھا۔ میں نے سنا تو چونک گیا۔

وہ ایک خوف ناک سازش تھی۔ "را" نے انتہائی بڑے پیمانے پر سرمایہ خرچ کر کے دنیا بھر سے چند ذہین ترین مجرم اکٹھے کر لیے تھے۔ ان کی باقاعدہ تربیت کی گئی تھی۔ انہیں پاکستان میں صرف اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ ایٹمی مرکز تک رسائی کا ذریعہ تلاش کریں۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے، اسے ختم کرنے کے لیے معلومات اکٹھی کریں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ملک بھر میں افراتفری کا ماحول بنانے، سیکورٹی قوتوں کو ایک طرف متوجہ رکھنے پر مجبور کرنے کے لیے بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کرنے جا رہے تھے۔ وہ کئی ماہ سے یہاں موجود تھے۔ ثقافت، غربت اور نجانے کس کس نام سے کام کرنے کی آڑ میں انہوں نے اب تک یہی رسائی حاصل کی تھی۔

"وہ لوگ اب کہاں ہو سکتے ہیں؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تو مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

"اب تک یہی پتہ چلا ہے کہ وہ ان کے پاس سے جا چکے ہیں؟" جنید نے تیزی سے کہا۔

"پتہ کرو، کہاں ہیں، وہ ابھی ملک سے باہر نہیں جا

سکتے ، ان کا کام ابھی ادھورا ہوگا۔ وہ یہیں ہوں گے۔"میں نے کچھ ایسے اعتماد سے کہا کہ انہوں نے مزید سوال نہیں کیا۔ وہ پلٹ گئے ۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ان سب غیر ملکیوں کو تلاش کرنے میں سارے ذرائع استعمال کریں گے۔

☆......☺......☆

سورج کی روشنی سے امرتسر روشن ہو گیا ہوا تھا۔ ہر مندر صاحب کے صحن میں صبح کی کرنیں اتری ہوئی تھیں۔ یاتری اپنے اپنے انداز میں اپنی عبادت میں مصروف تھے۔ حکم نامہ جاری ہو چکا تھا۔ ایک ٹھہراو سا آچکا تھا۔ ایسے میں جسپال سنگھ ہوسٹل کی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

ساری رات نگرانی کرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک ان تینوں کے بارے میں معلوم نہیں کر پائے تھے۔ جسپال سنگھ کو ان کے بارے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب یہاں نہیں آنے والے۔ جس تصادم کی اطلاع تھی، وہ ٹل گیا تھا۔ سیاسی طور پر بات چیت کے ذریعے اس تصادم کو روک لیا گیا تھا۔ جس بات پر نزاع تھا۔ اسے بعد میں حل کرنے کا وعدہ کرلیا گیا ہوا تھا۔ جس طرح انہیں تصادم کی خبر ملی تھی، اسی طرح تمام خفیہ لوگوں تک یہ اطلاع آناً فاناً پھیل گئی تھی۔ دونوں طرف سے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ہی رات سے امرتسر میں موجود تھے۔ یہ تصادم حکومتی سطح پر حکمرانوں کے خلاف جانے والا تھا۔ انہوں نے سارے مطالبات مان لیے اور وقتی طور پر یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

اردگرد سے آتی ہوئی جتنی قوتیں تھیں۔ اب ان کا کام نہیں رہا تھا مگر جسپال سنگھ کے لیے وہ تین لوگ سب سے بڑا مسئلہ تھے۔ اگرچہ ان تین لوگوں کا کام ہرمندر صاحب میں نہیں تھا، انہیں سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستان جانا تھا۔ انہوں نے اٹاری پہنچنا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ امرتسر میں آئے ہی نہ ہوں۔ وہ اب تک شہر ہی سے کہیں باہر ہوں۔ بہت کچھ سوچتے رہنے کے بعد جسپال سنگھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں تلاش کیسے کرے۔ اروند اور فہیم کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ ابھی تک سرحد پار نہیں کر سکے۔ لہٰذا اٹاری اور اس کے گردونواح کو دیکھا جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنی بڑی آبادی والے شہر اور پھر امرتسر سے اٹاری تک وہ انہیں کیسے تلاش کر سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ہاسٹل کے کمرے تک گیا۔ وہاں وہی نوجوان اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"وہ لوگ اٹاری پر ہی ظاہر ہوں گے۔" اس نوجوان نے کہا تو جسپال سنگھ نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔

"یار، وہ عام یاتریوں کی طرح ہی یہاں سے نکلیں گے۔ وہ کسی نہ کسی جتھے کے ساتھ ہوں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہاں کے ٹریول ایجنٹس سے ان کے بارے میں کچھ پوچھ سکیں۔"

"یوں تو یہ کام کرنے والے بہت سارے لوگ ہیں لیکن یہاں چند گنتی کے لوگ ہیں جو ٹاپ کے ہیں، ان سے پوچھ تاچھ کی بھی گئی تو وہ تینوں الرٹ ہو جائیں گے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ اٹاری پر جا کر ہی ڈیرے لگائے جائیں۔" جسپال نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

"وہیں انہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ امیگریشن ہو گئے تو ہم ان تک نہیں پہنچ پائیں گے۔" نوجوان نے تیزی سے کہا تو جسپال اٹھتے ہوئے بولا۔

"لو پھر میں جا رہا ہوں۔ کچھ کرتے ہیں ان کا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا اور ہوسٹل سے نکلتا چلا گیا۔

اس وقت وہ رتن دیپ سنگھ کی حویلی پہنچا تھا۔ جہاں بانیتا کور موجود تھی۔ وہ اس کے ساتھ اسی کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس دوران وہ اسے اپ ڈیٹ دے چکا تھا۔ تب بانیتا کور نے کہا۔

''او جسپال تو ان کے لیے اتنا پریشان نہ ہو۔ وہ اگر پاکستان چلے گئے تو وہاں انہیں......''

''بے وقوفوں والی بات مت کر، انہیں یہیں ختم کرنا ہے، اگر ہم انہیں یہاں ختم نہ کر سکے تو پھر ہمارا ہونا تو نہ ہوا نہ پھر۔'' جسپال نے غصے میں کہا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔'' جسپال نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''کیا ہے؟''

''اروند اور فہیم سے بات کرو، لیپ ٹاپ لاؤ۔'' جسپال نے تیزی سے کہا تو بانیتا کور سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا لیپ ٹاپ اٹھا لائی۔ کچھ دیر بعد ان سے رابطہ ہو گیا۔ اس وقت ان کے پاس شمس و قمر بھی تھے۔

''یار مجھے یہ بتا، اگر تم لوگ امیگریشن پر کلیئر لوگوں کا ڈیٹا، اُن کے کمپیوٹر سے دیکھ سکتے ہو۔''

''ہاں ممکن ہے، وہاں کئی ساری جگہوں سے لوگوں کو کلیئر کرتے ہیں، جو سب ایک مین کمپیوٹر میں جاتا ہے، یہ ممکن ہے۔'' اروند نے جواب دیا۔

''تو پھر ان تینوں کو تلاش کرنے میں مدد دو۔'' جسپال نے کہا تو اروند بولا۔

''کیا کرتے ہو یار، ان کی تصویریں تک نکال کر دے دی ہیں اب......'' یہ کہتے ہوئے وہ اچانک رک گیا، پھر تیزی سے بولا۔

''مطلب تم انہیں کلیئر ہو جانے کے بعد پکڑنا چاہتے ہو۔''

''بالکل۔! یہ جو تم نے تصویریں بھیجی ہیں بے کار ہیں۔ انہوں نے تو بھیس بدلا ہوگا اور نہ ہی ان کا یہ نام ہے کہ جن سے وہ ننکانہ صاحب جا رہے ہیں، نام بھی جعلی ہوں گے۔'' جسپال نے کہا تو شمس بولا۔

''جسپال بھائی تم اگلا کام بتاؤ، یہ میری ذمہ داری کہ میں ان تینوں کو کلیئر ہوتے ہی آپ کو بتا دوں۔''

''اگلا کام میں خود کر لوں گا، تم بس اس وقت مجھے بتا دو، جیسے ہی وہ کلیئر ہوگا میں بتا دوں گا کس گیٹ سے کون جا رہا ہے۔ یہ کر لو گے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''ہو جائے گا۔'' شمس نے کہا۔

''کیسے؟'' جسپال نے پھر پوچھا۔

''دیکھو، اس کی تصویر کے ساتھ جو بندہ بھی میچ ہوا، وہ وہی ہوگا۔ وہ جس روپ میں بھی ہوا۔'' شمس نے بتایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں کچھ دیر بعد رابطہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جسپال نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''یہ کیسے، جب وہ لوگ امیگریشن کے بعد اندر چلے گئے تو تم لوگ کیسے جا سکو گے؟''

''تم دیکھنا، کیا کرتا ہوں میں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے نیٹ ورک میں وہ بندے تلاش کرنے شروع کر دیئے جو کسی نہ کسی حوالے سے اٹاری پر کام کرتے تھے۔ وہ اس وقت خوشی سے بھر گیا جب اسے، وہیں اسٹیشن پر کام کرنے والے دو بندے مل گئے۔ وہیں قریب کے گاؤں کے کچھ لوگ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قریب ترین لوگوں کو ایک خفیہ میسج دے دیا کہ ان میں سے کون کون ننکانہ صاحب جا رہا ہے۔ ان میں سے چند لوگ تھے جو اس وقت پورے خاندان یا پھر اکیلے جا رہے تھے۔ اگلے دس منٹ میں اس نے تین نوجوان چن لیے جو اس وقت امرتسر ہی میں تھے۔ انہیں کچھ دیر بعد اٹاری چلے جانا تھا، وہ اس وقت ایک ہرمندر صاحب میں، دوسرا قریب کے بازار میں اور

تیسرا ایک ہوٹل پر کھانا کھا رہا تھا۔ان تینوں کو ہر مندر صاحب میں موجود ایک مخصوص جگہ بلالیا گیا۔

وہ تینوں جسپال سنگھ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ۔ان سب کو اکٹھے ہونے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ اس وقت کس سے بات کرر ہے ہیں۔وہ سب خالصتان پر اپنی جان وار دینے کی قسم کھائے ہوئے تھے ۔جسپال سنگھ نے ایک چھوٹی سی بات کے بعد انہیں سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ یہاں پر بیٹھ کر کھائی جانے والی قسم سے کوئی بھی سکھ نہیں پھر سکتا تھا۔تبھی جسپال سنگھ نے غیر محسوس انداز میں انہیں تین سیل فون دیئے اور سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہر فون میں صرف میرا نمبر محفوظ ہے۔اس پر میری ہی کال آئے گی ۔ میں جو کہوں،اس کے مطابق پھر جو سمجھ میں آئے کرنا۔ جونہی کام ختم ہو، مجھے اطلاع کرکے فون پھینک دینا۔اب ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔''

یہ کہتے ہی جسپال وہاں سے اٹھ گیا۔دوسرے بھی ایک ایک کرکے وہاں سے نکل گئے۔

یہ سارے انتظامات کرتے ہوئے دوپہر ہوگئی۔ اٹاری اسٹیشن کے اردگرد کئی سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔وہ سب براہ راست امرتسر کے ہیڈ جتھے دار سے رابطہ میں تھے۔جسپال سنگھ نے پارکنگ سے اپنی فور وہیل لی اور پارکنگ سے نکلتے ہوئے بانیتا کور کو فون کردیا۔وہ اسی کے انتظار میں تھی۔

''میں ہر مندر صاحب سے نکل رہا ہوں۔ مجھے.....''اس نے کہنا چاہا لیکن بانیتا کور نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''کام ہوگیا؟میں آؤں؟''

''ہاں فیلڈنگ ساری لگ گئی ہوئی ہے۔تم فوراً وہ ''ہتھیار'' لے کر آجاؤ،ہیڈ جتھے دار تک پہنچانے ہیں۔ فوراً آجاؤ،وقت کم ہے۔''

''میں آرہی ہوں۔''

''تم سیدھی اٹاری روڈ کے پہلے فلنگ اسٹیشن پر انتظار کرو۔''

''اوکے۔''اس نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

اٹاری روڈ پر پہلے ہی دائیں جانب ایک فلنگ اسٹیشن تھا۔بانیتا کور کی کار وہیں کھڑی تھی۔اس کے ساتھ گرلین کور اور نوتن کور بھی تھیں۔وہ جسپال سنگھ کے ساتھ بیٹھیں تو ڈرائیور کار کو واپس لے گیا۔یہ اٹاری کی جانب چل پڑے۔چند منٹوں میں اس نے ساری صورت حال اسے بتادی۔

''وہ سب سنبھال لیں گے نا؟''بانیتا کور نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''اب دیکھیں کیا کرتے ہیں وہ،لیکن اتنی دیر ہم یہیں امرتسر کے آس پاس رہیں گے اور ہمیں فوری طور پر ہتھیار پہنچانے ہیں۔''

اس پر وہ خاموش ہوگئی۔

اس وقت دن کے دو بجے ہوئے تھے۔ٹرین کب چلتی اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔لیکن چار بجے تک ساری امیگریشن ہو جانا تھی ۔ وہ بیس منٹ میں اٹاری پہنچ گئے ۔ انہیں جتھے دار سے ملنے میں وقت نہیں لگا۔وہ ''ہتھیار''انہیں دے دیئے تو بانیتا کور نے اسے اٹاری روڈ پر اپنے فارم ہاؤس پر چلنے کو کہا۔وہ کچھ دیر بعد وہاں پر پہنچ گئے۔

ابھی وہ جا کر بیٹھے ہی تھے اروند کا فون آگیا۔اس نے بتایا کہ کچھ وقت رہ گیا ہے ان سب کو کانفرنس کال میں لے لو،جیسے ہی کوئی امیگریشن سے فارغ ہوا اس کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔جسپال سنگھ نے سب کو کانفرنس میں لے لیا۔وہ تین نوجوان امیگریشن کے بعد ریلوے اسٹیشن پلیٹ فارم پر تھے۔وہ وہاں کی

صورت حال بتاتے رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک اروند سنگھ نے

”وہ اویناش چوپڑا، اس وقت گیٹ نمبر تین پر موجود ہے، اسے کلیئر کیا جا رہا ہے، میں نے اس کی تصویر میچ کر لی ہے۔“

”کون ہے تین نمبر گیٹ کے پاس؟“ جسپال نے پوچھا تو ایک نوجوان نے

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں جی، تیکھے نقوش والا گورا سنگھ وہاں کھڑا ہے۔“

”بس وہی ہے، تم اسے نگاہوں میں کر لو۔ وہ ارون سنگھ کے نام سے ہے۔“ جسپال نے

”ہو گیا جی، اب وہ میری نگاہوں سے نہیں بچ سکتا، وہ کب تک ......“ اس نے ہتھیار کے بارے میں پوچھا تو جسپال نے کہا۔

”ابھی پہنچ جائے گا۔“

اسی لمحے روہن کمار بھی گیٹ نمبر تین ہی سے کلیئر ہو رہا تھا۔ وہ روہیت سنگھ کے نام سے تھا۔ اسے دوسرے نوجوان نے اپنی نگاہوں میں کر لیا۔ گیٹ نمبر دو سے بنگا ٹکرا آیا۔ وہ بھی سنبھال لیا گیا۔

وہ تینوں اسے پل پل کی خبر دے رہے تھے۔ کانفرنس میں امرتسر کا ہیڈ جتھے دار بھی تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اسے اندر کی صورت حال کے بارے میں پتہ چلا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر ہی ایک کھانے پینے کی شاپ تھی۔ وہ تینوں ہی ہراس بوگی کی جانب بڑھ گئے تھے، جہاں روہن، بنگا ٹکرا اور اویناش جا کر اپنی اپنی بوگی میں بیٹھے تھے۔ وہ تینوں الگ الگ بوگی میں تھے۔ وہ یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں۔ ہیڈ جتھے دار نے انہیں سمجھا دیا ہوا تھا کہ وہاں جا کر جو چیز بھی خریدیں، انہیں آدھا تقسیم ہوا پھٹا نوٹ دینا ہے۔ پہلے ٹیپ مانگنی ہے، پھر وہ نوٹ انہیں دے دینا ہے اور واپس آ جانا ہے۔

دی گئی ہدایت کے مطابق ان میں سے ایک نوجوان اس شاپ پر چلا گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر سنگھ کھڑا تھا۔ اس نے ویسا ہی کیا، جیسے کہا تھا۔ اس نے وہ نوٹ رکھ کر چیزیں دے دیں۔ وہ نوجوان واپس چلا آیا اور واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزری تھی ایک لڑکا اس کے پاس آ کر باہر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک چھوٹا بیگ اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے لے کر رکھ لیا۔ وہ لڑکا چند لمحوں ہی میں غائب ہو گیا۔

وہ نوجوان سنگھ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بیگ کھول کر دیکھا۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی ڈبیہ پڑی ہوئی تھیں۔ کانفرنس میں موجود سب کو پتہ چل گیا کہ ان تک وہ ”ہتھیار“ پہنچ گئے ہیں۔ جن سے انہوں نے قتل کرنا تھا۔ اس نے بیگ سے ایک ڈبیہ اٹھائی اور سنبھال لی۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان آیا۔ اس نے وہ بیگ اسے دے دیا۔ یوں تیسرے تک بھی وہ ”ہتھیار“ پہنچ گیا تھا۔

وہ ہتھیار اصل میں ایک زہر آلود سوئی تھی۔ اس سے بندہ ایک دم نہیں مرتا تھا، بلکہ اسے گہری نیند آتی تھی اور پھر وہ نیند ہی کی حالت میں موت کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ زہر آلود سوئیاں رام لعل جوگی کے بیٹے نے انہیں دی تھیں۔ وہ تب سے ان کے پاس پڑی تھیں۔ اس نے یہ نوتن کو دی تھیں، جب وہ اس سے ممبئی میں ملی تھی۔ اس نے ایک طرح سے جسپال سنگھ کو تحفہ دیا تھا، جو بانیتا کور کے پاس امرتسر ہی میں پڑا رہا جو اب کام آنے والا تھا۔

سہ پہر ہو جانے کو تھی جب ٹرین چلنے کو تھی۔ ایسے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جسپال سنگھ سن رہا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ گئے تھے اور وہ ان

کے سروں پر پہنچ گئے۔ جیسے ہی ٹرین چلنے لگی۔ وہ ایک ہلکا سا جھٹکا تھا، لیکن تینوں نے وہ جھٹکا کچھ زیادہ ہی محسوس کیا۔ وہ ان کے اوپر گر گئے۔ کسی نے گالی بکی ،کسی نے برا بھلا کہا، کوئی خاموش رہا۔ وہ اپنا کام کر کے واش روم میں گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے سیل فون پھینک دیئے، جو نیچے سرک گئے۔ وہ خاموشی کے ساتھ واپس اپنی اپنی سیٹوں پر واپس آ کر بیٹھ چکے تھے ۔انہوں نے کام کر دیا تھا۔ وہ اٹاری روڈ والے فارم ہاؤس سے نکل آئے تھے۔ مین روڈ پر آتے ہی جسپال سنگھ نے وہ فون سڑک کے ایک جانب پھینک دیا۔ تب بانیتا کور نے خاموشی توڑی۔

''جسپال۔! ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ مر گئے ہیں ،یا زندہ ہیں؟ اگر ان میں ایک بھی زندہ رہا تو......'' اس نے گہری تشویش کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب جسپال مسکراتے ہوئے بولا۔

''اروند نے مجھے ایک بات سمجھائی ہے کہ بیک اپ رکھتے ہیں۔ ان تین نوجوانوں کی نگرانی پر تین نوجوان اور ہیں۔ وہ ہمیں بتائیں گے۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال میں وہ ہمیں اپ ڈیٹ کریں گے ۔ہیڈ جتھے دار کے الگ بندے جا رہے ہیں اسی ٹرین میں۔ ڈونٹ وری۔''

''ربّ کرے ویسا ہی ہو جیسا تم نے سوچا ہے۔'' بانیتا کور نے کہا تو اس نے پوچھا۔

''اب میں نے اوگی جانا ہے۔ چلو گی؟''

''ہاں ضرور میں بھی چلوں گی۔''

تب جسپال سنگھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ وہ امرتسر سے نکل کر سلطان ونڈ بائی پاس سے جالندھر کی جانب مڑ گیا، تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد جب شام کے سائے پھیل گئے وہ جالندھر پہنچ گیا۔ اوگی کی جانب، مڑتے ہی اس نے فور وہیل روک دی اور بانیتا کور کو ڈرائیونگ کے لیے کہا۔ وہ اسٹیئرنگ پر آ بیٹھی۔ جسپال سنگھ نے جتھے دار کو فون ملایا۔

''ہاں، کیا بنا؟''

''ہو گیا کام، گاڑی نہیں روکی گئی، اب تو وہ واہگہ ہی جا کر رُکے گی۔ ان کے مرنے کا پتہ اس وقت چلا جب وہ پاکستان کی حدود میں پہنچ چکے تھے۔''

''یہ بہت اچھا ہوا۔ چلیں اب سنبھال لیں آپ۔'' جسپال نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت اس نے اپنے خاص فون سے اروند سنگھ سے رابطہ کیا اور اسے بتاتے ہوئے سمجھایا

''اس میجر کنور راٹھور تک بات پہنچ جائے کہ ویرتا نے اس کا پلان تباہ کر دیا ہے۔''

''ابھی کچھ دیر میں پہنچ جاتی ہے۔'' اروند نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شام کے سائے پھیل گئے تھے، جب وہ اُوگی پنڈ پہنچ گیا۔ حویلی کے پورچ میں دو قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے پورچ کی بجائے فور وہیل دوسری جانب لگائی اور اندر چلا گیا۔ اسے لگا جیسے لاؤنج بھرا ہوا ہے۔ بھوپندر سنگھ براڑ اپنی پوری فیملی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ سب سے ملا، انہیں فتح بلائی اور واپس آنے کا کہا۔ ہرپریت کور جلدی سے اٹھی اور بانیتا کور کو اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔

☆......☺......☆

کسی بھی بڑے منصوبے کی تکمیل مختلف حصوں میں کی جاتی ہے۔ ہر حصے والے کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی دوسرا حصہ بھی ہے۔ وہ اپنے حصے کو ہی حتمی سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ کچھ ایسا ہی تھا ۔وہ بزنس مین اور سوشل ورکر خاتون، صرف اپنے مالی فائدے کے لیے ان کے سہولت کار بن گئے تھے۔

انہیں اصل منصوبے کے بارے میں گمان تک نہیں تھا ۔ان کی یہ سچائی اس بات سے ثابت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انہوں نے وہ سب بتا دیا جوان کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے وہ سارے لوگ بتا دیئے جوان کے ساتھ منسلک تھے۔اس ساری پکڑ دھکڑ میں صرف یہی خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ الرٹ ہو کر زیر زمین نہ چلے جائیں جو اس منصوبے کے بالکل آخری مرحلے میں پہنچے ہوئے ہیں۔

یہ پہر تک یہ تصدیق تو ہوگئی تھی کہ یہ کتنا خوفناک منصوبہ تھا لیکن یہ نشاندہی نہیں ہو پائی تھی کہ اب وہ لوگ کہاں پر ہیں؟ پچھلے دو گھنٹے سے کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

میرے دماغ میں وہ منظر تھا جو مجھے دکھایا گیا تھا۔ ایک ذرا سی نشاندہی مجھے تھی کہ وہ لوگ ایسی جگہ ہو سکتے ہیں جہاں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں اوران میں سے دو کھڑکیاں ایسی ہیں جہاں وہ موجود ہو سکتے ہیں۔ میں کسی کو بھی اپنے اس دیکھے گئے منظر کے بارے میں بتا نہیں سکتا تھا، لیکن اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ وہ ایسے ہی طرز کی کسی عمارت میں ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک رسک تھا۔ چونکہ معاملہ ایٹمی تجربہ گاہ کا تھا، اس لیے وہ اسی راڈس میں ہونے کا امکان رکھتے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کہیں دور ہوں۔ اس ساری تلاش میں سب سے پہلے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے گئے۔ گیسٹ ہاؤس اور ایسی نجانے کتنی عمارتیں۔ یہاں تک کہ شام کے سائے پھیل گئے۔

اسی تلاش میں خبر یہ ملی کہ ایک بڑا ہوٹل، جس کی چھ منزلیں ہیں، اس میں سب سے اوپر والی منزل ایک غیرملکی نے پچھلے دو ماہ سے بک کی ہوئی ہے۔ وہ سرمایہ دار ہے اور یہاں کاروبار کے مواقع دیکھنے کے لیے موجود تھا۔ وہ کبھی یہاں ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ اس کے ذاتی نوعیت کے تعلقات ملک کے بڑوں سے تھے۔ اس لیے اسے کافی مراعات مل چکی تھیں۔ اس کی اپنی سیکورٹی تھی۔ جیسے ہی میں نے اس بارے سنا، میں نے اس ہوٹل کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند لمحوں بعد لیپ ٹاپ پر مجھے اس کی تصویر دکھائی تو میں چونک گیا۔ وہ منظر بالکل اسی کے جیسا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے ڈن کر دیا کہ دشمن یہیں ہے، اسے فوری طور پر پکڑنا ہوگا۔

جو میرے لوگ تھے، وہ فوراً منصوبہ بندی کرنے لگے کہ کس طرح وہاں حملہ کرنا ہے، لیکن فورسز کے لوگ ہچکچانے لگے۔ میں نے صفدر اسماعیل سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر اپنے بڑے سے ملواؤ۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

چونکہ مجھے یقین تھا، اس لیے، میں نے پوری تیاری کر لی ہوئی تھی۔ سرمد اور میں نے اس پر پوری بات کر لی تھی۔ وہ بالکل تیار تھا۔ اس نے فورس بھی تیار کر لی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد صفدر اسماعیل مجھے لینے خود آ گیا۔ میں نے جنید کو ساتھ لیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا رخ ائر پورٹ کی طرف تھا۔

ہمارے پہنچتے ہی کچھ لوگ ہمیں دیکھ کر آگے بڑھے۔ درمیان میں کسی رکاوٹ کے بغیر ہم کار کے ذریعے وہاں تک جا پہنچے، جہاں پر ایک ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ جیسے ہی ہم تینوں اس میں بیٹھے، وہ اسٹارٹ ہوا اور اگلے چند منٹوں میں محو پرواز تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں ہم ایک ایسی جگہ اترے جہاں دور دور تک ویرانی تھی۔ وہیں ایک جگہ کیمپ لگا ہوا تھا۔ ہم اس جانب بڑھ گئے۔ چیف سامنے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو سلام کے بعد اس نے پوچھا۔

”مجھے خبر مل چکی ہے کہ وہاں پر کچھ ٹھیک نہیں چل

رہا ہے۔ضرورت ہے کہ مکمل طور پر تصدیق کر لی جائے لیکن آپ آج ہی اٹیک چاہتے ہیں کیوں؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ وہی لوگ ہیں۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"میں نہیں پوچھوں گا کہ یہ اعتماد کیوں ہے لیکن اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ جس طرح یہ منصوبہ مختلف جگہوں پر پھیلا ہوا ہے، یہ اس کا محض حصہ نہ ہو اور باقی زیر زمین چلے جائیں۔" چیف نے کہا

"یہ میری ذمے داری ہے کہ میں اسے پورا ختم کروں، آپ بس میری مدد کریں، جہاں ممکن ہے۔" میں نے اسی اعتماد سے کہا تو چیف نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مجھے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔

"ڈن۔!"

"شکریہ۔" میں نے کہا اور پلٹ پڑا۔ میں کیمپ سے باہر نکلا تو ایک وجیہہ جوان آگے بڑھا، اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آفتاب کرمانی، میں آپ کے ساتھ ہوں۔" اس نے کہا اور میرے ساتھ چل پڑا۔

اس وقت سرمد وغیرہ اس ہوٹل سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر تھے۔ میں نے اروند کو فون کیا تو شمس لائن پر تھا۔ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ سارا کام کس طرح ہوگا، بس مجھے ان کے کسی سیل فون یا لیپ ٹاپ تک رسائی دیں، باقی سب دیکھ لوں گا۔"

"اوکے رابطے میں رہنا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہم اسی طرح واپس ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور شہر کی ایک ایسی عمارت کی چھت پر آگئے جہاں ہیلی پیڈ تھا۔ ہم ہیلی کاپٹر سے اتر کر اسی عمارت کے ایک ایسے کمرے میں آگئے، جہاں جدید ترین آلات نصب تھے۔ درمیان میں ایک میز تھی، جس پر بڑے بڑے دو کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک پر اس ہوٹل کا پورا نقشہ تھا۔ دوسرے کاغذ پر اسی منزل کے بارے میں نقشے کے ساتھ تفصیل درج تھی۔ میں، آفتاب کرمانی اور جنید اس پر بات کرنے لگے۔ اس وقت سرمد کو میں نے فون لائن پر لیا ہوا تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم نے اٹیک کی پوری تفصیل طے کر کے نکلنے کو تیار ہو گئے۔ ہم نے اس اٹیک کا پورا دورانیہ صرف پانچ منٹ رکھا تھا۔ جس میں ایک ایک لمحہ طے کر لیا گیا تھا۔

رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ ہم چاروں کے ساتھ صرف چھ جوان تھے، جو ایسے کمانڈو اٹیک کے لیے بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے کاندھوں پر بیگ تھے۔ وہ ہوٹل کی مختلف سمتوں میں پہنچ گئے تھے۔ ہم دس لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا، ایک بولتا تو باقی دس سن سکتے تھے۔ اسی طرح یہ آواز ان بہت ساری جگہوں پر سنی جا سکتی تھی، جو ہمارے ساتھ رابطے میں تھے۔

میں اور جنید بیک پر تھے۔ ہمارے پیچھے سرمد تھا، لیکن ہمارے آگے آفتاب کرمانی تھا۔ وہ سیدھا، ہوٹل کے مینجر کے کمرے میں گیا۔ اسے اپنے ساتھ لیا اور اوپری منزل کی جانب بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور مجھے کور دینے والا سرمد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تھا۔ جس وقت آفتاب کرمانی لفٹ کے ذریعے اس آخری منزل تک پہنچا، میں دوسری طرف کی لفٹ سے اوپر پہنچ گیا۔ اس دوران وہ چھ جوان کسی چھپکلی کی طرح اوپر چڑھ رہے تھے۔ میں جیسے ہی اوپر پہنچا۔ سامنے ایک کھلی سی لابی میں دو سیکورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ لفٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر میری جانب بڑھے۔ میں لفٹ سے نکل کر ان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ الجھ گئے کہ

لفٹ تک روکیں یا مجھ سے بات کریں۔اسی لمحے کی سوویں حصے کا فائدہ اٹھایا۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے، سرمد اور جنید نے میرے پیچھے سے فائر کر دیئے۔ان کے پاس خاموش پسٹل تھے۔میں جانتا تھا کہ ہماری یہ کارروائی، کہیں نہ کہیں کیمرے میں دیکھی جارہی ہوگی۔اس لیے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں اسی کمرے کی جانب بڑھا جہاں وہ لوگ ممکن ہو سکتے تھے۔سامنے سے آفتاب کرمانی آتا ہوا دکھائی دیا۔میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا۔میں دروازہ کھولا تو وہاں کا منظر یوں تھا جیسے دفتر سجا ہوا ہو۔میرے ساتھ جنید اندر داخل ہوا تھا۔باقی سب باہر کی سیکورٹی سے نپٹنے کے لیے باہر ہی موجود تھے۔آفتاب کرمانی اس سب کو دیکھ رہا تھا۔

''خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو۔'' میں نے انگریزی میں کہا تو وہ لوگ اک دم ساکت ہوگئے۔تبھی میں نے دوسرا حکم دیا۔

''سب کچھ یوں چھوڑ کر اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور یہاں آکر لیٹ جاؤ۔فوراً۔''میری آواز کے پھیلتے ہی ایک لڑکی،اس کے ساتھ ایک نوجوان،ایک ابھی بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔وہ وہیں ڈھیر ہوگیا مگر اس کا ردعمل یہ آیا کہ وہ سبھی انتہائی تیزی سے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے وہیں فرش پر لیٹ گئے۔جنید آگے بڑھا،اس نے انتہائی تیزی سے انہیں ایک ہی رسی سے باندھ دیا۔سرمد ان کے کمپیوٹر اور سیل فون کی جانب بڑھا۔اس ساری کارروائی میں اب تک تین منٹ خرچ ہوگئے تھے۔ایسے میں باہر فائر ہوا اور ایک شخص اونچی اونچی آواز میں چیخنے لگا۔میں نے رابطے ہی میں آفتاب کرمانی سے پوچھا۔

''یہ یہاں کا ہیڈ ہے اور دھمکیاں دے رہا تھا،میں نے مار دیا۔''

''او کے۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ ان چھ کمانڈوز کے ہیڈ نے کہا۔

''اوپر والی منزل ہمارے کنٹرول میں ہے،بولیں۔''

''او کے،سنبھالو اور الرٹ رہو۔'' آفتاب کرمانی نے انہیں حکم دیا۔میں نے سرمد کی طرف دیکھا۔وہ شمس اور قمر کو لیپ ٹاپ کے لنک دے چکا تھا۔اس وقت لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔اگلے دو منٹ بہت بھاری تھے۔اگر وہ سب کچھ نہ ہوا تو میری جان جاسکتی تھی اور میں ایک مجرم کے طور پر وہیں مارا جاسکتا تھا۔تقریباً ڈیڑھ منٹ گزر گیا تبھی سرمد کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری

''وہی سب کچھ...... جس کا ڈر تھا...... خوفناک منصوبہ...... یہ لوگ...... انتہائی قریب...... رسائی...... کر گئے ہیں۔''

ایک دم سے یوں ہوگیا جیسے ساری دنیا ہی دم سادھ گئی ہو۔جس طرح انہونی ہوگئی۔مجھے معلوم تھا کہ یہ آواز کہاں تک جا پہنچی تھی۔جس وقت ہم اٹیک پر بات کر رہے تھے۔ہاں اور نہیں کے بعد کی صورت حال پر بھی طے کر چکے تھے۔صورت حال ''ہاں'' تھی۔اب وہی ہونا تھا جو ہاں کے بعد ہونا طے تھا۔اوپر والی منزل کو پوری طرح سیل کر دیا گیا۔مزید چھ لوگ چھپکلیوں کی طرح اوپر آگئے تھے۔سیکورٹی والے کئی مر گئے تھے اور کئی بے ہوش تھے۔انہیں قابو کر لیا گیا ہوا تھا۔وہیں پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ سب غیر ملکی سیکورٹی گارڈ تھے۔آفتاب کرمانی نے انہیں مار دینے کا حکم دے دیا۔

میرے سامنے آٹھ لوگ تھے،جن میں سے ایک مردہ ہو چکا تھا۔وہ چھ جوان اندر آگئے۔انہوں نے وہاں سب کو کور میں لے لیا۔

''تم میں سے یہاں لیڈ کون کر رہا تھا؟''میں نے ایک سے پوچھا تو اس نے ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا جو فرش پر پڑا تھا۔میں اس کے قریب گیا اور

اسے کھولنے کا کہا۔ اسے کھول دیا گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون کر رہا ہے یہ سب، کس کا حکم آتا ہے؟"

"میرا اسیل فون، اس میں آتے ہیں حکم۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا یہاں کیا کام تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں معلومات جمع کر رہا تھا، اور آگے دے رہا تھا، میرا اتنا ہی کام ہے۔" اس نے

"کون دے رہا ہے معلومات؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"مختلف لوگ؟" اس نے مختصراً کہا۔

"کہاں ہیں وہ؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"مختلف جگہوں پر۔" اس نے بتایا تو ایک کمپیوٹر کے سامنے کھڑا سرمد بول اٹھا۔

"یہ میرے پاس ہیں ان کی نشان دہی، اس سے پوچھو کتنے لوگ ہیں، میں دیکھ رہا ہوں۔"

"سات لوگ ہیں۔" اس نے

"او کے۔ انہیں فوراً یہاں پہنچنے کا کہو۔" میں نے اس ادھیڑ عمر بندے سے کہا تو شمس چیخ اٹھا۔

"نہیں اسے مت کہنا، یہ انہیں اشارہ دے سکتا ہے۔ میں نے ان کا سب کچھ ہینڈ اوور کر لیا ہے۔ سوائے سیل فون کے۔ اس کے سیل فون سے ایک پیغام لکھ دو کہ جو جہاں ہے، فوراً پلٹ آئے اور اپنا یہ سیل فون ضائع کر دیں۔"

"او کے۔" سرمد نے تیزی سے کہا اور اس کا سیل فون دیکھ کر اس میں پیغام لکھ دیا۔

"اس وقت کوئی دس منٹ کی دوری پر ہے اور کوئی آدھے گھنٹے کی دوری پر...... انہیں پہنچنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ انہیں سمیٹو۔" آفتاب کرمانی نے حکم دیا تو وہ سب ان لوگوں کو لے کر چھت کی جانب بڑھ گئے۔ جو

محبوبہ سے بیوی تک

ٹرین کے ڈبے میں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی خوبصورت سیکریٹری اس پر اپنی حسین اداؤں اور سب سے زیادہ اپنی باتوں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر سیاسی لیڈر نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے کہا۔ سنو! اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ ہم میاں بیوی ہیں تو کیسا رہے گا؟" سیکریٹری دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" لیڈر نے ذرا سختی سے کہا۔ "تو پھر بکواس بند کرو۔ خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلا کیا خیال ہے جناب کا......"

شاکر علی ...... پشاور

سیکورٹی گارڈ مر چکے تھے۔ انہیں ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ اس نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ میرے دماغ میں ایک ہی بات کھٹک رہی تھی کہ آیا یہ ساری معلومات کہیں پہنچ چکی ہیں؟ اگر پہنچ چکی ہیں تو کہاں پر؟ اس ادھیڑ عمر کو چھت پر لے جایا جا چکا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بھاگا۔ وہ چھت پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"بولو! یہ معلومات کہاں تک گئی ہیں، کس کے پاس پہنچی ہیں، کسے دے رہے ہو؟"

"میں نے سچ بتایا ہے، میں صرف اسی سیل فون پر اطلاعات دے رہا ہوں۔ جو بھی نقشہ، یا جو کچھ بھی اسے دے رہا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ

بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کھرکھراتے ہوئے کہا تو مجھے سرمد کی آواز سنائی دی۔
''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟ میں نے تلاش کرلیا ہے کہ وہ کہاں ہے، اس کی نشاندہی یہاں سے جنوب مغرب کی جانب ہورہی ہے۔ اگر اسے پکڑا نہ گیا تو ممکن ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہوجائے۔''
''اتنی جلدی اس تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے، میں تو اس علاقے سے بھی واقف نہیں ہوں اور اس کے......؟'' میں نے پوچھا۔
''ہیلی کاپٹر سے، بندہ بھی مل جاتا ہے۔'' آفتاب کرمانی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں چونک گیا۔
''کب تک آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی پانچ منٹ میں۔'' اس نے جواب دیا تو میں نے شمس سے پوچھا۔
''بولو کیا کہتے ہو۔''
''میں دومنٹ بعد بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور خاموش ہوگیا۔ اس کی خاموشی طویل ہوگئی۔ صرف کی پیڈ کی ٹک ٹک مجھے سن رہی تھی جن میں دوسری آوازیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔ جس وقت ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوا، اس وقت شمس بولا۔
''سرمد نے سمت درست بتائی ہے۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ آپ چلو، میں ساتھ ہوں۔''
مجھے بہت زیادہ اعتماد مل گیا۔ جیسے ہی اس ہوٹل کی چھت پر ہیلی کاپٹر رکا، میں بھاگ کر اس میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ دوبارہ اُڑ گیا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
''میں فرخ اقبال، آپ سمت بتائیں۔''
''میں بتاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں نے وہ پیغام کھولا جس میں تکنیکی زبان میں وہ سمت درج تھی۔ اس نے پڑھ کر پائلٹ کو بتائی۔
''یہ تو بہت نزدیک ہے، چند منٹ بعد ہم وہاں ہوں گے۔'' پائلٹ نے بتایا۔
''لیکن وہاں نزدیک تک نہیں، ہم پہلے ہی ڈراپ ہوجائیں گے۔ انہیں شک نہیں ہونا چاہئے۔'' فرخ اقبال نے تیزی سے کہا اور مجھے پیراشوٹ پہنانے لگا، اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد وہ مجھے بتانے لگا کہ چھلانگ لگانے کے بعد کیا ہوسکتا ہے۔ اس نے ایک ٹرانسمیٹر مجھے دے دیا تاکہ رابطہ رہے۔
دومنٹ بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔'' پائلٹ نے ہمیں الرٹ کردیا۔
''اوکے ڈن۔'' فرخ نے کہا اور اُلٹی گنتی گننے لگا۔ جیسے ہی اس نے زیرو کہا میں نے چھلانگ لگادی۔ ایک جھٹکا لگا، پھر میں تیرنے لگا۔ میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ بالکل زمین کے قریب جا کر میں نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن گر گیا۔ وہ سخت اور پتھریلی زمین تھی، مجھے کافی چوٹیں آئیں۔ میں کبھی پیراشوٹ سے نہیں کودا تھا۔ اس لیے ناتجربہ کاری میں کوئی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں ایک آدھ منٹ بعد سنبھل گیا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے اس زمین سے ٹکراتے ہی عجیب سا محسوس ہوا جیسے میں ایک دم سے پھیل گیا ہوں۔ یا پھر جیسے کہیں بم دھماکا ہوتا ہے تو اس کے اثرات ہوا میں پھیل جاتے ہیں، یہاں تک کہ آواز بھی دور دور تک جاتی ہے، ایسی ہی صورت حال میں محسوس کررہا تھا۔ جس کی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں اسی پر غور کررہا تھا کہ پہلی آواز فرخ کی گونجی۔
''کہاں ہو؟''
''مجھے کیا پتہ ہے کہاں ہوں، لیکن یہ پکا ہے کہ

ابھی جنت میں نہیں اس دنیا ہی میں ہوں۔" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا تو اس کا ہلکا سا قہقہہ گونجا۔

"اپنے اردگرد بتاؤ، تاکہ میں تم تک پہنچ سکوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں سیل فون کی ٹارچ جلاتا ہوں، دیکھ لو۔" میں نے کہا اور ٹارچ جلا دی۔ اگلے ہی لمحے بولا۔

"اوکے اوکے، میں پہنچ رہا ہوں۔"

تقریباً دس منٹ بعد وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ وہ کافی حد تک ہانپ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"ایسا کیا ہے، تم ہانپ کیوں رہے ہو؟"

"تم نہیں جانتے ہو کہ ہم کہاں ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا میں تجھے بتاتا ہوں۔ یہ بہت تاریخی جگہ ہے۔" اس نے اپنا سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

ہم اس وقت ٹلہ جوگیاں کی مشہور اور تاریخی جگہ پر تھے۔ یہ جگہ سکندر اعظم سے بھی بھی پہلے کی آباد تھی۔ باکمال جوگیوں کا وہ تاریخی استھان تھا، جہاں پر سکندر اعظم بھی آیا اور شیر شاہ سوری بھی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہندوؤں کی مقدس کتاب "رگ وید" کا بیشتر سے زیادہ حصہ لکھا گیا۔ اس وقت یہ لوگ سورج پرست تھے۔ یونانی بھی اس دور میں سورج کو خدا مانتے تھے۔ جہلم سے جنوب مغرب کی جانب ایک جگہ ہے دینہ، اس سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور سطح زمین سے بتیس سو فٹ بلندی پر وہ استھان ہے۔ سکندر اعظم نے ہاتھی کے ساتھ چڑھنے کی کوشش کی تھی کہ ہاتھ مر گیا۔ وہ نہ چڑھ سکا۔ یہاں سیکڑوں جوگی اپنی الکھ جگانے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ آئین اکبری میں یہاں پر ایک باقاعدہ نظام تھا اور اس جگہ کو ایک عبادت گاہ (معبد) کی حیثیت حاصل تھی۔ اس نظام کو چلانے والے کو "مہنت" کہتے تھے۔ اس قدر چڑھاوے چڑھتے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہوتا۔ مہنت ہی اپنا الگ شعبہ بنا کر اس جگہ کو منظم کیے ہوئے رکھتا۔ بہلول لودھی کے دور میں مشہور زمانہ عاشق صادق رانجھا یہاں جوگی "بالناتھ" کے پاس آیا تھا۔ یہیں پر اس نے کان چھدوائے تھے۔ یہاں کان چھدوائے جوگی ہوتے تھے۔ جن کی کرامتیں بہت دور دور تک مشہور تھیں۔ ہر دور میں ایک جوگی یہاں کا مہان جوگی رہا تھا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں جودھ ناتھ تھا۔ اس کے قریب ہی قلعہ روہتاس واقع ہے۔ یہاں بیساکھ کے مہینے میں بڑا بھاری میلہ لگا کرتا تھا۔ انگریز دور میں یہ جگہ پررونق رہی لیکن حیرت انگیز طور پر پاکستان بنتے ہی ٹلہ کی رونقیں ختم ہو گئیں۔ یہاں خاموشی کا راج ہو گیا۔ ہر طرف ایک سناٹا پھیل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے جوگیوں کی روحیں بھی یہاں سے چلی گئی ہیں۔ قبل مسیح سے آباد و پررونق جگہ پاکستان بنتے ہی کیوں بے رونق ہو گئی یہ سوال اپنی جگہ لیکن ہم یہاں پر تھے، اس کی سمجھ مجھے آنے لگی تھی۔ میں یہاں پر یونہی نہیں تھا۔ کوئی بہت بڑا راز مجھ پر کھلنے والا تھا۔

اندھیر ہر جانب پھیلا ہوا تھا۔ فرخ مجھے اس جگہ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ لیکن میرے اندر اک سنسنی پھیل چکی تھی۔ جس طرح کسی حکیم کو کسی بھی علاقے میں کسی خاص بوٹی کی مہک آ جاتی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اس جگہ کی پراسراریت نے جکڑ لیا ہوا تھا۔ میں اٹھ گیا۔

ان شاء اللہ، باقی آئندہ

پری گل

راحیلہ تاج

محبت کی پرخار راہوں پر اندھا دھند دوڑتی ایک وفا شعار خاتون کا فسانہ۔
ان لوگوں کے لیے بطورخاص جو محبت کرنا اور اسے محسوس کرنا جانتے ہیں۔

قدیم فن تعمیر کی تمام تر شان وشوکت لیے وہ بڑی سی حویلی مدھم مدھم آواز میں تالیاں بجاتے اخروٹ کے درختوں میں' کسی معزز اور پروقار عمر رسیدہ خاتون کی مانند دکھائی دیتی تھی' طویل سایوں والے سفید سے کے کچھ درخت اس حویلی کی پاسبانی کررہے تھے' ان درختوں کے نیچے کملائے ہوئے پھولوں کے تختے بھی اونگھتے نظر آتے تھے' ہر پھول کا چہرہ عدم توجہ کا شاکی تھا' اس کے باوجود رنگ اور خوشبو کا احساس زندہ تھا۔ حویلی تین منزلہ تھی' برسوں قبل اس کی ہر کھڑکی کھلی رہتی تھی..... اور بالکونیوں سے ہنستے مسکراتے اور زندگی کی بہاروں کے امین' خوش رنگ چہرے جھانکا کرتے تھے۔ سبز گھاس والے وسیع وعریض لان میں زندگی کے سارے ہی رنگ بکھرے ہوتے اور قہقہے سنائی دیا کرتے' چہل پہل سے کسی میلے جیسا سماں نظر آتا......
مگر اب ہر کھڑکی بند تھی' بالکونیاں کسی بیوہ کی مانگ کی مانند اجڑی اجڑی اور ویران ہوگئی تھیں۔ حویلی کے نامور مکین' قبائلی دشمنی کی آگ میں بھسم ہوچکے تھے اور باقی ماندہ وارث حویلی کی سکونت ترک کرکے امریکا بھاگ گئے تھے' اگر وہ ایسا نہ کرتے تو صدیوں سے بھڑکتی ہوئی آگ انہیں بھی چاٹ گئی ہوتی' جنہوں نے حویلی کی رونقیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جب خان داؤد زندہ تھا تو دن رات لنگر تقسیم ہوتا رہتا تھا۔ حاجت مند عقبی دروازے سے داخل ہوتے اور پیٹ بھر کر واپس چلے جاتے۔ خان داؤد کھانے کے علاوہ بھی غربا اور مساکین کی مالی امداد کرتا رہتا تھا لیکن اب حویلی کا عقبی دروازہ کسی کنجوس کی مٹھی کی طرح ہمیشہ بند رہتا تھا اور باورچی خانہ سرد ہوگیا تھا' جہاں کبھی انسانوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا' وہاں اب خاموشی اور سوگواری حکمراں تھی۔
اس حویلی میں اب صرف دو افراد مقیم تھے۔
نوجوان مزمل اور اس کی خوبصورت بیوی پری گل' جس کا حسن پریوں جیسا اور رنگ میں پھولوں جیسی ملائمت اور خوشبو شامل تھی۔ یہ دونوں حویلی کے آخری وارث امجد خان کے ملازم تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ حویلی' پری گل کی اپنی نہ تھی پھر بھی اسے حویلی سے بے پناہ محبت تھی' وہ اس کی خدمت میں ہر وقت یوں مصروف رہتی جیسے کوئی سگھڑ اور تابعدار بیٹی اپنی بوڑھی ماں کی خدمت میں مصروف ہو' کبھی تو وہ خاندانی تصاویر کو جھاڑتی پونچھتی اور کبھی گیلے کپڑے سے فرش رگڑنے لگتی۔ جب صفائی سے فارغ ہوتی تو کھڑکی میں کہنیاں ٹیک کر باہر پھولوں کو دیکھنے لگتی...... پھر یکایک پلٹتی اور فرنیچر صاف کرنے لگتی۔ اس کی بوٹی بوٹی پارے کی مانند تھرکتی رہتی تھی۔ ہاتھ' مشینی انداز میں کوئی نہ کوئی کام کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے اور جب وہ حویلی کے سارے کمرے آئینے کی طرح چمکا کر فارغ ہوتی تو خالی کوکھ کا احساس گرم پھوار بن کر اس کی ہستی پر گرنے لگتا' وہ بے کل سی ہوجاتی' اس کی اخروٹ رنگ آنکھوں

سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنے ہموار پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگتی' جیسے کچھ محسوس کرنا چاہتی ہو' لیکن احساس محرومی اور مایوسی سے گہری سانس لے کر سسکی نما سرگوشی میں کہتی۔ ''اللہ تیری مرضی چاہے تو جس حال میں بھی رکھے۔''

خدا پر بھروسہ کرنے والی پری گل اپنے اندر ایک روایتی بیوی اور وہمی عورت کا دل رکھتی تھی' یہ احساس ہمیشہ اس کی رگوں میں کھولتے پانی کی طرح رواں رہتا کہ کوئی عورت اس کے شوہر کو چھین لے گی۔ اسے کسی بڑی بوڑھی نے بتایا تھا کہ مرد صرف سایہ ہی نہیں بلکہ پھل بھی چاہتا ہے اور وہ خود کو ایک ایسا خوش نما درخت سمجھتی تھی جس پر بہار کا شباب طاری تھا۔ پھول تھے اور خوشبو تھی' مگر کسی پھول کے پیچھے پھل پرورش نہیں پاسکتا تھا' یہ دکھ اسے کسی باؤلے کتے کی مانند لحظہ لحظہ کاٹتا رہتا کہ بہت جلد اس درخت پر خزاں کی زردی حملہ کرنے والی ہے' پھر اس کے بدن کی چاندنی سفر کرتی ہوئی اس کے بالوں پر بھی پھیل جائے گی جب بھی وحشت اور خوف کے سائے اسے ڈرانے لگتے' وہ گھبرا کر لان پر نکل جاتی اور بے قراری سے ہری بھری گھاس پر ٹہلنے لگتی یا گلاب کی جھاڑیوں میں بیٹھ کر پھولوں کو چومتی...... پھولوں کی مہک اور نرماہٹ آہستہ آہستہ اس کے اندر کا خوف دور کر دیتی تو خوش گوار احساس لیے وہ دوڑتی ہوئی اندر چلی جاتی' یہ اس کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ جب کمروں میں ہوتی تو وحشت کے غراتے ہوئے سائے اسے خوف زدہ کر دیتے اور وہ بھاگ کر باہر جاتی تو اسے فوراً یہ خیال آ جاتا کہ کہیں امریکا سے امجد خان اور نگہت فون نہ کر رہے ہوں۔

یہ بھی عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد مختلف تھے' پری گل جتنی حساس' وفادار' چاک چوبند اور نمک کا حق ادا کرنے والی عورت تھی' اس کا شوہر اتنا ہی بے حس' غیر ذمے دار اور کاہل الوجود شخص تھا' اس کی عمر اپنی بیوی سے چند برس ہی زیادہ تھی...... مگر وہ پری گل سے کم عمر دکھائی دیتا تھا' شاید اس کی وجہ بے فکری' اچھی خوراک' اور آرام رہی ہو...... پری گل صبح اذاں کی پہلی آواز پر ہڑ بڑا کر اٹھتی اور عشاء کی نماز تک مشینی انداز میں حویلی کے اندر گردش کرتی رہتی۔ خوراک کے معاملے میں وہ اس دقیانوسی بیوی جیسی تھی جو اپنے شوہر کے بچے کھچے پر گزارہ کرنے کی عادی ہوتی ہے۔

مزمل رات گئے گھر آنے کا عادی تھا حالانکہ باہر اس کے ذمے کوئی بھی کام نہیں تھا اور صبح سورج کی کرنیں جب کھڑکیوں سے اوپر چلی جاتیں تب کہیں

اس کی آنکھ کھلتی تھی' بیدار ہو کر وہ لیٹے لیٹے گھنٹوں چھت کو گھورتا رہتا تھا۔

ایک صبح پری گل گرد آلود ہاتھ جھاڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو مزمل بستر پر کروٹ کے بل لیٹا' اپنے ناخنوں کو گھور رہا تھا' اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ پری گل کی آمد پر بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی یا پھر شاید اس نے اپنی بیوی کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔

''کیا بات ہے مزمل؟'' پری گل نے ملائمت سے پوچھا لیکن جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو ذرا آگے بڑھ کر تلخ آواز میں بولی۔ ''میں پوچھتی ہوں تم صبح صبح چھت اور ناخنوں میں کیا تلاش کرتے رہتے ہو' ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ سویرے اٹھ جایا کرو' خدا کو سجدہ کر لیا کرو' تم سے تو پنکھ پکھیروں بھلے ہیں جو پو پھوٹتے ہی بیدار ہو کر اپنے رب کی تعریف کرتے ہیں' بندے کو بھی کچھ تو بندگی کا ثبوت دینا چاہیے' چلو اب اٹھ جاؤ۔''

مزمل نے اسے خشمناک نگاہوں سے گھورا اور ماتھے پر ناگواری کی ان گنت تیوریاں چڑھا کر بولا۔ ''کیوں...... کیوں اٹھ جاؤں؟''

پری گل دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کے قریب چلی گئی۔ مزمل کا جواب سن کر اس کے نتھنے پھڑ پھڑائے...... مگر وہ ساری تلخی نگل گئی۔ وہ صبح ہی صبح گھر کا سکون غارت کرنے سے ہمیشہ کتراتی رہی تھی۔

''دیکھو مزمل' میں بڑی مشکل سے اندر کی صفائی کرتی ہوں' تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم کون ہیں اور ہمیں یہاں کیوں ملازم رکھا گیا ہے' گلاب کی کیاریوں میں خودرو بوٹیاں اگ آئی ہیں' لان کی گھاس خشک ہونے لگی ہے' اگر تم صبح سویرے اٹھ کر تھوڑا سا وقت صرف کرو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔''

''اُفوہ......'' مزمل پٹی پر ہاتھ مار کر غرایا۔ ''صفائی صفائی' ہر وقت صفائی' آخر اس صفائی ستھرائی کی ضرورت ہی کیا ہے' کون اسے دیکھنے آ رہا ہے' کسے فکر ہے کہ حویلی صاف ہے یا نہیں؟''

''مجھے......'' پری گل نے آنکھیں جھپکا کر جواب دیا۔

''تم فکر کرنا چھوڑ دو پری گل۔'' مزمل نے اٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس حویلی سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''ایں۔'' پری گل' جی جان سے لرز سی گئی۔ ''لیکن کیوں مزمل' ہمیں اس لیے ملازم رکھا گیا ہے کہ ہم حویلی کی حفاظت کریں' اسے صاف ستھرا رکھیں' وہ لوگ جب چاہیں واپس آ کر یہاں رہنے لگیں' یہ ہمارا فرض ہے...... پھر ایسی ملازمت بھلا کہاں ملتی ہے؟''

''اونہہ......'' مزمل نے حقارت سے کہا۔ ''ملازمت یہاں لوگوں سے زیادہ ملازمتیں ہیں۔''

''یہ...... یہ...... تم کہہ رہے ہو مزمل؟'' پری گل تپیدہ لہجے میں بولی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ یکدم بھینچ لیے اسے فوراً یاد آ گیا کہ اگر اور کچھ کہا تو مزمل اسے طعنہ دے کر گرجنے برسنے لگے گا۔ وہ ہمیشہ بڑی احتیاط سے اسے کام کرنے کی ترغیب دیا کرتی تھی کہ مزمل کو اپنی بے روزگاری کا احساس نہ ہونے پائے۔ دراصل وہ صرف شوہر پرست ہی نہیں بلکہ اسے اپنے شوہر سے بے حد محبت بھی تھی' اس نے سینکڑوں نوجوانوں میں سے مزمل کا انتخاب کیا تھا۔ ''اچھا چھوڑو اس قصے کو' یہ بتاؤ کہ ناشتہ باورچی خانے میں کرو گے یا اوپر ہی لے آؤں؟''

''نہیں......'' مزمل نے خشک آواز میں کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''انڈا بنا دوں گی۔'' پری گل نے پیار سے اصرار کیا۔

''اوہ انڈا۔'' مزمل نے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔ ''میں انڈے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں' آخر تم صبح' دوپہر' شام اور رات' ہر وقت مجھے انڈے ہی کیوں کھلاتی ہو؟''

پری گل گھبرا کر دو قدم دور ہو گئی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''کل بھی تم بہت دیر سے گھر آئے تھے۔'' اس نے کرب ناک لہجے میں کہا۔

"ہاں آیا تھا پھر؟" مزمل چیخا۔ "کیا میں اس حویلی کا قیدی ہوں یا تمہارا غلام ہوں۔"

"مجھے...... مجھے۔" پری گل سسک اٹھی۔ "صرف اتنا بتادو مزمل کہ تم کہیں باہر سے کھانا تو نہیں کھا آتے؟"

"باہر سے۔" مزمل نے جھک کر اس کا سرد ہاتھ پکڑ لیا۔ "باہر میرا کون ہے، جاؤ ناشتہ لے آؤ...... تم نہ جانے دن بہ دن وہمی کیوں ہوتی جارہی ہو۔"

مزمل ہمیشہ گرج برس کر بعد میں اسے یوں ہی منالیا کرتا تھا اور وہ اتنی بھولی تھی کہ گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتی تھی۔

عورت میں قدرت نے ویسے بھی صبر اور ایثار کا جذبہ مرد سے کہیں زیادہ رکھا ہے، پری گل کے ساتھ ایک اور بھی مجبوری تھی، اسے کچھ کچھ یقین ہوتا جارہا تھا کہ وہ ایک ایسا درخت ہے جس کی قسمت میں پھل نہیں ہے۔ وہ اپنے محبوب شوہر کو وہ پھل کبھی نہ دے سکے گی جس کے ریشوں میں مزمل کا خون دوڑ رہا ہو، اس کی نسل اور نام کی بقا موجزن ہو۔ اس یقین کی بنیاد گزشتہ پانچ برس تھے اور اس کی چھوٹی بہن تھی جس کی شادی گزشتہ سال ہوئی تھی اور وہ ایک خوبصورت بچے کی ماں بن چکی تھی، جس روز ان کو بچے کی پیدائش کا خط ملا تھا، خط مزمل ہی لایا تھا اور اسی نے پڑھ کر بھی سنایا تھا۔ اس خبر نے پری گل کو عجب دوراہے پر کھڑا کردیا تھا۔ وہ نہ تو اپنے دکھ کا اظہار کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی خوشی کی سرخی اس کے چہرے پر روشن ہوئی تھی۔

"تمہاری بہن تم سے زیادہ خوش بخت ہے۔" مزمل نے یوں ہی کہہ دیا تھا مگر پری گل کا کلیجہ جیسے اس بات کی برچھی سے زخمی ہوگیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے مزمل نے اسے بانجھ ہونے کا طعنہ دے دیا ہو۔

"بخت میرے بس میں تو نہیں مزمل۔" اس نے سسک کر کہا۔ "کاش روٹی کمانے کی طرح بخت کمانا بھی انسان کے اپنے بس میں ہوتا۔"

قیمتی موتی

* اگر آنکھیں راستوں کے مناظر میں نہ الجھیں تو منزل پر پہنچ کر تھکی ہوئی نہیں ہوتیں۔
* کسی انسان کو دکھ دینا اتنا آسان ہے جتنا سمندر میں پتھر پھینکنا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہوگا۔
* کسی بھی چیز کو باہر ڈھونڈنے سے بہتر ہوتا ہے کہ بندہ پہلے اپنے اندر کی تلاشی لے، جو باہر نہیں مل رہا وہ اپنے اندر ضرور مل جاتا ہے۔
* ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔

شاہد حسن...... اوکاڑہ

مزمل کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور اس نے ہنس کر سگریٹ سلگا لیا، پری گل نے انگلی کی پوروں سے اپنے ابھرے ابھرے سے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی ہی کرب سے سوچا "شاید کوئی معجزہ ہی ہوجائے، خدا ہمیشہ سے ہمیشہ تک ایک ہی ہے۔ ابراہیمؑ کا خدا، میرا خدا، بہن کا خدا، ایک ہی ہے۔ اس کے خزانوں میں کس شے کی کمی ہے" اس نے حسرت بھری نگاہوں سے مزمل کو دیکھا جو کھڑکی کی سرول پر جھکا منہ سے دواں اگل رہا تھا، وہ عموماً اس کھڑکی میں کھڑا ہوکر سگریٹ کا دھواں اور قرب وجوار میں گھومتے پھرتے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا۔

پری گل اس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھی لیکن وہ اسے کوئی تسلی دینے پر قادر نہیں تھی۔

مزمل کا گزشتہ ایک برس سے یہ معمول سا بن گیا تھا کہ نو دس بجے بستر چھوڑتا اور ناشتہ لے کر گھومنے پھرنے نکل جاتا اور پری گل دکھ اور تنہائی کی آگ میں جلتی سارا دن حویلی کے در و دیوار جھاڑنے میں خود کو

مصروف رکھتی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مزمل اس سے اکتا چکا ہے اور اکتا کر کہیں چلا جاتا ہے' امریکا سے آنے والی ساری تنخواہ بھی مزمل کی جیب میں جاتی تھی اور پری گل انڈے فروخت کر کے گھر کے اخراجات چلانے پر مجبور تھی۔ اس شک کے باوجود کہ مزمل کی زندگی میں گاؤں کی کوئی لڑکی داخل ہو چکی ہے وہ نہ تو اسے باہر جانے سے روکتی تھی اور نہ ہی تنخواہ کا ..... حصہ اسے دینے سے ہاتھ روکتی تھی' گویا وہ اسے اپنے بانجھ پن کا خراج دے رہی تھی۔

جس شک کو یقین کے لباس میں دیکھنے سے وہ ہر ساعت خود کو روکتی رہتی تھی' آخر ایک شام وہ اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا' تن اور..... آنکھیں فرط حیرت اور دکھ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' اپنے شک کو یقین کے روپ میں دیکھ لینے کے باوجود اس کے جسم کا رواں رواں بینائی کی نفی کر رہا تھا۔

"نہیں' ہرگز نہیں۔" اس کے اندر سے آواز ابھری جسے حلق نے اندر ہی روک دیا۔ میرا مزمل ایسا نہیں ہو سکتا' وہ صرف مجھی سے پیار کرتا ہے۔ اس نے چند برس قبل ہی تو چاندنی کی گواہی میں کہا تھا' پری گل تم سچ مچ پری ہو' کوہ قاف سے اتر کر میرے لیے ادھر ہی رہ گئی ہو' تیری میری سانسیں مشترک ہیں' جب تو سانس لیتی ہے تو مجھے زندگی کا احساس ہوا ہے۔ مزمل کسی اور کی سانسوں میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

......لیکن یقین اپنی تمام تر سچائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس دن وہ بازار سے سودا سلف لے کر واپس آ رہی تھی کہ حویلی کے گیٹ پر اچانک ہی اسے وہ بائیس تئیس برس کی خوبصورت لڑکی نظر آ ئی' جو اپنی ہی ترنگ میں ناچتی کودتی اندر سے آ رہی تھی۔ دونوں کا سامنا گیٹ پر ہوا۔ لڑکی چونک کر رک گئی۔ اس کے شفاف چہرے اور آنکھوں میں خوف کے سائے لرزنے لگے کیونکہ پری گل اسے گھور رہی تھی۔

"تم کب سے پھول چرا رہی ہو؟" پری گل نے پھولوں بھری جھولی کی جانب اشارہ کیا۔

"نن..... نہیں تو..... مم..... میں نے کبھی پھول نہیں چرائے۔" لڑکی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "انہوں نے خود ہی دیئے ہیں۔"

"کس نے ؟" پری گل چیخنا چاہتی تھی مگر صرف برہم آواز تک ہی محدود رہی۔

"مزمل نے۔" لڑکی بولی۔ "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری حویلی میں خوبصورت پھول ہیں۔"

پری گل کا دل بیٹھنے لگا اور ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔ "اچھا....." وہ جھرجھرائی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ "جاؤ..... چلی جاؤ' اور کبھی ادھر نہ آنا۔ اچھے لوگ پھول نہیں توڑا کرتے۔ پھول شاخ پر ہو یا کسی انسان کی ذات کا' اسے ٹوٹنا نہیں چاہیے۔" اس نے آہستگی لڑکی کے شانے پر تھپکی دی اور گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ لڑکی کدھر جا رہی ہے۔

وہ رات اس نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے جاگ کر گزاری اور مزمل اس کے قریب بے سدھ لیٹا فضا میں خراٹے منتشر کرتا رہا۔

"کیا تم نے اس لڑکی کو چند پھولوں کے عوض پامال کر دیا ہے؟" اس نے خوابیدہ شوہر سے سوال کیا۔ اس کی نگاہوں میں اس معصوم صورت والی لڑکی کا چہرہ گھوم رہا تھا اور پھر جب اس کی پریشانی میں ماں کی موت کا دکھ بھی شامل ہو گیا تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی اور مزمل نے ان دکھی لمحوں میں ہمدردی کا ایک بول بھی اس کے کانوں میں نہیں ٹپکایا۔ دکھ میں ہمدردانہ الفاظ مرہم بن جایا کرتے ہیں۔ پری گل اس سے بھی محروم رہی۔

جب وہ تنہا ہی ماں کی جدائی کا دکھ جھیل کر ساتویں روز واپس حویلی آ رہی تھی اس کے بٹوے میں وہ رقم بھی تھی جو اسے ماں کا سامان فروخت کرنے کے عوض

ملی تھی' اس رقم سے اس نے ایک پیر بابا کو سو روپے نذرانہ دے کر مزمل اور اپنے لیے تعویذ بنوائے تھے' اس نے اپنی خشک کوکھ کی ہریالی کے لیے فریاد کی تھی اور مزمل کو قابو کرنے کی دعا کروائی تھی۔

جب پری گل بس سے اتری تو اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ مزمل اطلاع پاتے ہی اسے لینے دوڑتا آیا ہوگا۔ پورے سات دن کی جدائی نے مزمل کو بے کل کر رکھا ہوگا' لیکن اسے وہاں نہ پا کر اس کا دل ٹوٹ گیا اور پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔ مزمل نے اسے اس حد تک نظر انداز کر کے بڑا ہی دکھ دیا تھا' اس کا مان توڑ دیا تھا۔

حویلی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس نے محسوس کیا کہ گلاب کی ساری ڈالیاں بیوہ ہو چکی ہیں لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کرتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ کمرہ نشست کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور فرنیچر پر گرد جمی ہوئی تھی۔ فرش پر جابجا سگریٹوں کے ادھ جلے ٹوٹے اور ماچس کی تیلیاں بکھری ہوئی تھیں۔

''مزمل! میں آ گئی ہوں مزمل۔'' دوسری منزل پر پاؤں کی دھمک سن کر وہ چیخ پڑی...... پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اوپر دوڑ رہا ہو۔

''اوہ' میرا مزمل۔'' وہ یک دم سارے دکھ بھول گئی' میری آواز سن کر دوڑ پڑا ہے' خوشی سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اندرونی خوشی کے تحت سرخی مائل ہوتا چلا گیا' چشم تصور سے وہ کھلے دروازے کی جانب دیکھنے لگی' اس کا محبوب شوہر وفور محبت سے بانہیں پھیلائے بڑھ رہا تھا۔

لیکن یہ کیف آگیں لمحہ بے حد مختصر ثابت ہوا۔ دوسرے ہی لمحے دوڑتے قدموں کی وہ چاپ جو پری گل کے لیے خوشیاں لائی تھی' گہری خاموشی میں ڈوب گئی' پری گل کو پانی جذباتی سانسوں اور دھڑکنوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

شاید وہ چھپ کر میرے صبر کا امتحان لینا چاہتا ہے' اس نے زیر لب کہا۔ ''مزمل! تم کہاں ہو' دیکھو میں کس قدر بے قرار ہوں اندر آؤ مزمل۔'' اس نے بلند آواز میں کہا لیکن جواب میں قبرستان کی سی خاموشی طاری رہی۔

وہ باہر گئی' ادھر ادھر دیکھا اور زینہ چڑھنے لگی۔

مزمل اوپر بھی نہیں تھا۔ سارے کمرے خالی تھے۔ ان کی خواب گاہ کا فرش گرد آلود تھا اور گرد پر نقش پا ثبت تھے۔ ایک تو مزمل کی پشاوری چپل کے اور دوسرے نقوش کسی کے برہنہ پیروں کے تھے۔ وہ اکڑوں بیٹھ گئی۔ نشانات چھوٹے چھوٹے اور نازک پیروں کے تھے۔

''یہاں اور کون آیا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور کچن میں چلی گئی۔

سنک میں دو پیالیاں اور دو ہی پلیٹیں ان دھوئی پڑی تھیں' ابھی وہ اپنے اندر گونجتے سوالوں کا کوئی جواب بھی نہیں سوچ سکی تھی کہ نیچے سے مزمل کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔ ''اوئے نیچے دیکھو کیا لایا ہوں۔''

پری گل لپک کر بالکونی میں گئی۔

مزمل ہاتھوں میں ایک بنڈل اٹھائے کھڑا تھا' جونہی اس نے پری گل کو سامنے دیکھا' وہ بری طرح چونک پڑا اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا' جیسے اس کے اندر کا سارا جوش و خروش اور خوشی جھاگ بن کر بیٹھ گئی ہو۔

''اوہ......'' وہ دانت پیس کر غرائی۔ ''تو تمہیں یہاں کسی اور کی توقع تھی اور تم نے مجھے نہیں پکارا تھا۔'' پہلی بار اس کی آنکھوں سے محبت کی پٹی اتری اور اسے مزمل کا اصل مکروہ چہرہ دکھائی دے گیا۔ اس نے نفرت کی ابکائی کو بمشکل روکا اور چہرہ پھیر کر فرش پر تھوک دیا۔ اسے بستر کی چادر پر ٹوٹ کر بکھرے ہوئے لمبے بال' فرش پر نقش پا' جھوٹی پیالیوں اور پلیٹوں کے متعلق سارے سوالوں کے جواب مل گیا تھا۔

''تم کب آئیں؟'' مزمل نے زینے پر چڑھتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم شام کو دیر سے

پہنچوگی۔''

پری گل نے اس پر حقارت بھری نگاہیں ڈالیں اور وہ بنڈل کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ پری گل بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی اور چپ چاپ صوفے پر جا بیٹھی۔

''کیا بات ہے' تم یہاں کیوں نظر آ رہی ہو؟'' مزمل بنڈل الماری میں رکھ کر پلٹتے ہوئے ترش لہجے میں بولنے لگا۔ ''اگر تمہاری ماں مرگئی ہے تو میں کیا کروں' مجھے تمہاری اس بسورتی صورت سے نفرت ہے' کیوں آئی ہو؟''

پری گل پتھر بنی فرش کو گھورتی رہی۔ اس کی زبان گنگ تھی اور دل جل رہا تھا' جب مزمل باہر نکل گیا تو وہ بھی اٹھی اور چادر نوچ کر فرش پر پھینک کر لیٹ گئی...... لیکن بستر جیسے انگاروں اور کانٹوں سے بھرا ہوا تھا' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی' یہاں سب کچھ غلیظ ہو چکا ہے' بستر جھوٹا ہے' مزمل جھوٹا اور برتن جوٹھے' ہر شے سے اسے گھن محسوس ہونے لگی تھی۔ ''مجھے ہر غلیظ شے اور ہر جھوٹے برتن سے نفرت ہے' وہ جا کر صوفے پر لیٹ گئی۔ وہ رات بھی اس نے سوچتے اور روتے روتے گزار دی۔ اس رات مزمل آدھی رات کے بعد لڑکھڑاتا ہوا واپس آیا اور پری گل کو نظر انداز کرتا ہوا سو گیا۔

صبح جب پری گل خاموشی سے ناشتہ رکھ کر واپس جانے لگی تو مزمل نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ اس نے چہرہ گھما کر خالی خالی نگاہوں سے دیکھا' مزمل چور چور نگاہوں سے فرش کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے ایک ڈاکٹر کے ہاں ملازمت مل گئی ہے۔'' مزمل نے نگاہیں ملائے بغیر بتایا۔ ''اب میں صبح واپس آیا کروں گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو مزمل؟'' پری گل کھل اٹھی۔ ''اوہ' یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہم بچت کر کے اپنا ذاتی مکان خرید لیں گے۔'' وہ دوڑ کر مزمل کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''ہاں......'' مزمل نے سرد سانس لی۔ ''اپنا ذاتی گھر......''

''سوچو نا جب امجد خان صاحب واپس آئیں گے تو ہمیں یہ حویلی چھوڑنا پڑے گی۔'' پری گل پرجوش لہجے میں بولتی رہی۔ ''نگہت بی بی تم نے پردہ کرتی ہے نا' اس لیے ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''میں مغرب کے وقت جایا کروں گا۔'' مزمل نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ بس جانے کی ہی باتیں کر رہا تھا۔ ''اگر تمہیں یہاں ڈر لگے تو گاؤں چلی جاؤ' دیکھو نا' یہاں تمہارا اکیلی رہنا ٹھیک نہیں' پتہ نہیں کب تک مجھے رات کی ڈیوٹی دینی پڑے گی۔ جب تم کوئی مکان دیکھ لوگی تو میں گاؤں......''

''اوہ' نہیں مزمل۔'' پری گل نے جھجک کر کہا۔ ''میں یہیں رہوں گی۔ یہاں ڈر نہیں لگتا' اگر میں چلی گئی تو تمہیں کھانا کون بنا کر دے گا۔ تمہاری خدمت کون کرے گا۔'' مزمل خاموش رہا اور پھر ناشتہ کر کے سو گیا۔ پری گل اس...... سے دن بھر اور پر نہ آئی کہ کہیں مزمل کی نیند خراب نہ ہو جائے۔

ایک ماہ کی مدت پر لگا کر اڑ گئی تھی۔ پری گل کو وقت کا احساس ہی نہیں ہوا حالانکہ جب وہ رات بستر پر لیٹتی' تو مزمل کی عدم موجودگی' اس پر رقت طاری کر دیتی' وہ ڈبل بیڈ کی ایک پٹی سے دوسری پٹی تک کروٹیں بدلتی نہ جانے کب اس عذاب تنہائی سے نجات پاتی۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا مزمل آوارگی چھوڑ کر ملازمت کر رہا تھا۔

ایک صبح نو بجے تک جب وہ واپس نہ پہنچا تو اسے فکر ہونے لگی۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے گھر فون کیا تو ڈاکٹر کے جواب نے اسے حواس باختہ کر دیا اور پورے ایک ماہ کی خوشی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ ''مزمل نام کے کسی شخص سے ڈاکٹر ناآشنا تھا۔

اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے ریسیور رکھا اور بانہوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''مزمل' مزمل۔ تم راتیں کہاں بسر کرتے ہو؟''

تب یک دم اس کے سامنے وہی لڑکی آ گئی جسے مزمل نے پھول دیئے تھے' وہی لڑکی جس کے بال اس کے بستر پر ٹوٹے ہوئے پائے گئے تھے' جس کے نقش پا فرش پر ثبت تھے۔ وہی لڑکی جس نے اس کی عدم موجودگی میں مزمل کے ساتھ کچن میں کھانا کھایا تھا۔ مزمل اسے مکمل طور پر چھوڑ کر زیادہ تر وقت اسی لڑکی کے ساتھ گزارتا تھا۔

اگلے روز جمعہ تھا' اس دن وہ سارے فرش دھونے اور فرنیچر جھاڑنے کے بعد خود بھی غسل کیا کرتی تھی' لیکن مزمل نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سے جینے کی آرزو تک چھین لی تھی۔ وہ مردہ چال چلتی ہوئی لان میں آ گئی اور نم آلود گھاس پر لیٹ گئی۔

رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ تازہ ہوا اور گھاس کی ٹھنڈی ٹھنڈی نمی نے اس کے بدن کی تپش جذب کر لی اور وہ اوندھے منہ لیٹے لیٹے سو گئی۔

پھر جب گیٹ کھلنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو سورج اس کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر دیکھا وہی پھولوں والی لڑکی دوڑتی ہوئی آ رہی تھی' اس کے دراز سیاہ بال دوڑنے کی وجہ سے اس کے شانوں پر ناچ رہے تھے' لڑکی اسے دیکھ کر باڑ پھلانگتی ہوئی لان میں آ گئی۔

''وہ...... وہ کہاں ہے؟'' اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان لڑکی نے پوچھا۔ ''میں...... میں اسے بتانے آئی ہوں کہ میرا چچا اس کو تلاش کر رہا ہے۔''

''تم کسے پوچھ رہی ہو؟'' پری گل نے اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پیروں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں تو صرف میں اور میرا شوہر رہتے ہیں۔''

''میں تمہارے مالک مزمل کو تلاش کر رہی ہوں۔ جو اس حویلی کا مالک ہے۔'' لڑکی نے قدرے فخریہ انداز میں بتایا۔ ''تم ہی ہو نا پری گل...... چوکیدار کی بیوی؟''

پری گل نے آنکھیں موند کر غصے کو نگل لیا اور اثبات میں سر ہلانے لگی۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

''مجھے مزمل تک لے چلو۔'' اس نے حاکمانہ انداز میں کہا اور بالوں کو جھٹک کر سنوارنے لگی۔ ''میں گھر چھوڑ آئی ہوں' اس سے قبل کہ میرا چچا حویلی کا راستہ پہچان لے مجھے اور مزمل کو کچھ دنوں کے لیے گاؤں کی طرف نکل جانا چاہیے' مزمل نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ایک حویلی ادھر گاؤں میں بھی ہے۔''

''اچھا تو تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' پری گل نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

''ہاں......'' لڑکی نے پلکیں جھپکا کر بتایا۔ ''مزمل اسی وعدے پر تین ماہ سے میرے پاس رہ رہا ہے' آج رات جب اس نے میری کسی بات پر قہقہہ لگایا تو میرے چچا کی آنکھ کھل گئی' اگر میں اسے پچھلی کھڑکی سے بھگا نہ دیتی تو......'' وہ بولتے بولتے رک گئی اور اس کا ننھا سا نازک بدن انجانے خدشوں کے تحت کانپ اٹھا۔

پری گل نے لحظہ بھر سوچا اور پھر ایک فیصلہ کرکے مڑتے ہوئے بولی۔ ''مزمل تمہیں پائیں باغ میں کہیں سویا ہوا ملے گا' جاؤ اسے تلاش کرلو۔''

پری گل پر ساری باتیں روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھیں' اس نے پرسوں اخروٹ کے درخت کے نیچے جو سگریٹوں کے بے شمار ٹوٹے دیکھے تھے اور مسلی ہوئی گھاس...... جیسے وہاں گھاس کے بستر پر کوئی لیٹا سگریٹ پیتا رہا ہو...... یقیناً مزمل ہی وہاں سوتا ہوگا کیونکہ اوپر آنے کا راستہ وہ مقفل کرکے سوتی تھی۔

اندر داخل ہوکر اس نے کمرے پر نگاہ ڈالی۔

مزمل کی ہر چیز اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ نفرت اور دکھ کا احساس لحظہ لحظہ اپنا وجود پھیلاتا چلا جارہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی انگیٹھی تک گئی اور اس تصویر کو گھورنے لگی جس میں وہ دلہن کے سرخ جوڑے میں مزمل کے پہلو میں کھڑی تھی' اس کی پلکیں حیا سے جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر کامران مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔

''نہیں' تم جھوٹے' دغاباز اور بے وفا ہو۔'' اس نے فریم اٹھا کر ہاتھ اوپر کیا اور فرش پر دے مارا۔ کرچیاں بکھر گئیں' وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور تصویر اٹھا کر درمیان سے پھاڑ دی۔ اپنی تصویر رکھ کر مزمل کی تصویر پر اس نے تھوک دیا اور مسل کر کھلی کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ ''تم گندے ہو اور مجھے گندگی سے نفرت ہے۔''

اس نے کیل سے لٹکتی مزمل کی رائفل اتاری اور ایک گولی بھر کر باہر بالکونی میں جاکھڑی ہوئی' اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا' اس نے دونوں کو نیچے باغ میں آلو بخارے کے درخت کے نیچے دیکھ لیا۔

باغ پر بہار پورے جوبن پر تھی' مگر حسن پرست پری گل' سراپا خزاں بن چکی تھی۔ اسے ہر طرف خزاں ہی خزاں دکھائی دے رہی تھی' مزمل کی بے وفائی نے اس کو زندہ درگور کردیا تھا' اسے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ مزمل اس سے دور جاچکا ہے' وہ گھر جس کے لیے اس نے شدید محنت کی تھی' وہ گھر مزمل نے تباہ کردیا ہے۔

وہ دونوں درخت کے نیچے پھولوں کے تختے پر کھڑے راز و نیاز میں مصروف تھے۔

لڑکی کی مترنم ہنسی پری گل کی سماعت پر پتھروں کی طرح برس رہی تھی۔ مزمل مسلسل اسے گدگدائے جارہا تھا' لڑکی بل کھا کھا کر دہری ہورہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔

پری گل نے رائفل سیدھی کی اس کے نشانے پر مزمل کی چوڑی پشت تھی اور شانوں پر دو خوبصورت ہاتھ دکھائی دے رہے تھے' لڑکی ہنستے ہنستے نڈھال سی ہوکر مزمل سے لپٹ گئی تھی' معاً مزمل نے جھک کر ایسی حرکت کی' پری گل کا دل بھر آیا۔

''تم...... تم نشانے پر آؤ۔'' اس نے دانت پیس لیے۔ ''تمہی نے میری زندگی میں محرومیاں اور دکھ بھرے ہیں' تم نے ہی مجھ سے میرا شوہر چھین لیا ہے۔''

جب وہ ٹرائیگر دبانے لگی تو مزمل نے لڑکی کو بانہوں کے حصار میں لے لیا' اس طرح لڑکی کا آدھا بدن بھی نشانے کی زد سے نکل گیا۔

"صرف ایک...... تم میں سے ایک کو مرنا ہوگا۔"
پری گل زیرلب بولی۔ "تاکہ دوسرا میری طرح محرومی کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہے۔" "مزمل تم میرے اصل مجرم ہو۔ لڑکی کو تم نے تلاش کیا ہے۔ اسے یہاں تم لائے تھے' میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ تم میری آنکھوں کے سامنے اپنی چاہت کے غم میں جلو گے' میں تمہارے گندے خون سے اپنے ہاتھ ناپاک نہیں کروں گی۔"
رائفل پر اس کی گرفت یکدم ڈھیلی ہوگئی اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔
ایک طویل سانس لے کر اس نے ادھر دیکھا' وہ دونوں آہستہ آہستہ اپنی جگہ بدل رہے تھے' اب لڑکی کی پشت ادھر تھی لڑکی کا لباس پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اس کا کرتہ پشت پر چپکا ہوا تھا اور بال مزمل کی بانہوں پر بکھرے ہوئے تھے۔
"لوگ یقیناً مجھ سے بہت سارے سوال پوچھیں گے' پری گل نے نشانہ لیتے ہوئے سوچا' مگر میرے سارے سوالوں کا جواب صرف ایک گولی ہی دے گی' صرف ایک گولی۔
معاً مزمل نے لڑکی کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں لے کر اوپر اٹھایا اور اسے چادر سے پونچھنے لگا۔
پری گل کی گرفت رائفل پر خود بخود ڈھیلی ہوگئی اور نال جھک گئی۔
"مجھے...... مجھے بھی ابھی فرش صاف کرنے ہیں" اس کے اندر سے سوچ نے سر ابھارا۔ "فرنیچر کی گرد جھاڑنی ہے۔" وہ دیر تک گنگ سی کھڑی سوچتی رہی۔ پھر یک دم پلٹ کر دوڑنے لگی۔
جب جھاڑن سے وہ کرسی کا چہرہ صاف کررہی تھی تو اس کے آنسو فرش پر گر رہے تھے۔ اس کا ہاتھ تیزی سے کام میں مصروف تھا کہ اس کی سماعت سے ایک زوردار دھماکا ٹکرایا۔ جھاڑن اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ ابھی وہ بالکونی سے چند قدم دور ہی تھی کہ دوسرا دھماکا ہوا۔ دھماکا کچھ اتنا سماعت پاش تھا کہ پری گل لڑکھڑا سی گئی۔
اس کی نظر سب سے پہلے زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی لڑکی پر پڑی جو پھولوں کے تختے پر پڑی تڑپ رہی تھی' پھر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا جو آلو بخارے کے درخت کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور اس کی چھاتی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔
پری گل کا ذہن ماؤف سا ہو کر تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور گرتے گرتے اس نے ایک بوڑھے شخص کو دیوار پھاندتے اور دکانداروں کو حویلی کی طرف دوڑتے دیکھا...... پھر اسے اپنے گرنے کا بھی احساس نہ رہا۔
جب ہوش آیا تو اس نے اپنے چہرے پر ایک خوبصورت' سرخ و سپید اور مانوس چہرہ جھکا ہوا دیکھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھنے لگی لیکن نگہت نے بڑے نرم سے دباؤ سے اسے اٹھنے نہ دیا۔
"لیٹی رہو پری گل۔" نگہت کی ہمدرد آواز ابھری' کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ "امجد یہاں آیئے' پری گل کو ہوش آگیا ہے۔"
منع کرنے کے باوجود پری گل' امجد کی آمد پر تڑپ کر اٹھ بیٹھی' امجد نے اس کے کھلے بالوں پر تھپکی دی اور مہربان آواز میں بولا۔
"بیٹے اپنی آنٹی کو سلام کرو۔"
پری گل نے چہرہ گھما کر دیکھا' تین سالہ خوب رو صحت مند بچہ اس کے سرہانے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
اس نے لپک کر بچے کو بانہوں میں بھرا اور سینے سے چمٹا لیا' تب اسے محسوس ہوا اس کی کوکھ کی آگ یکدم سرد ہوگئی ہے۔ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بچے کے ساتھ حویلی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

روپ بہروپ

محمد سلیم اختر

اس دنیا میں لوگوں کے کئی روپ ہوتے ہیں' ہر روپ دوسرے سے جدا اور نرالا ہوتاہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے دنیا کو جان لیا ہے' سمجھ لیا ہے' جو بھی دنیا کے روپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے سامنے ایک نیا بہروپ سامنے آجاتا ہے۔

اس رنگ بدلتی دنیا کا احوال' نئے افق کے کنہ مشق لکھاری محمد سلیم اختر کے قلم سے ایک طویل ناول۔

چند لمحات سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ”لیبارٹری میں آپ مجھے جو تربیت دینا چاہتے ہیں اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں آپ کے چند ٹیسٹ لیے جائیں گے۔ اگر آپ ان فٹ ہو گئے تو مشن آپ کو دوسری پیشکش کرے گا اور اگر آپ ہمارے معیار پر پورے اترے تو پھر وہی طریقہ کار ہوگا جس کے بارے میں آپ کو بتا دیا گیا ہے۔ ہم اپنے طور پر آپ کو کسی بھی صورت مجبور نہیں کریں گے ایک بار پھر یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ صرف ایک دوستانہ پیشکش ہے' اگر آپ اس وقت اس سے انکار کر دیں گے تو ہم آپ کو بخوشی یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے عزت دیں گے اور اس کے بعد آپ کو وطن واپسی کا موقع دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن میرا اپنا اعتراض اپنی جگہ بالکل درست تھا۔“

”ہم نے تسلیم کیا ہے۔ ویسے مسٹر جہانزیب مستقبل کے لیے آپ کا اپنا نظریہ کیا تھا؟“

”وہی جو میرے جیسے کسی سرمایہ دار کا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے سرمائے کو نہایت احتیاط سے بڑھانا چاہتا تھا۔ اپنے وطن میں بہت سی صنعتیں لگا کر بہت سے منصوبوں پر کام کر کے میں اہلِ وطن کو بھی فائدہ پہنچانے کا خواہشمند تھا اور اپنے آپ کو بھی مالی طور پر بے حد مضبوط کرنے کا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود کو دنیا کے دولت مند ترین لوگوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا اور کوئی گہرا نظریہ نہیں ہے۔“

”تو پھر یہ سمجھ لیجیے کہ ہم آپ کو وہی سب کچھ دینا اور بنانا چاہتے ہیں۔ ہم ایشیا کی معیشت پر آپ کی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی نظریہ ہے' یہ اجارہ داری آپ کی ہوگی اور آپ کے ذریعے مشن کی۔ دراصل یہ بہت لمبا سلسلہ ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایشیا کے مختلف ممالک میں کوئی ایسی کارروائی ہو رہی ہوتی ہے جس کے اثرات دوسرے ممالک پر پڑیں تو آپ کو وہاں مداخلت کر کے تنظیم کے حق میں وہ کام کرنے ہوں گے جن سے صرف تنظیم کو یا اس کے ساتھی ملکوں کو فائدہ پہنچے۔ ہم ایک توازن قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں ایک طاقتور مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے' میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا مجھے کسی بھی سلسلے میں محکوم سمجھا جا رہا ہے۔“

”نہیں مسٹر جہانزیب۔ جسے اتنا بڑا منصب دیا جا رہا ہے وہ محکوم نہیں ہو سکتا۔ ساتھی ہو سکتا ہے۔“ میں خاموشی سے جولیا کی صورت دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔

”اب مجھے کیا کرنا ہے؟“

”بس صورت حال آپ کو بتا دی گئی۔ یہ رات آپ کے پاس سوچنے کے لیے ہے' صبح آپ تمام تر سچائیوں کے ساتھ ہمیں اس کی اجازت دیں گے کہ ہم آپ کو اپنی لیبارٹری میں پہنچا دیں۔“

”اس لیبارٹری میں کیا ہوگا۔ اس کی کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟ کم از کم یہ مجھے معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔“

”جی جی' کیوں نہیں۔ آپ کے چند جسمانی ٹیسٹ ہوں گے اور اس کے بعد اس تربیت کا آغاز ہو جائے گا جس کی مکمل تفصیل آپ کو بتا دی گئی ہے۔ اس دوران آپ کا ڈپلیکیٹ منظر عام پر رہ کر آپ کی نمائندگی کرے گا تاکہ کسی کو آپ کی غیر حاضری کا احساس نہ ہو سکے۔“ جولیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس سے میرے مفادات پر تو ضرب پڑ

سکتی ہے۔ فرض کیجئے یہ کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو میری شخصیت کے منافی ہو۔"

"نہیں اس سلسلے میں آپ کے خدشات بے جا ثابت ہوں گے۔"

میں نے گفتگو ختم کر دی اور اس کے بعد میری رہائش کے لیے ایک شاندار جگہ منتخب کی گئی، ہم سب لوگ اس بڑے ہال سے باہر نکل آئے۔ ان سب لوگوں نے مجھ سے رخصت چاہی اور اس کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ ایک ملازم نے مجھے تمام سہولتوں سے آگاہ کیا اور اس کے بعد دروازہ بند کر کے چلا گیا تھا لیکن میرے پاس سوچوں کا ایک طوفان تھا جو تنہائی پاتے ہی ذہن میں امڈ آیا تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔

دیر تک یہی خیالات ذہن میں کلبلاتے رہے۔ میں سوچتا رہا ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جو آخری تصور میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ میں اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کر دوں گا اور اس کے بعد گہری نیند میری آنکھوں میں آ بسی تھی۔

دوسری صبح جب جاگا تو طبیعت پر خوشگوار کیفیت طاری تھی۔ اسٹاک ہوم کا موسم عموماً یہی رہتا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ناشتا مجھے میرے کمرے ہی میں دیا گیا۔ باادب ملازمین میرے ساتھ نہایت احترام کا برتاؤ کر رہے تھے۔ البتہ ناشتا مجھے تنہا ہی کرنا پڑا۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی اخبار لے کر بیٹھ گیا جو میری میز پر رکھ دیا گیا تھا اور ابھی اخبار کی سرخیاں ہی پڑھی تھیں کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اندر داخل ہونے والی شیلی پارک تھی۔ شیلی نے مجھے خوشگوار انداز میں صبح بخیر کہا اور اجازت لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے اخبار ایک سمت رکھ دیا تھا۔

"یقیناً آپ خوشگوار کیفیات محسوس کر رہے ہوں گے مسٹر شاہ۔ مجھے آپ کے بارے میں تمام رپورٹیں مہیا کر دی گئیں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج آپ کے اعزاز میں مالمو کی دو سوسائٹیوں نے تقاریب رکھی ہیں۔ ایک شام کی چائے پر اور دوسری رات کے کھانے پر۔" میں خاموش نگاہوں سے شیلی کو دیکھتا رہا۔ شیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور کل کے اخبارات ایک ایشیائی سرمایہ دار کی آمد اور اس کی تقاریب کی تفصیلات شائع ہوں گی لیکن وہ آپ نہیں ہوں گے، کیا آپ کو اس بات کا مکمل علم ہے کہ......"

"کیوں نہیں مس پارک...... لیکن آپ اس بات سے کوئی خاص مقصد واضح کرنا چاہتی ہیں۔"

"سوری سر۔ بالکل نہیں بلکہ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ کو یہاں سے وہاں لے جاؤں، جہاں کی ہدایات آپ کو دی جا چکی ہیں۔"

"تو یہاں بھی آپ میری ہم سفر ہوں گی؟"

"اگر آپ پسند کریں، ہاں اگر آپ میرا ساتھ قبول نہ کرنا چاہیں تو مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ فوری اطلاع دوں تاکہ دوسرے افراد کا بندوبست کر دیا جائے۔" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ میں نے کہا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

نو بجے میں تیار ہو گیا اور ساڑھے نو بجے ایک گاڑی ہمیں لے کر چل پڑی۔ مجھے یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ میرے اس ہمشکل نے میری جگہ سنبھال لی ہے۔ یقینی طور پر اسے کسی بہتر جگہ منتقل کر دیا گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ بات قابل اعتراض تھی اور اس سے مجھے بہت سے خدشات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ بات آگے بڑھ کر میرے وطن تک بھی پہنچ سکتی تھی لیکن یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہاں ایک ایسا شخص

بیٹھا ہوا ہے جو بال کی کھال نکالنے میں ماہر ہے۔ اگر میرا کوئی ہمشکل میری جگہ میرے وطن پہنچ بھی جائے تو دنیا کو دھوکا دے لے گا لیکن آصف جوگی کو دھوکہ دینا اس کے لیے نہایت مشکل کام ہوگا۔ بہرطور مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ میں شیشوں سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا جو دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ اسٹاک ہوم میں زندگی مدھم مدھم تھی، غالباً کہر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھی جس کی وجہ سے کاروبار زندگی پر اثر پڑا تھا لیکن میرا سفر اتنا طویل ہو جائے گا اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ غالباً ہماری کار کا رُخ مضافاتی علاقے کی جانب تھا۔ اطراف میں دھند میں لپٹے خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جس کا مجھے کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔ غالباً کسی ذیلی سڑک پر کار موڑی گئی تھی اور اس کے بعد وہ کسی ایسی جگہ آ کھڑی ہوئی تھی جسے کوئی فیکٹری کہا جا سکتا تھا۔ تھوڑا سا گیٹ کھولا گیا تھا اور جس جگہ کار آ کر کھڑی ہوئی تھی وہ ایک سرسبز و شاداب لان تھا جسے وسیع ترین کہا جا سکتا تھا۔ لان کے درمیانی حصے میں، میں ایک ہیلی کاپٹر کو کھڑے ہوئے دیکھ رہا تھا جس کے قریب چند لوگ مستعد کھڑے تھے۔ کار سے اترنے کے بعد ہم نے لان کا وہ سرسبز حصہ پیدل طے کیا اور ہیلی کاپٹر تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں نے شیلی پارک سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے قریب کھڑے ہوئے دونوں افراد نے گردنیں خم کر کے ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھول دیا اور سیڑھی کے ذریعے ہم لوگ سوار ہو گئے۔

شیلی کو غالباً اس بات کا علم نہیں تھا کہ مجھے صورت حال کا کہاں تک علم ہے لیکن چونکہ میں نے ہیلی کاپٹر کے سفر پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ یہی سمجھی ہوگی کہ مجھے اس کی تفصیلات پہلے سے معلوم ہیں۔ وہ میرے نزدیک بیٹھ گئی، ہیلی کاپٹر میں ہمارے علاوہ صرف پائلٹ ہی سوار ہوا تھا۔ دوسرا آدمی جو اس کے ساتھ موجود تھا، اسے غالباً بس یہیں تک اہتمام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا۔ خراب موسم کی وجہ سے یہ سفر نہایت سست رفتاری سے کیا جا رہا تھا۔ راستے میں بھی شیلی نے مجھ سے کوئی خاص گفتگو نہیں کی۔ میں ہیلی کاپٹر کے شیشوں سے باہر جھانک رہا تھا لیکن نظر آنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ کاپٹر کا یہ سفر تقریباً اٹھارہ یا بیس منٹ تک جاری رہا اور اس کے بعد وہ نیچے اترنے لگا۔ میں نے نیلے سمندر کی جھلکیاں دیکھ لی تھیں۔ غالباً ہیلی کاپٹر کسی جزیرے پر اترا تھا۔ ویسے اب مجھے یہ اندازہ بہت اچھی طرح ہو گیا تھا کہ میری کسی بھی قسم کی جدوجہد بے مقصد ہو گی حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں ان سے مکمل تعاون کر رہا تھا اور میرا خیال یہی تھا کہ اب خوشدلی سے خود کو ان تمام کاموں کے لیے معاون ظاہر کروں جن کے لیے انہوں نے مجھے منتخب کیا ہے۔ ان تمام معاملات سے نمٹنے کے بعد بالآخر مجھے میرے وطن بھیجا جائے گا اور اس کے بعد فیصلہ میرے ہاتھ میں ہوگا، ہاں لیبارٹری میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اس سلسلے میں مجھے تھوڑی سی تشویش ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ میں پریشان ہو جاتا، جس ہیلی پیڈ پر ہم اترے تھے، وہاں ایک بند گاڑی کھڑی ہوئی تھی جو ہمارے سوار ہوتے ہی چل پڑی تھی۔ شیلی بدستور میرے ساتھ تھی اور بالکل ہی خاموش تھی۔

پھر ہم ایک اور عمارت میں پہنچ گئے اور یہاں بھی شیلی نے نیچے اُتر کر مودبانہ انداز مجھے آگے بڑھنے کی پیشکش کی۔ کچھ دیر کے بعد ہم اس عمارت کے

وسیع و عریض دروازے پر پہنچ گئے جہاں سے اندر داخل ہو کر ہمیں ایک بڑے ہال سے گزرنا پڑا۔ ایک دوسرے ہال میں پہنچ گئے جہاں چند افراد ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں برف جیسے سفید بالوں والا بہترین صحت کا مالک ایک شخص تھا جس کا بدن قدرے بھاری تھا۔ دوسرا بہت ہی سڈول جسامت کا ایک معمر آدمی تھا جس کے چہرے کی جھریاں اور آنکھوں کی چمک اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ وہ تجربہ کار اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ساتھ ہی ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہوئی تھی جس کے نقش و نگار پہلی نظر میں کچھ اور دوسری نظر میں کچھ اور تیسری نظر میں کچھ اور نظر آتے تھے۔ مجموعی طور پر اس کا تاثر خوبصورت تھا جسے دیکھ کر دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خصوصاً اس کی گہری اور حسین آنکھوں کی بناوٹ بہت ہی پیاری لگتی تھی۔ ان تینوں نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا' لڑکی تو کچھ دبی دبی سی تھی لیکن باقی دونوں افراد نے پرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ شیلی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ مسٹر کرامویل ہیں۔ اس لیبارٹری کے انچارج دنیا کے ذہین ترین سائنسدانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مشن کے لیے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ان کے اسسٹنٹ مسٹر ہڈسن' ہڈسن بھی اپنا ایک ایسا مقام رکھتے ہیں اور اس عمارت میں یہ دونوں آپ کے میزبان ہیں اور میرے لیے کیا حکم ہے۔ اب یہ فرما دیجیے مسٹر جہانزیب۔''

میں نے مسکرا کر شیلی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا میں ہدایات دینے کی پوزیشن میں ہوں؟''

''یقیناً مجھ سے یہی کہا گیا ہے کہ اگر مسٹر جہانزیب شاہ یہ حکم دیں کہ مجھے یہیں قیام کرنا ہے تو میں رکوں اور اگر انہیں میری ضرورت نہ ہو تو میں اسی ہیلی کاپٹر سے مالمو پہنچ جاؤں۔''

''مسٹر کول مین میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ ان دو معزز میزبانوں کی موجودگی میں مجھے آپ کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔'' شیلی نے سرد نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر صرف اوکے کہہ کر باہر نکل گئی۔ مسٹر کراموبل نے پرجوش انداز میں میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے میرا مکمل تعارف آپ سے نہ کرایا گیا ہو مسٹر شاہ۔ لیکن آپ کا مکمل تعارف مجھے حاصل ہے اور میں آپ کا میزبان بن کر نہایت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہ میڈم میلسا ہڈسن اور مسٹر ہڈسن کی صاحبزادی۔ ناقابلِ یقین شخصیت کی مالک ہیں۔ آپ ان کی ذہانت کو دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ آپ کے لیے تمام تر آسائشیں فراہم کرنے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے۔ چنانچہ اب ہم دونوں آپ کو خدا حافظ کہتے ہیں اور میڈم میلسا ہڈسن آپ کو یہاں تمام آسانیاں فراہم کریں گی۔''

مسٹر کراموبل اور ہڈسن نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد کمرے سے نکل گئے جبکہ مس ہڈسن نے باریک سی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا اور اس کے بعد بولی۔

''آیئے مسٹر شاہ۔'' میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ مجھے میرا کمرہ دکھا سکتی تھی جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ بلاشبہ ایک پرآسائش خوابگاہ میری منتظر تھی۔ مس ہڈسن نے نغمہ بار آواز میں کہا۔ ''آپ کو یہاں کسی چیز کی محسوس نہیں ہوگی۔'' میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

''بہتر ہے اب تقریباً ایک گھنٹا آپ آرام کریں

اس کے بعد میری آپ سے ملاقات ہوگی۔ ہاں اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو یہ بٹن دبا کر مجھے کال کر لیجئے گا۔ ویسے یہاں دو ملازمائیں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت موجود ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے پُر وقار انداز میں کہا۔ کسی ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ان لڑکیوں کو کیا کہا جائے جن کی آنکھوں میں یہی طلب ہمیشہ نظر آتی ہے کہ انہیں اہمیت دی جائے لیکن جن حالات سے میں گزر رہا تھا اس کے تحت ایسی حرکات سے اجتناب ضروری تھا۔ مس ہڈسن چلی گئی اور میں اس نئی جگہ بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ کیا ہوتا ہے۔ دوپہر تک کا وقت یہاں اسی جگہ گزارنا پڑا۔ میں نے خود بھی کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا اور نہ ہی مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔

کافی وقت گزر گیا۔ اچانک ایک اجنبی شکل اندر داخل ہوئی۔ یہ یقینی طور پر خادمہ تھی۔

"لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ براہ کرم میرے ساتھ تشریف لائیں۔" میں خاموشی سے اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر بال وغیرہ درست کئے اور پھر خادمہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی اور مجھے گائیڈ کرتی جا رہی تھی۔ عمارت کافی وسیع اور جدید ترین تھی۔ لنچ کے لیے مجھے ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہونا پڑا۔ وسیع و عریض میز پر مسٹر کراموئیل بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہلکے سے کرسی کھسکا کر مجھے خوش آمدید کہا اور ملازمہ نے میرے لیے ان کے سامنے والی کرسی کھسکا دی۔ اس کے بعد خاموشی سے لنچ شروع ہو گیا۔ لنچ کے بعد انہوں نے کہا۔

"ہم نے پوری دنیا یہاں قید کر رکھی ہے۔ یہ تمام تفصیلات میں آپ کو بتاتا ہوں۔" مسٹر کراموئیل نے کہا اور پھر مجھے ایسی عجیب و غریب باتیں بتائیں کہ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ میں نے ہار پرمشن کے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مسٹر کراموئیل مجھے بتاتے رہے کہ اس وقت دنیا میں کیا کیا کاروباری طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ کس ملک کی صنعتی پالیسی کیا ہے، کہاں کیا ہو رہا ہے اور خاص بات یہ تھی کہ ہر جگہ سے سیکنڈوں میں رابطہ قائم ہو جاتا تھا اور مسٹر کراموئیل وہاں سے سوالات کر لیا کرتے تھے۔ یہ تمام چیزیں کمپیوٹر کی مرہونِ منت تھیں اور اس وقت انتہائی مشینی دور میں داخل ہو چکی تھی۔ میں ہر چیز کو دیکھتا رہا اور مسٹر کراموئیل نے مجھے تمام تر صورت حال بتائی پھر کہنے لگے۔

"یہ لیبارٹری ہم نے دنیا کی عظیم ترین لیبارٹریوں کی طرز پر بنائی ہے اور یہاں وہ کچھ موجود ہے کہ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک بڑا سا ہال نہیں ہے بلکہ کائنات کا ایک حصہ ہے اور کوئی بھی گوشہ ہماری نگاہوں سے دور نہیں ہے لیکن اپنے مخصوص نظریات کی حد تک اس سے آگے کیا ہے یہ ہم نے نہ غور کیا اور نہ اس کے بارے میں اپنے پاس تفصیلات اکٹھی کیں۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تمام چیزیں دیکھتا اور ان کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ مسٹر کراموئیل نے کہا۔

"اور اب میں انتظار کر رہا ہوں اس وقت کا جب مجھے آپ کے بارے میں ہدایت دی جائے گی۔ آپ براہِ کرم یہاں بالکل پُرسکون رہیں اور کوئی اُلجھن محسوس نہ کریں یوں سمجھ لیجئے کہ خود مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو ذہنی طور پر ذرا بھی افسردہ نہ ہونے دوں اور اس کے لیے آپ کو اس عمارت میں مکمل آزادی ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے طور پر اس کی سیر کر سکتے ہیں۔ ہر شخص ہر جگہ آپ کی

رہنمائی کرے گا۔"

"اس کے لیے آپ کافی ہیں مسٹر کراموئیل اگر مجھے کوئی ضرورت پیش آئی تو میں آپ تک اپنا پیغام بھجوادوں گا۔ اس دوران مجھے مس ہڈسن یا مسٹر ہڈسن نظر نہیں آئے تھے۔ بہرطور مجھے پھر واپس اسی جگہ پہنچا دیا گیا جہاں میرا قیام تھا۔ ویسے میرا ذہن ان تمام چیزوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ واقعی ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے وہ قابلِ داد ہے لیکن ان کے نظریات سے متفق ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ اپنی اجارہ داری قائم کررہے تھے اور یہی پوزیشن فور ویل کی تھی۔ اس کے تھوڑے سے مقاصد مجھے معلوم ہو چکے تھے۔ وہ دنیا کے کسی بھی ملک کو اپنے طور پر آگے بڑھتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ سب کو اپنی پالیسیوں کے تحت چلانے کے انتظامات کررہے تھے اور اس طرح خصوصاً ترقی پذیر ممالک کے لیے کافی مشکلات پیدا کردی تھیں انہوں نے اب دیکھنا یہ تھا کہ مجھ پر ان کے اثرات کس حد تک قائم ہو جاتے ہیں۔"

شام کو تقریباً ساڑھے سات بجے ایک بار پھر مجھے مسٹر کراموئیل کا پیغام ملا اور میں اس خادمہ کے ساتھ چل پڑا۔ پھر جب خادمہ نے مجھے اسی لیبارٹری میں پہنچایا تو میں نے وہاں میڈم جولیا ایکسل کو دیکھا۔ ان کے ساتھ وہی باقی افراد بھی موجود تھے جو اس وقت مجھے نظر آئے تھے جب پہلی بار جولیا ایکسل سے میری ملاقات کرائی گئی تھی' اس وقت مسٹر ہڈسن بھی وہاں موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے دو معاون بھی تھے جو ایک خاص قسم کے لباس میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے کھڑے تھے۔ مسٹر کراموئیل نے مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا تمام ہی لوگوں نے مجھ سے ہاتھ ملائے اور پھر مسٹر کراموئیل نے کہا۔

"میڈم جولیا ایکسل کا خیال ہے کہ اب وہ عمل کر ڈالا جائے جس کے لیے آپ کو یہاں زحمت دی گئی ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بتائی جائیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کوئی خاص تفصیل نہیں ہے۔ ہمارے پاس یہ کچھ مشینیں ہیں جو آپ کا جسمانی جائزہ لیں گی اور آپ کی ذہنی قوتوں اور جسمانی قوتوں کا تجزیہ کیا جائے گا اس سے آپ کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ مکمل ہوش و حواس میں ہوں گے۔ اپنے طور پر سوچنے کے لیے عمل کرنے کے لیے آزاد ہاں جہاں آپ ہم پر پابندیاں لگانا چاہیں وہاں انگلی اٹھا کر ہم سے کہہ دیں کہ سب کچھ آپ نہیں کرنا چاہتے۔"

"کیا اس کا احترام کیا جائے گا؟"

"سو فیصد۔ ہم آپ سے مکمل تعاون کرنا چاہتے ہیں۔" اس بار جولیا ایکسل نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں اور اس کے بعد وہ لوگ مجھے ایسی جگہ لے گئے جہاں ایک گول پلیٹ لگی ہوئی تھی جو زمین سے تقریباً ایک فٹ اونچی اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس پلیٹ پر کھڑا کردیا گیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اس پلیٹ کے پچھلے حصے پر نظر ڈالی تو مجھے سیکڑوں تار اس سے منسلک محسوس ہوئے۔ میرے لباس کو بالکل نہیں چھوا گیا تھا۔ البتہ مجھ سے جوتے اتارنے کی درخواست کی گئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ مشینیں دھکیل کر میرے سامنے کردی گئی تھیں اور پھر مجھ سے مسٹر کراموئیل نے کہا کہ میں اپنے دونوں ہاتھ ان مشینوں کے دونوں سمت رکھ دوں' میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور میرا رابطہ مشینوں سے مکمل طور پر قائم ہو گیا۔ سامنے ہی ایک اسکرین روشن تھا

جس پر الفاظ میں میری کیفیات کی تحریریں آ رہی تھیں۔ مسٹر کراموئیل ایک مشین کو آپریٹ کرنے لگے۔ مس ہڈسن اور ہڈسن بھی ان کے ساتھ اسی مشین پر موجود تھے' مس ہڈسن خصوصی طور پر اس اسکرین کے سامنے تھی اور جو کچھ اس پر تحریری شکل میں آ رہا تھا' اسے زور سے دہرا رہی تھی۔ اس نے پہلا جملہ کہا۔

''جسمانی قوت' بے حد شاندار۔'' مسٹر کراموئیل نے تبدیلیاں کیں۔ یہ تحریر چند لمحات اسکرین پر رہی اور اس کے بعد دوسری تحریر آئی۔

''شاندار قوتِ برداشت۔'' مس ہڈسن نے کہا پھر تیسری تحریر آئی۔

''ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کی بہترین صلاحیت وقوت کا حامل تازہ ذہن جس کے تمام خلیے سفید ہیں اور ان پر کوئی دھبہ نظر نہیں آتا سوائے چند سرخ نقطوں کے جن میں ایک نقطہ کسی قدر سیاہ ہے۔'' مسٹر کراموئیل نے مزید کوششیں کیں اور میرے بارے میں بہت سی باتیں سامنے آتی رہیں لیکن میرے جسمانی نظام پر کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک یہ کارروائی جاری رہی اور اس کے بعد مسٹر کراموئیل نے مشینیں بند کر دیں پھر وہ کمپیوٹر پر میرے نمبر تلاش کرنے لگے ایک ہزار نمبر تھے اور اس وقت مسٹر کراموئیل ہی نہیں جولیا ایکسل اور دوسرے تمام لوگ حیران رہ گئے جب لائن کے بعد نیچے بھی ایک ہزار ہی نمبر نظر آئے جبکہ شاید ایسا پہلے نہ ہوا ہو۔ ان لوگوں کی حیرت سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

''ہزار میں سے ہزار۔'' جولیا ایکسل نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

''ناممکن۔ میرا خیال ہے پہلی بار یہ نمبر دیکھنے کو ملے ہیں۔'' ایک اور شخص نے کہا۔ تیسرا شخص بولا۔

''مسٹر کراموئیل کیا کہیں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔'' مسٹر کراموئیل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''قطعی نہیں۔ کیا آپ اس بات کی توقع رکھتے ہیں۔''

''لیکن ان حالات میں تو ہم ان صاحب کو سپرمین کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اتنے نمبر تو شاید کبھی تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ یہ تین دھبے البتہ قابلِ غور ہیں۔''

''ان کا تعلق ان کی خالص ذاتی زندگی سے ہے۔ مثلاً یہ سیاہ دھبہ کوئی ایسی نوعیت رکھتا ہے جو ان کے لیے کسی پریشانی اور دکھ کا باعث بنی ہے اور یہ مسلسل کچھ ایسے تاثرات ہو سکتے ہیں جو ان کے دل پر آج تک موجود ہوں اور یہ انہیں نہ بھلا سکیں۔ مثلاً عشق' محبت یا کسی ایسی شخصیت سے دلچسپی جو ان کے لیے بہت زیادہ باعث کشش رہی ہو۔ ان دھبوں کی نوعیت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

میں ششدر رہ گیا تھا' جو تجزیہ انہوں نے ان دھبوں کا کیا تھا وہ سو فیصد درست تھا۔ سیاہ دھبہ میری اپنی ذات کا ہو سکتا تھا۔ مسٹر کراموئیل کا یہ تجزیہ میرے لیے بھی حیران کن تھا۔ مشین سے اتارنے کے بعد مجھے جوتے پہنائے گئے۔ خادمہ نے اس سلسلے میں میری مدد کی تھی اور اس کے بعد وہ لوگ مجھے لے کر ایک نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ سب کے چہرے مسلسل حیرت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ خاص طور سے جولیا ایکسل مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''حقیقت یہ ہے مسٹر شاہ کہ ہم نے آپ کے بارے میں اس انداز میں اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہم آپ کی ذہنی قوتوں کو صرف اس لیے آزما رہے تھے کہ آپ ہمارے کس حد تک کام آ سکتے

ہیں لیکن یہ جو کچھ سامنے آیا ہے وہ اس قدر حیران کن ہے کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کو بھی ان تمام تفصیلات کے بعد کچھ نئی سوچوں کا شکار ہونا پڑے گا۔" میں ان الفاظ پر غور کرنے لگا۔ تمام لوگ خاموش ہو کر کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔

مجھے میرے کمرے تک لے آیا گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے تھے۔ البتہ مس ہڈسن کو یہاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ محتاط سی لڑکی میرے پاس آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"کیا مجھے آپ کو تنہا چھوڑ دینا چاہیے مسٹر شاہ!" اس نے عجیب سے انداز میں سوال کیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں لگتا ہے مس ہڈسن جیسے آپ کو میرے پاس رُکنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو۔ اگر آپ کی یہاں موجودگی ضروری نہیں ہے تو پھر آپ اپنے طور پر آزاد ہیں۔ اگر جانا پسند کریں تو چلی جائیے اور اگر بیٹھنا چاہیں تو ضرور بیٹھئے۔ مجھے خوشی ہوگی۔" اس نے اچٹتی ہوئی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے چہرے کے انداز میں تبدیلی رونما ہو گئی۔ چند لمحات وہ گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی' پھر اس نے کہا۔

"حقیقت یہی ہے کہ مجھے آپ کے پاس رکنے کی ہدایت کی گئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ آپ مجھ سے جو بھی گفتگو کریں اس پر نظر رکھوں۔ آپ کے احساسات کو محسوس کروں تاکہ انہیں بہتر رپورٹ دے سکوں۔" میں چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر میں نے کہا۔

"اور آپ یہ بات مجھے بتا رہی ہیں مس ہڈسن۔"

"اس کی کوئی خاص اور اہم وجہ نہیں ہے۔ میں نے یہ بات پہلے بھی ان لوگوں سے کہہ دی تھی کہ مجھے پر فریب گفتگو کرنا نہیں آتی اور میں اس کے لیے بالکل غیر موزوں رہوں گی۔ انہوں نے نہیں مانا نہ مانیں۔ میرا اپنا جو انداز ہے میں اسے ترک نہیں کر سکتی۔"

"آپ مجھے بہت اچھی خاتون معلوم ہوتی ہیں۔"

"اچھی ہوں یا بُری یہ ایک الگ چیز ہے۔ بس میں اپنے کام میں مصروف رہنا چاہتی ہوں' باقی جہاں تک دوسرے معاملات کا تعلق ہے تو میرے ڈیڈی نے پہلے ہی یہ بات ان لوگوں کو بتا دی تھی کہ ہم کسی اور مصرف کے لوگ نہیں ہیں۔"

"آپ کے ڈیڈی نے۔"

"ہاں میری مراد مسٹر ہڈسن سے ہے۔" میں عجیب نگاہوں سے میلسا کو دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"یوں لگتا ہے مس میلسا جیسے آپ یہاں خوش نہیں ہیں۔" وہ بھی نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔ ان آنکھوں میں عجیب سی کیفیات تھیں لیکن اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا اور اس عالم میں وہ گڑیا جیسی بہت حسین لگ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے بارے میں اگر کوئی رپورٹ دینے پر مجبور ہیں تو میں آپ کو اپنے احساسات خود بتائے دیتا ہوں۔ درحقیقت میں کافی اُلجھا ہوا ہوں۔ آپ جو الفاظ ان سے کہیں وہ یہی کہیں جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میں بہت اُلجھا ہوا ہوں کیونکہ میں بذات خود ایک مستحکم حیثیت کا مالک ہوں اور مجھے کسی کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سودا تھا جو اگر آسانی سے ہو جاتا تو مجھے زیادہ پسند آتا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ لوگ مجھ پر مسلط ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم میں ان سے بددل نہیں ہوں اور ان کی کارروائی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے جو پہلا ذہنی

جھٹکا لگا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے میرا ایک ہمشکل تیار کرلیا ہے۔ اس ہم شکل کے ذریعے انہوں نے میری حیثیت ختم کردی ہے اور اس بات کی مجھے تشویش ہے آپ ان الفاظ کو اپنے رنگ میں ڈھال کر انہیں رپورٹ دے سکتی ہیں مس ہڈسن۔ اس طرح آپ کی یہ مشکل تو حل ہوگئی اور مجھے اُمید ہے کہ اب آپ ذہنی طور پر اُلجھی ہوئی نہ ہوں گی۔"

وہ متحیرانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر مختلف رنگ آرہے تھے' پھر اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اور آپ نے یہ سب کچھ بتا دیا میرا مطلب ہے کہ آپ نے مجھ پر یہ بھروسا کیوں کرلیا؟"

"جانے دیجیے مس ہڈسن ان باتوں کو۔ انسان کو زندگی میں بہت سے ایسے لوگوں پر بھروسا کرنا ہوتا ہے' آپ کے چند الفاظ نے مجھے یہ احساس دلایا کہ آپ ایک نفیس خاتون ہیں اور صاف ستھری گفتگو پسند کرتی ہیں۔ میں نے آپ کے ذہن کو اُلجھنوں سے نکال لیا اور اگر اب ممکن ہو سکے تو آپ اس موضوع سے ہٹ کر گفتگو کیجیے۔"

"آپ بھی کم اچھے انسان نہیں ہیں مسٹر شاہ۔ درحقیقت میں یہی سوچ رہی ہوں کہ جو ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے' بھلا میں اسے کیسے پورا کرسکتا ہوں۔ کیا رپورٹ دوں گی انہیں اور کس طرح دوں گی لیکن اس کے لیے میں مجبور بھی تھی۔ آپ نے واقعی میری بہت بڑی مشکل حل کردی ہے اور میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔"

"چلئے ہم لوگ دوست بن جاتے ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کیا ہی حسین مسکراہٹ تھی۔ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا سو میں اسے دیکھتا رہا۔

اس نے کہا۔

"اور آپ مسٹر شاہ حیران کن شخصیت کے مالک ہیں۔ جو رپورٹیں آپ کے بارے میں مشینوں سے موصول ہوئی ہیں وہ ناقابل یقین تصور کی جاتی ہیں۔ گویا یہ کہنا درست ہے ان تمام لوگوں کا کہ آپ سپرمین جیسی شخصیت رکھتے ہیں۔ ورنہ جسمانی طور پر اس قدر رفٹ لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ آپ انتہائی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے مالک ہیں۔ مسٹر شاہ آپ نے کبھی اپنی ان قوتوں کو استعمال نہیں کیا۔"

"مجھے ان کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ انسان ذہنی طور پر طاقتور ہو۔ وہ بہت ساری باتیں سوچ سکتا ہے۔"

'شاید۔" آپ کا ویسے اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

"نہیں حیران میں بھی ہوں اور میرے ڈیڈی بھی' لیکن ابھی ہمارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہوسکی جس سے مجھے ڈیڈی کے خیالات کا اندازہ ہو۔"

"مسٹر ہڈسن یہاں کتنے عرصے سے کام کررہے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہار پر مشن کیلئے۔" وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی' پھر بولی۔

"تقریباً آٹھ یا نو سال ہوگئے۔"

"اس سے پہلے آپ لوگ کہاں تھے؟"

"بون میں۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ کے ڈیڈی؟"

"ابھی ان تمام تفصیلات میں نہ جائیے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے ڈیڈی بون میں رہتے تھے اور ایک اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ بہت عرصے سے ہم ہار پر مشن کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"آپ کے عزیز و اقارب اب بھی بون میں

ہوں گے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ لڑکی خاصی اُلجھی ہوئی تھی لیکن چند ہی لمحات میں تمام سوالات اس سے کر لینا آسان کام نہیں تھا اور نہ ہی مناسب تھا۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور پھر اس جگہ کے بارے میں اس سے پوچھنے لگا۔

☆☆☆

"مالمو میں یہ کونسا علاقہ ہے جہاں اس وقت ہم موجود ہیں؟"

"اس کا تعلق مالمو سے تو نہیں' ہاں مالمو سے شمال مغرب میں کافی فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ جگہ جزیرہ نما ہے۔"

"اوہو میں اسے صرف جزیرہ سمجھتا تھا۔"

"نہیں یہاں سے خشکی کا راستہ دوسرے شہروں کی جانب نکل جاتا ہے لیکن درمیان میں بڑے پُرخطر علاقے پڑتے ہیں۔ اس لیے اسے عام گزرگاہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہ برفانی تو دوں کی سرزمین ہے اور تقریباً ناقابلِ عبور ہی سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ تر سفر اسٹیمروں کے ذریعے ہوتا ہے یا پھر خصوصی طور پر ہیلی کاپٹر استعمال کیا جاتا ہے۔ خشکی کے راستے میرا مطلب ہے برفانی راستے سے گزرنا تقریباً ناممکن تصور کرلیا گیا ہے۔"

"بہت خوب' بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں آپ نے مجھے۔"

"میرا خیال ہے اگر آپ پسند کریں تو آپ کو یہاں کی سیر کرائی جاسکتی ہے۔"

"اس کے ذرائع ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ ہم ایک مخصوص جگہ تک بذریعہ جیپ سفر کرسکتے ہیں' بس وہاں سے آگے بڑھنے کا معاملہ ذرا پُرخطر ہوجائے گا۔ اس لیے ادھر کا رخ نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے اسٹیمر بھی موجود ہیں جن کے ذریعے سیر کی جاسکتی ہے اور مجھے یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ آپ کو اس دوران مطمئن رکھا جائے۔ چنانچہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی افسرِ سیاحت میں ہی ہوں۔ اگر آپ کسی قسم کی خواہش محسوس کریں تو مجھے اس کے بارے میں بتا دیجئے گا۔"

"سوری مس ہڈسن' آپ کے ڈیڈی کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا؟"

"نہیں' اس لیے کہ ڈیڈی بھی ان کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور ہیں۔"

"مجبور؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور وہ بھی جیسے سنبھل گئی۔ اس نے کہا۔

"دیکھئے آپ اتنے اچھے انسان ہیں کہ میں آپ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن پلیز ایسے چبھتے ہوئے سوالات نہ کریں جن کے جواب اگر میں غلط فہمی میں آ کر دے بھی جاؤں تو مجھے بعد میں ان کا نقصان اُٹھانا پڑے۔ یہ ہمارے درمیان ایک دوستانہ کیفیت ہوگی اور میں اس کے لیے آپ سے درخواست کرسکتی ہوں۔"

اس کے ان الفاظ سے مجھے مکمل طور پر اس بات کا یقین ہوگیا کہ دونوں باپ بیٹی کسی ایسے جال میں گرفتار ہیں جس سے وہ خوش نہیں ہیں اور اب ان الفاظ کی روشنی میں مجھے مسٹر ہڈسن کی کیفیت کا احساس بھی ہوتا تھا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ اور دبی دبی فطرت کے مالک تھے جب کہ مسٹر کراموئیل خاصے ہشاش بشاش اور تیز طرار آدمی نظر آتے تھے چونکہ اس نے اس سلسلے میں مجھے منع کیا تھا چنانچہ اس وقت اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ مجھے اس اپنے جزیرہ کی سیر کرائیں۔''

''اس کا بندوبست ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور کچھ دیر بعد میرے پاس سے چلی گئی۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ یہ جو سب کچھ ہو رہا تھا اس کے لیے میں نے خود کو آمادہ تو کر لیا تھا لیکن اب یہاں آ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ کچھ اُلجھنیں پیش آ سکتی ہیں لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ بھلا مجھ جیسے معمولی آدمی کو جس نے بسوں کی صفائی کر کے بسوں میں راتیں گزاری تھیں۔ یہ سب کچھ خواب ہی محسوس ہوتا تھا جو میرے سامنے تھا۔ اتنی بڑی حیثیت حاصل ہوئی تھی مجھے کہ شاید میرے جیسی حیثیت کا کوئی نوجوان عالم خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اب وقت نے جب یہ مقام دیا تھا تو وقت ہی کے سہارے اپنے آپ کو آگے بڑھانا تھا۔ بہت زیادہ جدوجہد اور ذہانت کا مظاہرہ بھی بعض اوقات مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہے اور یہ مصیبتیں میں خود پر نازل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خاموشی سے دیکھتے رہنا ہی مناسب تھا۔ دوسرے دن ایک شاندار جیپ کے ذریعے مجھے جزیرہ کی سیر کرائی گئی۔ میری معاون اور رہنما مس ہڈسن ہی تھی' جیپ کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا' اس نے سر پر ایک بڑا رومال باندھا ہوا تھا۔ اس کے سراپا سے اُٹھنے والی مہک بے خود کر دینے والی تھی۔ مگر میں خود کو سنبھالے رہا۔ میں اس کے ساتھ جزیرہ کے برفانی مقامات کی سیر کرتا رہا۔ ہر لحاظ سے ایک مکمل جگہ تھی۔ تھوڑا ہٹ کر سمندر کا نیلا پانی تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا اور آسمان کی وسعتیں اس سے لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ برف کی سرزمین پر درخت بھی نہائے کھڑے ہوئے تھے' یہاں سفید خرگوشوں کی بھرمار تھی جو اس طرح چوکڑیاں بھرتے پھر رہے تھے کہ کہیں بھی انہیں ہاتھ بڑھاؤ یا پکڑ لو یا ان کے قریب ہو جاؤ۔ اکثر جیپ کو ان کی وجہ سے رکنا پڑتا تھا وہ بھی شاید مانوس تھے چونکہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس سے بہت سے سوالات کیے اس نے بتایا کہ ویسے تو یہ علاقے صاف ستھرے ہیں لیکن کبھی کبھی برفانی ریچھ کے ٹولے کے ٹولے آ جاتے ہیں اور اس وقت خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دُور دُور تک جانے کی ممانعت ہو جاتی ہے۔ موسم کے ختم ہونے کے ساتھ یہ ریچھ واپس چلے جاتے ہیں۔''

''یہاں آپ لوگوں کے علاوہ اور بھی کوئی آبادی ہے؟''

''ارے نہیں' داہنی سمت جدھر سے ہم ابھی تک نہیں گزرے باقاعدہ آبادی ہے' لوگ رہتے ہیں اور زندگی کے معمولات میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے اور یہ مختلف قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔''

''آمدورفت کا ذریعہ؟''

''اسٹیمر۔ یہ صرف سمندری راستے استعمال کرتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی قافلے خشکی کے راستے بھی وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن دوبارہ کسی کا حوصلہ نہیں ہوتا کہ ان راستوں سے سفر کرے۔ بس یہ مہم جو قسم کے لوگ ہوتے ہیں' جو کبھی ٹولیاں بنا کر ادھر سے نکل جاتے ہیں۔''

دوسرا دن بھی میلسا کے ساتھ سیاحت میں گزرا۔ البتہ تیسرے دن ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی' غالباً کوئی آیا تھا اور آنے والی جولیا تھی جسے میں نے دور سے دیکھ لیا تھا۔ جولیا سے بہت دیر میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن بعد میں وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ

نکھری نکھری اور تر و تازہ نظر آتی تھی۔ میں نے البتہ سرد مہری سے اس کا استقبال کیا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور ہنس کر بولی۔

''سپر مین کو کسی بھی طرح ذہنی طور پر کمتر سمجھنا خود سمجھنے والے کی حماقت ہے۔ میں اگر الفاظ کا ہیر پھیر کروں تو مجھے خود ہی شرمندگی ہوگی۔ کہنا یہ چاہتی ہوں کہ آپ کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتے مسٹر شاہ۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''عجیب باتیں کرتی ہیں آپ مس جولیا' آپ کے خیال میں مجھے خوش ہونا چاہیے؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے میرے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اب تک کی زندگی نہایت مصروف اور آزاد گزاری ہے۔ ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں مجھے مکمل طور پر علم بھی نہیں ہے۔ میری مجبور اَر ہائش کیا مجھے خوش رکھ سکتی ہے؟'' اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ یقینی طور پر بوریت محسوس کر رہے ہیں۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ اپنی مصروفیات کی زندگی سے تھک کر گوشہ نشین ہو گئے ہوں اور آپ نے کچھ دن ایسی جگہ گزارے ہوں جس کا آپ کی کاروباری زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔''

''ہوا ہے میڈم جولیا۔ لیکن اُس وقت میں نے خود کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار سمجھا ہے۔''

''کیا یہاں آپ کی خود مختاری میں کوئی خلل اندازی کی گئی ہے؟''

''نہیں' اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں نے اب تک تمام لوگوں سے مکمل تعاون کیا ہے اور کوئی ایسا انحراف نہیں کیا جس سے کسی کو میرے معمولات پر پہرا لگانے کی ضرورت پیش آتی۔''

ہاں مجھے اس کا علم ہے لیکن براہِ کرم سوچنے کے انداز کو ذرا سا تبدیل کیجئے مسٹر شاہ! درحقیقت کچھ ایسے عوامل ہیں جن کی بنا پر یہ ضرورت پیش آئی۔ آپ بذاتِ خود ایک مکمل انسان ہیں لیکن ہم چونکہ ایک بہت بڑی قیادت آپ کو سونپ رہے ہیں اس لیے اپنے طور پر احتیاط کر لینا چاہتے ہیں۔ اس کی تفصیل تو آپ کو بتائی ہی جا چکی ہے کیونکہ آپ اپنا عہدہ سنبھالیں گے اور ہار پر مشن کے ایک بہت ہی مضبوط ستون کی حیثیت سے یہ ذمہ داریاں قبول کریں گے تو آپ کو ایشیا کے بیشتر ممالک کے ذہین ترین دماغوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں جن کے لیے آپ کو جسمانی طور پر بھی مصروف ہونا پڑے۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان چیزوں میں آپ کو اپنے وسائل کے مطابق مکمل کر کے آپ کی دنیا میں واپس بھیجا جائے اور اس کے لیے تھوڑا سا انتظار ہو رہا ہے۔''

''آپ کو علم ہے کہ میں جس پیمانے پر بھی اپنا کاروبار کر رہا تھا' وہ میرے لیے ناقابلِ قبول یا ناپسندیدہ نہیں تھا اور میں مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ یہ بیکاری ایک طرح سے میرے لیے مجبوری بن گئی ہے کیونکہ میں آپ لوگوں کی دعوت پر یہاں آیا ہوں لیکن اس مجبوری کو میں بخوشی تسلیم نہیں کر سکتا۔''

''صرف اتنا عرض کر سکتی ہوں مسٹر شاہ کہ اس تعاون کے صلے میں آپ کو جو کچھ ملے گا آپ اس سے بہت خوش ہوں گے۔''

''بہرحال میڈم اس کے بعد مجھے کتنا عرصہ یہاں گزارنا ہوگا۔''

"بہت مختصر۔"

"میں اس سلسلے میں پریشان بھی ہوں' جس شخص کو آپ نے میری حیثیت دی ہے پتا نہیں وہ میرے معیار کی گفتگو کرتا ہے یا نہیں وہ میرے معیار کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں اور اس کی کسی غلط حرکت سے میرے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا۔"

"آپ یقین کیجئے اس سلسلے میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس شخص کو آپ کی حیثیت سے منظر عام پر صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ لوگ حقیقت کو نہ سمجھنے پائیں۔ وہ دو ایک تقاریب میں مصروف ہونے کے بعد ایک جگہ قیام پذیر ہے اور اس کی تمام کارروائی محدود کردی گئی ہے۔ تاہم آپ اطمینان رکھئے کہ صرف ایک ہفتہ آپ کا اور یہاں صرف ہوگا اور اس کے بعد آپ ان تمام تر اعزازات کے بعد اپنے وطن واپس جاسکیں گے۔"

"دن نوٹ کرلیجئے میڈم جولیا آپ۔ اس کے بعد شاید میں آپ کے ساتھ تعاون نہ کرسکوں۔"

"آپ کی تمام اُلجھنوں کا ہم پورا پورا خیال رکھیں گے کیونکہ مستقبل میں ہمیں بہترین دوستوں کی مانند ساتھ رہنا ہے۔" جولیا تھوڑی دیر تک بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی اس نے مجھے بتایا کہ میرے وطن میں میری مصروفیات کی تفصیلات شائع ہوتی رہتی ہیں اور نہایت اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی بھی طور میرے لیے اُلجھن کا باعث بن سکے۔ پھر وہ چلی گئی' مجھے یہ نہیں پتا چلا کہ بعد میں وہ یہاں سے واپس کب گئی' البتہ ہیلی کا پٹر جاچکا تھا۔

"اسی رات مسٹر کراموئیل نے ڈنر کے بعد مجھ سے ملاقات کی' کہنے لگے۔

"اور اب مجھے ہدایت دی گئی ہے مسٹر جہانزیب شاہ کہ اپنے وہ عمل آپ پر آزماؤں جن کے بعد آپ یہاں سے واپس چلے جائیں اور ہار پر مشن کے ذمہ دار ارکان آپ سے مطمئن ہوجائیں۔"

"ان کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں' کرنا تو ہمیں ہوگا میرا خیال ہے اس وقت سوا دس بج رہے ہیں۔ ٹھیک گیارہ بجے آپ کو لیبارٹری جانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مجھے اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ مسٹر کراموئیل اس کے بعد چلے گئے تھے اور میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کررہا تھا۔ یہ ناگہانی پیش آئی تھی لیکن ہوسکتا ہے اس کے بعد کچھ بہتری پیدا ہوجائے۔ گیارہ بجے مجھے اسی لیبارٹری میں لے جایا گیا اور یہاں چند افراد مجھ پر مصروف ہوگئے۔ سب سے پہلے مجھے لباس سے عاری کردیا گیا۔ صرف جسم کے مخصوص حصوں پر ایک لباس دے دیا گیا تھا۔ پھر میرے جسم پر ایک محلول کی مالش کی گئی اور اس کے بعد چند منٹ انتظار کیا گیا۔ پھر وہ لوگ مجھے لے کر ایک میز پر آگئے اور مجھے اس پر لٹا دیا گیا۔ کراموئیل' ہڈسن اور میلسا ہڈسن چند معاونوں کے ساتھ مجھ پر کارروائیاں کرنے میں مصروف تھے۔ ایک خاص قسم کی مشین میرے سر سے تقریباً تین فٹ اوپر لاکرفٹ کردی گئی اور اس کے بعد وہ لوگ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہوگئے۔ مشین سے ٹھنڈی نیلی شعائیں بلند ہوئیں اور اس کے بعد میں ان کے دائرے میں جکڑا گیا۔ میرے ہوش و حواس قائم تھے لیکن میرے پورے بدن کو ایک عجیب سے سرور کا احساس ہورہا تھا۔ دماغ میں ٹھنڈک پیدا ہوگئی تھی اور میرا آخری احساس یہی تھا کہ دیکھئے اب میرا کیا بنتا ہے۔ پھر اس کے بعد میرے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے اور میں ایک عجیب

سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا' جسے نہ بے ہوشی کہا جا سکتا تھا نہ ہوش۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں زمین کی پستیوں سے کچھ بلند ہوں اور میرے اردگرد عجیب و غریب مسئلے پھیلے ہوئے ہیں۔ کبھی میں خود کو کسی اُلجھن میں گرفتار پاتا اور کبھی میرا جسم بالکل ہلکا محسوس ہوتا لیکن یہ سب عالم ہوش میں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خلاؤں میں تیر رہا ہوں۔ جسمانی کیفیت بالکل بہتر تھی۔ کبھی یہ محسوس کرتا کہ میرے اعضاء کسی خاص مشینی انداز میں عمل کر رہے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو خلا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے پاتا' اسی طرح وقت گزرتا رہا اور جب حواس واپس آئے تو میں ایک نرم اور آرام دہ بستر پر دراز تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن ہوش و حواس مکمل طور پر کام کر رہے تھے۔ مجھے اپنے بدن کے نیچے بستر کا احساس ہو رہا تھا مگر میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ جسم میں کوئی کمزوری' تھکن یا تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی بلکہ ایک عجیب سی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ بالآخر میں نے آنکھیں کھول دیں' پتہ نہیں کون سی جگہ تھی۔ یہ ہوش اور بیہوشی کے لمحات دیر تک میرے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس دوران میں بہت سی ایسی چیزوں سے آشنا ہو گیا ہوں جن کے بارے میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ اس میں مارشل آرٹس کے داؤ پیچ بھی شامل تھے۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ عالم بے ہوشی میں' میں نے جسمانی طور پر وہ تربیت حاصل کی تھی جسے مارشل آرٹ کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال یہ عجیب و غریب انداز تھا۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ اس دوران شاید میں نے آنکھیں کھول لی تھیں اور چھت کو گھورتا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میرے سینے پر ایک نرم و نازک ہاتھ آ ٹکا اور میں نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر کے اس طرف دیکھا میلسا ہڈسن تھی جو نرس کے سفید لباس میں ملبوس میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ درحقیقت اس کی مسکراہٹ ایسی تھی کہ اس کے بعد انسان کی ذہنی کیفیت خراب نہیں رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی' میں نے چند لمحات اسے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''کیا میں اُٹھ کر بیٹھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے جواب دیا اور میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس کے بعد پھیکے سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''تو تم لوگوں نے میری اچھی خاصی درگت بنا ڈالی ہے۔'' میلسا ہنس پڑی۔ پھر اس نے کہا۔

''اگر کسی بھی ہوش مند آدمی کو اس درگت کی پیشکش کی جاتی اور اسے یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی اپنی کیا کیفیت ہو گی تو شاید وہ اپنی زندگی کا تمام تر سرمایہ دے کر یہ درگت بنوانا پسند کرتا۔''

''بہت بڑا احسان کیا ہے آپ لوگوں نے مجھ پر۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اوہو سوری مسٹر شاہ۔ آپ شاید بہت زیادہ ناراض ہو گئے ہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے' مجھے یہ بتایئے۔''

''براہِ کرم یہ گاؤن پہن لیجئے۔ اس کے بعد آپ کو مسٹر کرامویل سے ملنا ہو گا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کے ہوش میں آ جانے کے بعد میں آپ کو ان تک لے آؤں۔'' وہ محتاط ہو گئی۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق گون پہنا اور اس کے بعد مجھے میلسا ہڈسن کے ساتھ واپس اسی لیبارٹری میں جانا پڑا۔ مسٹر کرامویل مجھے دیکھ کر خوشی سے مسکرا

اُٹھے پھر انہوں نے تعریفی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"درحقیقت ہم نے ہارپرمشن کے لیے ایک فولادی چیتا تیار کیا ہے' جو جسمانی طور پر انتہائی طاقتور' ذہنی طور پر بے پناہ قوتوں کا حامل اور ان تمام ضروری فنون سے آراستہ ہے جو جدید دنیا میں اپنے دشمنوں کو نیچے دکھانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے مسٹر شاہ کہ آپ کو کچھ ذمہ داریاں سونپنی تھیں لیکن یہ بھی ایک بڑی سچائی ہے کہ آپ کی اپنی قدرتی حیثیت کی بنا پر ہارپرمشن نے آپ پر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو صرف کردیا اور آپ کی شکل میں ایک ایسا شخص تیار کرلیا گیا ہے جسے قطعی طور پر مشینی نہیں کہا جاسکتا لیکن جو لاتعداد انسانوں میں بڑی حیثیت کا مالک ہے اور اس جیسے کسی دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔" میں سرد نگاہوں سے کراموبل کو دیکھ رہا تھا۔ کراموبل نے میری طرف توجہ دیئے بغیر بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہارپرمشن کے کرتا دھرتا اپنی کارروائیوں سے بے حد خوش تھے۔ اس کا اندازہ ان کی کیفیات سے ہوتا تھا۔ مسٹر کراموبل اپنا کام پورا کرچکے تھے اور انہوں نے اپنے طور پر میرے لیے مکمل اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ یعنی وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے اس کی تکمیل بڑے شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔ مجھے ابھی یہیں رکھا گیا تھا اور اس سلسلے میں ابھی تک میری ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ مجھے کتنا عرصہ یہاں رہنا پڑے گا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ظاہر ہے کسی قسم کا بے چینی کا اظہار میری کمزوری سمجھا جاتا اور میں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فوروییے بھی میرے لیے کوئی ناپسندیدہ جگہ نہیں تھی۔ البتہ کبھی کبھی یہ احساس ضرور ہوتا تھا وہ شخص جو میرے میک اپ میں میری جگہ لیے ہوئے ہے کہیں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے میری ذات داغدار ہو جائے۔ ویسے مسائل اور بھی بہت سے تھے لیکن وہی بات کہ اکیلی جان سے کون کون سے مسائل منسلک رکھتا وہ دھبے جو میرے دماغ پر دریافت کیئے گئے تھے اہم ترین تھے لیکن ہر چیز تو اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ انہیں کیسے مٹایا جاسکتا تھا' چنانچہ اس کے لیے سوائے صبر کرنے کے میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہاں موجودہ مسائل ذرا قابلِ غور تھے۔ یہ نہیں سوچا تھا میں نے کہ ہارپرمشن سے یہ معاملات طے کرنے کے سلسلے میں اس طرح ان کے چنگل میں آپ پھنسنا پڑے گا۔ میری تکمیل کے بعد مجھے ایک تماشا بنا لیا گیا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ آتے تھے۔ اندازہ یہ ہوتا تھا کہ ان کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔ مسٹر کراموبل ان کا استقبال کرتے عموماً جولیا ان کے ساتھ ہوتی۔ غالباً وہ افسر سیاحت تھی یا پھر میری انچارج۔ کیونکہ وہی مجھے مختلف لوگوں سے متعارف کراتی تھی' وہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ دنیا کی اقتصادیات کے بارے میں مجھ سے بڑی اُلجھی بحثیں کی جاتیں اور میں نہایت سلجھے ہوئے انداز میں انہیں جواب دیتا۔ جس وقت میں یہ جواب دے رہا ہوتا مجھے اپنے ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ سوائے اس حیرت کے جو خود میرے اپنے دل میں ہوا کرتی تھی اور وہ حیرت اس بنیاد پر تھی کہ میں دنیا کی اقتصادیات کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہوں۔ میری کوئی تربیت نہیں تھی بلکہ بلاشبہ یہ ہارپرمشن کے کرتا دھرتاؤں کا کام تھا اور میں جب بھی اس بارے میں سوچتا تو انہیں داد دیئے بغیر نہیں

رہ پاتا تھا۔

بارہا تنہائیوں میں میں نے اپنی ذات کا تجزیہ کیا اور یہ سوچا کہ میں کیا کچھ بن گیا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اندر ایک قوت پرواز پیدا ہو گئی ہو۔ میں زمین سے اُڑ کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہوں اور وہاں سے زمین کے رہنے والوں کے مسائل دیکھ سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں ان مسائل کا حل موجود ہے۔ کم از کم میں کسی بھی ملک کی بنیادی پالیسی کے بارے میں ان ممالک کے ماہر اقتصادیات سے زیادہ جانتا ہوں اور جب یہ احساس میرے دل میں جاگزیں ہوتا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہتی۔ ہاں اس کے ساتھ ہی میرے اپنے دل میں اپنے وطن اپنے پیارے پاکستان کا تصور بھی جاگتا اور میں یہ سوچتا کہ وہ وقت جس قدر جلد آ جائے اچھا ہے جب میں اپنے وطن میں پہنچ جاؤں۔

پھر کچھ مہمانوں سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ یہ لوگ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے باشندے تھے۔ بار بار مشن کے نمائندے مجھ سے بہت سی باتیں کرتے رہے۔ ایشیا کی جغرافیائی کیفیت کے بارے میں اور وہاں کی موجودہ صورت حال کے بارے میں میری ان لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ چلے تو گئے مگر جولیا میرے پاس ہی رہ گئی۔ مجھے ساتھ لے کر تجربے گاہ سے باہر نکل آئی اور ہم ٹہلتے ہوئے دُور تک پہنچ گئے۔ اس کی مسکراتی نگاہوں میں نجانے کون کون سے جذبات مچل رہے تھے۔

''میرا خیال ہے یہاں کچھ دیر بیٹھا جائے۔'' وہ ایک جانب پڑے ہوئے درخت کے تنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔

جولیا نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی پھر مجھ سے بولی۔

''تمہیں اُکتاہٹ تو نہیں ہو رہی شاہ؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں میڈم۔ ظاہر ہے مجھے یہاں ایک مقصد کے تحت رکھا گیا ہے اور مقصد کی تکمیل ہی بنیادی چیز ہے۔ اس میں اکتاہٹوں کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاں یقیناً۔'' ویسے تم مانو یا نہ مانو مشن کو تمہاری شکل میں ایک شاندار نمائندہ ملا ہے۔ سب کو اُمید ہے کہ تم مشن کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھاؤ گے مگر بہر حال تم انسان ہو ہر انسان کی اپنی بھی کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔ انسان اور مشین میں فرق ہوتا ہے نا۔ مشینوں کے پاس اپنی سوچ نہیں ہوتی جذبات نہیں ہوتے' جبکہ انسان اس بے بسی کا شکار ہے۔ اس کے اپنے جذبات بھی اسے مفلوج کر دیتے ہیں' اچھا تم یہ بتاؤ واپس جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟'' میں ہنس پڑا میں نے کہا۔

''اسی انداز میں زندگی گزاروں گا جس انداز میں گزارتا رہا ہوں۔ مشن نے جو ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں ان کی تکمیل بھی کرنا ہے مجھے۔ گو ابھی تک اس کی تفصیلات میرے پاس نہیں ہیں۔''

''اور اپنے لیے کیا کرو گے؟''

''یہ سب کچھ اپنے لیے ہی ہو گا۔ میڈم جولیا میں اگر ان تمام چیزوں کا خواہشمند نہ ہوتا تو زندگی اپنی دولت کے سہارے ایک گمنام گوشے میں گزاری جا سکتی تھی۔ جتنی دولت میرے پاس ہے میرا خیال ہے میری موت کے بعد بھی دوسروں کے کام آئی اور مجھے اپنی پسند کی زندگی گزارنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ لیکن بس انسانی سوچ ہے۔ نجانے کیوں وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے' جو اس کی ضرورت سے بھی

الگ چیز ہوتی ہے۔ شہرت نام' حیثیت یہ ضرورتوں کی تکمیل کے بعد خواہشوں کی شکل میں بیدار ہوتی ہے اور انسان اپنی عام ضرورتوں کی تکمیل کے بعد ان چیزوں کے حصول میں کوشاں ہو جاتا ہے۔ نجانے اس کے بعد کیا ہوگا' اس کا اندازہ مجھے ابھی نہیں۔"

"خواہشات میں اور کچھ شامل نہیں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"عورت؟" میں نے پوچھا اور وہ ہنس پڑی۔

"تمہیں اسی طرح یہ سوال کرنا چاہیے تھا۔"

"سوال درست ہے نا؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"میں نہیں جانتا میڈم جولیا کہ اس سلسلے میں میرے دل میں کوئی تصور کیوں بیدار نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کوئی ایک لمحہ اس خواہش کا سبب بن جائے اور میں اس بارے میں سوچنے لگوں۔"

"اور اگر کوئی اور تمہارے بارے میں سوچے تو؟"

"یہ اس کا اپنا مسئلہ ہوگا۔" میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

"اس کی سوچ کی تکمیل میں تم اس کی کوئی مدد کر سکو گے؟"

"یہ وقت پر منحصر ہے۔ میں وقت سے پہلے کیسے کہہ سکتا ہوں۔"

"تم بے حد پرکشش نوجوان ہو اور درحقیقت تمہارے قریب آنے کے بعد دور جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ایشیا کا سارا حسن تمہارے اندر سما گیا ہے۔ شاید ہی کوئی لڑکی تمہیں نظر انداز کر سکے۔ مجھے تم نے خاصا متاثر کیا ہے' تمہارا قرب مجھے بے خود کر دیتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں تمہارے سنگ ایشیا دیکھوں۔ تمہاری نگاہوں سے وہاں کی روایات کا مشاہدہ کروں۔"

جواباً میں اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس وقت مجھے وہ بالکل ایک عام سی لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کی بھی وہی خواہشات تھیں کہ کوئی اسے چاہے' اس کے حسن کو سراہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ لڑکیاں چاہے کہیں کی بھی ہوں مگر اندر سے سب ایک سی ہوتی ہیں۔ سب کے جذبات ایک سے ہوتے ہیں' وہ ایک لمحہ توقف کے بعد پھر بولی۔

"ہاں' تم یہ کر سکتے ہو شاہ' مشن میں میری حیثیت پروٹوکول افسر کی ہے۔ میں اور بھی بہت سے کام سرانجام دیتی ہوں لیکن اصل کام یہی ہے میرا البتہ اگر تم اپنی مدد کے لیے مجھے مشن سے مانگ لو تو تمہیں انکار نہیں کیا جائے گا۔ میں تم پر بار نہیں بنوں گی شاہ' بلکہ تمہاری اسسٹنٹ کی حیثیت سے تمہارے ساتھ کام کرتی رہوں گی۔ مجھے کارآمد پاؤ تو اپنے ساتھ رکھ لینا' اگر کسی طرح تمہارے ذہن پر بار بن جاؤں تو واپس کر دینا۔ یقین کرو میری یہی آرزو ہے۔"

"اور اگر مشن اس کے لیے تیار نہ ہو تو؟"

"تو پھر میری تقدیر ہوئی۔ میں بھلا زبردستی کیسے کر سکتی ہوں۔"

"تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا میڈم جولیا۔ ویسے مشن نے میرے سلسلے میں جو کچھ کیا ہے ابھی تک حقیقی معنوں میں مجھے اس کی تفصیل معلوم نہیں ہوئی۔"

"جولیا ایکسل مجھے وہ عجیب و غریب باتیں بتا رہی تھی جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ابھی تک اپنے آپ کو آزمایا نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں جانتا تھا میں کہ میرے ساتھ کیا کیا گیا ہے۔ جو کچھ عالم ہوش میں تھا' وہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے میرے اندر یہ ساری اہم

تبدیلیاں رونما ہو جاتیں۔ تاہم ذرا سا اُلجھا ضرور تھا۔ آخر یہ تبدیلیاں میرے اندر کس انداز میں پیدا کی گئی ہیں۔ اس کا علم کیسے ہو۔'' ہر چیز جولیا سے پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے فوراً اپنے ذہن کو اس جانب سے ہٹالیا۔ جولیا کہنے لگی۔

''کیا سوچنے لگے شاہ؟''

''اسی حیرت ناک تجربے کے بارے میں جس کا تذکرہ تم نے کیا ہے۔''

''انسانی دماغ آسمان کی وسعتوں تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ وہ کائنات میں بکھرے ہوئے تمام سیاروں پر اپنی حکمرانی چاہتا ہے۔ پتا نہیں اس میں اسے کہاں تک کامیابی حاصل ہوگی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کب تمہیں واپسی کی اجازت دی جائے۔ بس میں نے جو درخواست کی ہے' اسے ذہن سے نہ نکالنا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور کہا۔

''اگر مجھے یہ اختیار دیا گیا مس جولیا تو میں یقینی طور پر آپ کی خواہش کی تکمیل کروں گا۔'' وہ بے حد خوش ہوگئی پھر ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔

بلاشبہ پچھلے دنوں میں جس بیزار کن کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اب وہ کیفیت نہیں تھی۔ ایک سکون تھا' ایک ایسا احساس تھا جو مجھے بے چین نہ ہونے دیتا تھا۔ یہاں کے معمول بدستور وہی تھے اور باقی تمام لوگ بھی مطمئن نظر آتے تھے۔ مس ہڈسن ہمیشہ کی طرح میری خدمت کرتی تھی۔ اس کی ذمہ داری ہی تھی ویسے اس کی شخصیت میں یہ بات مجھے پسند تھی کہ اس پر رومان طاری نہیں ہوا تھا۔ ہر طرح سے بے تکلفی سے مجھ سے گفتگو کرتی۔ بعض اوقات اس کی آنکھیں ضرور کچھ کہتی نظر آتی تھیں مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ ہڈسن عادت کے مطابق خاموش رہتا تھا اور کوئی ایسا اہم واقع پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہوتا۔ لیکن اگر واقعات زندگی میں شامل نہ ہوں تو شاید زندگی کی کہانی ادھوری ہی رہ جائے۔ تبدیلیاں ہونا تھیں اور اس انداز میں ہونا تھیں کہ واقعات کا رُخ بھی تبدیل ہو جائے اور یہ تبدیلی بالآخر مجھ تک پہنچ گئی۔ مجھ پر کیے جانے والے تجربات کی تکمیل کو تقریباً بائیس دن گزر چکے تھے۔ اس وقت لیبارٹری میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کرامویل کسی دوسرے کام میں مصروف ہوگیا تھا۔ شام کا وقت تھا' مس ہڈسن میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ ہڈسن بھی وہاں پہنچ گیا۔

''ارے اتنے خوبصورت موسم میں تم لوگ بوڑھے لوگوں کی طرح یہاں بیٹھے ہو یہ موسم تو فضاؤں میں پرواز کرنے کا ہے۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بچوں جیسی شوخی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا آج تک میں نے اس کے چہرے پر یہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میلیسا کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا مسٹر ہڈسن' لیکن آپ لوگوں نے مجھے یقینی طور پر ذہنی طور پر بوڑھا کر دیا ہے۔ کوئی بھی موسم میرے دل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔''

ہڈسن نے سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''درحقیقت بعض اوقات انسان کے دل میں کسی بھی چیز کے لیے کوئی خواہش پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر اسے تحریک دی جائے اور اس چیز کی طرف متوجہ کیا جائے تو اس کے حصول کے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بڑی غلطی کر رہا تھا۔ آپ یہاں اس چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں' آپ کے دل میں باہر کے موسم سے لطف اندوز ہونے کی کوئی خواہش

پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر ہم آپ کو باہر کے موسم میں لے جائیں' سیر و سیاحت کرائیں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ اس چھت کے نیچے بیٹھے رہ کر آپ کتنی بڑی غلطی کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آپ یہ تجربہ بھی مجھ پر کر ہی ڈالیے مسٹر ہڈسن۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر آپ تیار ہوں تو۔" ہڈسن نے کہا۔

"میں آپ لوگوں سے کسی بھی بات میں کب انکار کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو ہڈسن اثبات میں سر ہلا کر میلسا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میلسا جاؤ' تیاریاں کرو۔ باہر ہیلی کاپٹر موجود ہے۔ ہم فضا سے ان برفانی چوٹیوں کا نظارہ کریں گے جو اس موسم میں بے حد خوبصورت لگتی ہیں اور یقینی طور پر مسٹر شاہ کو یہ منظر بے حد پسند آئے گا۔"

میلسا خاموشی سے اُٹھ گئی۔ ہڈسن میرے پاس بیٹھ گیا۔

"حقیقت یہ ہے مسٹر شاہ' کہ زندگی بالکل مشینی ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہے اس میں۔ بہتر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ معمولات میں تبدیلی پیدا کی جاتی رہے۔ اس طرح ذہنی قوتیں بھی زیادہ مؤثر طریقے سے کام کرتی ہیں۔"

"کیوں نہیں' میں آپ سے متفق ہوں مسٹر ہڈسن۔ ویسے کیا اس وقت آپ کو فرصت ہے؟"

"ہاں' بس یوں سمجھ لیں کہ مجھ پر بھی تھوڑی سی اُکتاہٹ سوار ہے۔ ویسے مسٹر کراموبل اس وقت ایک تھیوری پر کام کر رہے ہیں اور جب وہ مصروف ہوں تو انہیں میری ضرورت نہیں ہوتی۔ میں صرف لیبارٹری میں انہیں ٹیسٹ کرتا ہوں' چنانچہ مجھے فرصت ہے۔"

"مسٹر ایلس تیار ہیں اور میں ان سے بات کر آئی ہوں۔" وہ آتے ہی بولی۔

"گڈ...... وری گڈ۔ میں اپنا خصوصی بیگ بھی لے جاؤں گا تاکہ ہم باقاعدہ تفریح کریں۔ تم شاہ کو لے کر ہیلی پیڈ پر پہنچو۔"

ہیلی کاپٹر شاید کسی خصوصی وجہ کے تحت یہاں چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ عام طور سے وہ یہاں نہیں ہوتا تھا۔ اس کا پائلٹ جسے مس ہڈسن نے ایلس کے نام سے مخاطب کیا تھا ایک جوان اور کسی قدر بدشکل آدمی تھا۔ ہم کاپٹر کے نزدیک ہڈسن کا انتظار کرنے لگے۔ پھر ہڈسن ایک اچھا خاصا وزنی بیگ اُٹھائے نظر آیا۔ میں نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس بیگ میں انہوں نے کیا رکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ کوئی قابلِ توجہ بات بھی نہیں تھی' مس ہڈسن ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے میں بیٹھی اور ہڈسن نے مجھ سے کہا۔

"بہتر ہے آپ پائلٹ کے قریب بیٹھیں تاکہ سامنے سے ہر قسم کے مناظر کا نظارہ کیا جاسکے۔"

میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور ایلس نے ہیلی کاپٹر کی مشین اسٹارٹ کردی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فضا میں بلند ہوگیا۔ ایلس اسے مغربی سمت برف پوش چوٹیوں کی جانب لے جانے لگا۔ موسم بلاشبہ انتہائی خوشگوار تھا۔ بادل بہت ہلکے ہلکے آسمان پر پرواز کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں نے موسم کو ایک خوشگوار کیفیت بخش رکھی تھی اور ہیلی کاپٹر فضا کی بلندیوں میں پرواز کرتا ہوا پہاڑی علاقے کی جانب جا رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ایلس بڑے ماہرانہ انداز میں کاپٹر کو کنٹرول کر رہا تھا۔ مختلف خوبصورت مناظر یکے بعد دیگرے میرے سامنے آرہے تھے۔ ان وادیوں نے مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری کردیا تھا۔ میں اپنے اطراف سے بالکل بیگانہ ہو چکا تھا کہ یکا یک مجھے اپنے

ذہن میں دھواں سا محسوس ہوا' مزاجی کیفیت کسی قدر بدلنے لگی۔ ایک جھنجلاہٹ سی دل میں اُبھر آئی تھی۔ کیا مصیبت ہے۔ میں نے مختصر وقت کے لیے اپنے شہر اور اپنے لوگوں کو خدا حافظ کہا تھا لیکن مشن نے میرے ساتھ بددیانتی کر کے مجھے اپنا مقید بنا رکھا تھا۔ بے شک انہوں نے مجھے ایک بڑی حیثیت دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن کیا یہ ان کا انداز مناسب ہے۔ کیا میرے لیے یہ غلامی کے مترادف نہیں ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ بددیانتی کی ہے۔ اگر یہ منصوبہ پہلے میرے علم میں لایا جاتا اور اسے میری اجازت کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچایا جاتا تو اس میں میری اپنی حیثیت کا بھی دخل ہوتا' لیکن ہوا یہ تھا کہ انہوں نے سازشی انداز میں مجھے اپنی تحویل میں لیا۔ مہمان کی حیثیت سے رہنے کے باوجود انہوں نے مجھے قیدی بنا لیا اور وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ جب چاہیں مجھے اپنے راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔ انہوں نے میرا ایک ہم شکل پیدا کر لیا ہے جسے وہ یہی تمام تربیت دے سکتے ہیں جو انہوں نے مجھے دی ہے اور یہ ہم شکل ان کی ہدایت کے مطابق کام کر رہا ہے۔ ایسے لمحات میں اگر میں ان سے کسی طرح کا انحراف کروں تو وہ بآسانی اسے میری جگہ دے سکتے ہیں اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا سکتے ہیں' یہ دوستی کا انداز تو نہ ہوا۔

یہ ایسی کیفیت تو نہیں ہے جسے خوشگوار طریقے سے محسوس کیا جائے حالانکہ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا لیکن سوچنا چاہیے تھا مجھے۔ مجھے ان کے اشاروں پر اس طرح گردن نہیں جھکا دینی چاہیے تھی۔ انہوں نے میری حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ یہ تو مناسب نہیں ہے' یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں ماحول پر نگاہ ڈالی پائلٹ کو دیکھا اور دفعتاً ہی میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ موقع بہترین ہے۔ مجھے ان کے چنگل سے نکل جانا چاہیے۔ میں جہانزیب شاہ ہوں۔ اپنے وطن میں میرا ایک بڑا مقام ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے مجرمانہ طور پر کیا ہے' میں ان کا آلہ کار نہیں بن سکتا۔ میں نے ایک نگاہ پائلٹ پر ڈالی' وہ سامنے نظریں جمائے بے فکری کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

''اپنی سمت کا دروازہ کھولو پائلٹ۔''

''جی سر۔'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''کیوں...... یہ خطرناک ہے۔''

''کھولو......'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے غرایا۔ نجانے میرے انداز میں یہ سفاکی کہاں سے در آئی تھی کہ ایلس کا ہاتھ بے ساختہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ہوا کے تیز جھونکے اندر داخل ہونے لگے' مگر وہ کافی مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ادھر میں نے ایک ایسی مضبوط چیز پکڑ لی تھی جس سے میں اپنے جسم کا توازن قائم رکھ سکوں اور میں نے اپنی پوزیشن بھی بدل لی تھی۔ پائلٹ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن جب میرا بایاں پاؤں اٹھا اور اس کی کمر سے جا لگا تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''آپ...... آپ...... کیا کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

لیکن اسے امید نہیں تھی کہ جو کچھ میں کروں گا وہ اس انداز میں ہوگا۔ میرے پاؤں کا دباؤ اس کی کمر پر پڑا پھر اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے باہر تھا۔

✿......✿......✿

اس کی ہولناک چیخ ہیلی کاپٹر کے شور میں دب کر رہ گئی تھی اور ہیلی کاپٹر ڈگمگانے لگا تھا لیکن میں نے فوراً ہی پھرتی سے پائلٹ کی سیٹ سنبھال لی۔ پائلٹ گہرائیوں میں گم ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہڈسن اور میلسا کی طرف نہیں گیا تھا' ان کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ غالباً میری اس حرکت نے انہیں دم بخود کر دیا تھا یا وہ خوف سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ بہرحال ان کی جانب سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا اور ہیلی کاپٹر برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔

''کیوں نہ لیبارٹری کا رُخ کیا جائے۔ ذرا وہاں چل کر دیکھا جائے کہ کیا کیفیت ہے اور بلندی سے وہ کیسی محسوس ہوتی ہے۔'' ہیلی کاپٹر کا رُخ تبدیل ہو گیا حالانکہ میں نے زندگی میں کبھی ہیلی کاپٹر نہیں اڑایا تھا لیکن اب مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں ایک ماہر ہواباز ہوں اور ہیلی کاپٹر کو پائلٹ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے' جو کچھ کر رہا تھا اپنی پسند سے کر رہا تھا۔

ہم بالآخر اسی جگہ آ گئے جہاں سے ہم نے پرواز کی تھی۔ ہڈسن اور میلسا کے حلق بند تھے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی ان سے۔ لیبارٹری کا یہ حصہ وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں بہت کم افراد ہوتے ہیں حالانکہ نظام بہت وسیع و عریض تھا لیکن محتاط انداز میں بہت کم لوگوں کو یہاں رکھا گیا تھا۔ میں لمبی پرواز کر کے لیبارٹری کے اوپر سے گزر گیا' آگے سمندر تھا۔ سمندر کے تھوڑے سے حصے پر جا کر میں پھر واپسی کے لیے پلٹا اور لیبارٹری سے گزرتا ہوا دوسری جانب نکل آیا جو کچھ ہوا وہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ دفعتاً ہی لیبارٹری میں ہولناک دھماکے ہوئے اور فضا میں ان کا ارتعاش اس قدر شدید ہوا کہ ہیلی کاپٹر بھی لرز گیا لیکن میں نے اسے سنبھال لیا۔ دھماکے یکے بعد دیگرے ہو رہے تھے' دھوئیں کے بادلوں نے ہر منظر کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔

کچن فور پر قائم اس لیبارٹری کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ کس طرح؟ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ یہ ہونا چاہیے۔ یقینی طور پر یہ ہونا چاہیے' ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس جگہ کے ساتھ' اس کے بعد میں نے ہیلی کاپٹر کا رخ ایک بار پھر انہی برفانی پہاڑیوں کی جانب کر دیا۔ مس میلسا اور ہڈسن کی پراسرار خاموشی اب میرے لیے باعثِ حیرت بننے لگی تھی لیکن میں نے انہیں مخاطب نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں میری اس تمام کارروائی میں ان کی اپنی کیفیات کیا ہیں۔ وہ تو دماغی توازن کھو بیٹھے ہوں گے لیکن یہ لیبارٹری......

وہاں کیا ہوا؟ آخر یہ تباہ کیسے ہوئی؟ ذہن میں مختلف خیالات کے خاکے بنتے رہے۔ پھر پہلی بار ہڈسن کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ڈیئر شاہ! فیول تو چیک کر لو۔ فیول کتنا ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم فضا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے جا پڑیں۔''

میں نے فیول میٹر چیک کیا اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اب ہیلی کاپٹر میں فیول بہت کم ہے۔

''ہمیں کس جگہ اترنا ہو گا مسٹر ہڈسن۔''

پھر ہڈسن ہی کی نشاندہی پر میں نے قدرے بہتر پلاٹ پر ہیلی کاپٹر اتار دیا اور انجن بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ انہوں نے اپنا بیگ اٹھا لیا تھا' حیران کن بات یہ تھی کہ ان کے چہروں پر بے اطمینانی کے آثار نہیں تھے۔ پھر ہڈسن

نے کہا۔

''ہر چند کہ یہ علاقہ بیرونی نگاہوں سے محفوظ ہے لیکن کسی بھی ذریعے سے ہیلی کاپٹر کو یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہم اسے تباہ کردیں تو یہ مناسب ہو گا۔'' میں نے عجیب سی نگاہوں سے ہڈسن کو دیکھا اور پوچھا۔

''مگر اسے کیسے تباہ کیا جائے گا؟''

''مشکل کام نہیں ہے۔ آؤ آگے بڑھتے ہیں۔'' ہڈسن نے کہا اور میں حیران سا ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ تو ایک جذبے کے تحت تھا اور میری ذہنی قوتیں منتشر ہوگئی تھیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہڈسن اور میلسا میری اس کارروائی سے غیر مطمئن نہ ہوں۔

کافی فاصلے پر پہنچنے کے بعد ہڈسن نے اپنا وہ بیگ کھولا اور اس میں تقریباً ایک فٹ لمبی ایک عجیب انداز کی گن نکالی جس میں سامنے کے حصے میں دو سوراخ نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک پہاڑی ٹیلے کی آڑ لے کر گن کا رخ ہیلی کاپٹر کی جانب کیا اور اس کے بعد اوپر لگے ہوئے دو بٹن دبا دیئے۔ گن کی نال سے نیلے رنگ کی شعاعوں کی ایک لکیر سی نکلی اور ہیلی کاپٹر تک پہنچ گئی اور اس کے بعد میں نے ہیلی کاپٹر کو پگھلتے ہوئے دیکھا۔ درحقیقت بڑا عجیب و غریب منظر تھا۔ پھر دھماکہ ہوا۔ فضا میں شعلے بلند ہوئے اور ہیلی کاپٹر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

میں خاموش نگاہوں سے ہڈسن کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے وہ عجیب و غریب ساخت کی گن واپس اپنے تھیلے میں رکھ لی اور پھر گہری سانس لے کر چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس نے انگلی سے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو ہمیں اس سمت ایسے غار مل سکتے ہیں جہاں عارضی طور پر پناہ لی جاسکے اگر آپ اس طرف جانا مناسب سمجھیں شاہ تو ہم ادھر کا رخ کریں۔''

میں خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔ خاصا فاصلہ تھا اس جگہ سے وہاں تک کا جہاں انہوں نے اشارہ کیا تھا تاہم ہم لوگ وہاں پہنچ گئے پہاڑوں میں تاریکی اترتی آرہی تھی اور ماحول دھندلانے لگا تھا۔ عقب میں تباہ شدہ ہیلی کاپٹر کے کچھ حصے جلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے یہ فاصلہ عبور کرلیا اور اس پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گئے جس پر برف کی تہیں کس قدر جمی تھیں تاہم برف تو اس پورے علاقے میں ہی تھی لیکن یہاں خاص سردی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے رات کی تاریکیوں میں سردی بڑھ جاتی ہو اس کے پورے پورے امکانات نظر آرہے تھے۔

بہرحال پہاڑی ٹیلوں میں غاروں کی تلاش شروع کردی گئی۔ ہڈسن کا اندازہ غلط نہیں تھا' وہاں چھوٹے بڑے غاروں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ان کے دہانے اب سیاہ دھبوں کی شکل میں نظر آرہے تھے۔ ہڈسن نے اپنے بیگ سے ایک طاقتور روشنی والی ٹارچ نکال لی تھی پھر ہمیں ایک ایسا غار مل گیا جو خاصا وسیع صاف ستھرا تھا۔ ہوسکتا ہے یہاں اور بھی بہت سے غار ہوں لیکن اب اترتی ہوئی تاریکیوں میں بہتر جگہ کی تلاش ممکن نہیں رہی تھی اور پھر یہ غار ہم تین افراد کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ ہڈسن نے اندر داخل ہوکر اوپر نیچے چاروں طرف تیز ٹارچ کی روشنی ڈالی اور کسی قدر مطمئن انداز میں بولا۔

"میرے خیال میں تو یہ بہتر جگہ ہے۔ اگر آپ پسند کریں۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اس وقت ایک ایسے پراپرٹی ڈیلر محسوس ہو رہے ہیں مسٹر ہڈسن جو کرائے کے مکان دکھاتا پھر رہا ہو اور اس بات کا خواہش مند ہو کہ مکان لینے والا کسی ایک مکان کو پسند کر لے لیکن آپ کو بھی تو اس مکان میں میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔" مس ہڈسن بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سچ مچ پاپا اس وقت آپ بالکل ایسا ہی کر رہے ہیں۔" ہڈسن بھی ہلکے سے ہنس دیا اور بولا۔

"ہاں میں چاہتا ہوں کہ مسٹر شاہ ہمیں اپنا دوست سمجھیں اور ہم ان کی پسند کا پورا پورا خیال رکھیں۔"

"تو مجھے یہ غار پسند ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گڈ...... ویری گڈ...... اور اب میں اس کی صفائی کیے دیتا ہوں تاکہ نیچے لیٹنے میں کوئی دقت نہ ہو ویسے اس غار میں ایک خوبی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم یہاں روشنی کر لیں تو یہ روشنی باہر نہیں جا سکے گی۔ یہ جھکی ہوئی چٹان روشنی کو باہر جانے سے روکے گی اور زیادہ سے زیادہ روشنی اس چٹان سے ٹکرا کر واپس غار میں پلٹ آئے گی۔"

میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا لیکن اب ہڈسن کے اس انکشاف کے بعد میں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا لیکن روشنی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہڈسن کو میں نے اور میلسا نے غار کی صفائی کے لیے بھی منع کر دیا۔ پتھریلی زمین پر گرد کی ہلکی سی تہہ تو ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ اس سے بچاؤ کے لیے محنت کی جائے سب سے پہلے میں ہی زمین پر دراز ہو گیا تھا۔ مس میلسا کے انداز سے بھی یہ لگ رہا تھا جیسے وہ تھک گئی ہو۔ ہڈسن بھی بیٹھ گیا اس نے اپنا خاص قسم کا بیگ اپنے بالکل قریب رکھ لیا تھا ہم دیر تک خاموش رہے۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ ہڈسن اور میلسا کیا سوچ رہے تھے یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن میرے دماغ میں عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ مدھم مدھم سی سنسناہٹیں ابھر رہی تھیں جیسے ہوا چل رہی ہو یہ میری دانست میں پہلی بار ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ذہنی کیفیت ایسی نہیں پائی تھی نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا۔ میں اپنا ذہن ٹٹولنے لگا اور پھر مجھے اس احساس کی وجہ تلاش کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ میں اپنے اس عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میں نے کیا تھا۔ یہ کیوں ہوا...... ایسا سب کیوں ہوا۔

ویسے یہ تو حقیقت تھی کہ میں ذہنی طور پر مشن کی کارروائیوں سے بددل تھا اور بارہا مجھے احساس ہوا تھا کہ ان لوگوں نے دھوکے سے مجھے اپنا قیدی بنا لیا ہے اور اب اپنی خواہش کے مطابق مجھے استعمال کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے اگر میں آزاد ہوتا تو اپنے آپ پر کسی قسم کا تجربہ کرنے کی اجازت انہیں کبھی نہ دیتا۔ انہوں نے مجھے ایک مہمان کی حیثیت سے طلب کیا اور قیدی بنا دیا اور اس کے بعد انہوں نے جو کارروائی میرے ساتھ کی بظاہر وہ ان کے اپنے مقاصد کی تکمیل اور ان کے بیان کے مطابق میرے مفادات میں تھی لیکن کسی بھی شخص کو اپنے مفادات کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ وہ ایشیاء میں مجھے مشن کا ناقابل تسخیر نمائندہ بنانا چاہتے تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو ہر طرح کے عمل میں آزاد ہو اور اسے مشن کی پوری پوری طاقت حاصل ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس تجربے کے بعد میں مشن کا محکوم بن گیا تھا۔ ایک

روبوٹ کی مانند جو مجھے کنٹرول کر سکے اور اس ساری کارروائی میں میرے اس غیر شعوری عمل کو دخل تھا تو میں اسے غیر فطری نہیں کہہ سکتا تھا۔ جو کچھ میں نے کیا وہ ایک حقیقت تھی اور مجھے اس سے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اچانک ہی یہ تمام فیصلے اور اس کے ساتھ ہی ہڈسن اور اس کی بیٹی میلسا کا تعاون...... یہ بات ذرا باعثِ حیرت تھی۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ اس طرح تعاون کیوں کیا بلکہ میری کسی بات پر انہوں نے نہ تو حیرت اور نہ ہی اضطراب کا مظاہرہ کیا۔ کیوں آخر کیوں؟ وہ مجھے روک سکتے تھے۔ خصوصاً ہڈسن جو مشن کا انتہائی ذمہ دار آدمی تھا۔ میں نے حیران نگاہوں سے ہڈسن کو دیکھا۔ دونوں باپ بیٹی میری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہڈسن مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میرا چہرہ دیکھا اور پھر آہستہ سے بولے۔

''میں اسی وقت کا منتظر تھا جب تم میری جانب ایسی نگاہوں سے دیکھو۔''

مسٹر ہڈسن کے ان الفاظ پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کچھ نہ کہا اور وہ سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ تاریکی کی وجہ سے چہرے نمایاں نہیں تھے اور ہم ایک دوسرے کے چہروں کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''میلسا۔'' ہڈسن نے میلسا کو پکارا۔

''تم روشنی کر دو۔''

میلسا نے اس انوکھے بیگ میں ہاتھ ڈالا جس میں سے ضرورت کی ہر چیز برآمد ہو رہی تھی اور پھر اس نے ایک عجیب و غریب ساخت کا لیمپ نکال لیا۔ بہت چھوٹا سا تھا، چوکور لائٹر کی مانند۔ اس نے اسے ایک بٹن دبا کر روشن کر دیا۔ محدود روشنی تھی لیکن اتنی کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو بغور دیکھ سکیں، میں نے اس دلچسپ چیز کو حیرانی سے دیکھا اور ہنس کر بولا۔

''مسٹر ہڈسن آپ سے زیادہ آپ کا یہ بیگ میرے لیے باعثِ حیرت ہے۔''

''ہاں۔'' ہڈسن ہنستے ہوئے بولا۔

''میں نے اپنی یہ کٹ اتنے اہتمام سے تیار کی ہے کہ اگر اس میں موجود تمام اشیاء تمہارے سامنے لے آئی جائیں تو تم یقیناً مجھے اس انتخاب پر داد دو گے۔''

''کیا کیا ہے اس میں؟''

''کوئی خاص چیز نہیں۔ وہ گن تم نے دیکھی جس نے ہیلی کاپٹر کو تباہ کیا۔ اس کے علاوہ یہ روشنی کرنے والا آلہ، چند شیشیاں ہیں اس میں جن میں گولیاں بھری ہوئی ہیں۔ ہم غذا کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے لیکن ہمیں یہ اندازہ تھا کہ ان علاقوں میں نکل آنے کے بعد ہمیں کوئی ایسا بہتر ذریعہ نہیں ملے گا چنانچہ ان میں ایسی ٹیبلٹس ہیں کہ اگر ہمیں مہینہ بھر غذا کا ایک ذرا نہ ملے تو یہ گولیاں ہمیں جسمانی طور پر اتنا ہی طاقتور رکھیں گی جتنا بہترین اور متوازن غذا۔ اس کے علاوہ میرے پاس گولیوں کا ایک ایسا ذخیرہ بھی موجود ہے جن میں سے ایک گولی چوبیس گھنٹے کے لیے پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دے گی لیکن پانی کی گولیاں اس لیے زیادہ کارآمد یا ضروری نہیں ہیں کہ برف کے اس علاقے میں ہمیں پانی کی کوئی کمی نہیں ہو گی۔ میرے پاس ایسی گولیاں بھی ہیں جو تمہیں چائے یا کافی کی ضرورتوں میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ میں نے یہ تمام چیزیں انتہائی محنت سے تیار کی ہیں اور انہیں محفوظ کیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد سردی کی شدت میں اضافہ ہو جائے گا۔ میں تمہیں کھانے کے لیے ایک ننھی سی گولی دوں گا جو تمہیں سردی سے

محفوظ رکھے گی اور تمہارے جسم کو بہترین اور لطیف حرارت حاصل ہو جائے گی۔

"یوں لگتا ہے مسٹر ہڈسن کہ آپ نے ان تمام حالات کا اندازہ پہلے ہی کر لیا تھا جو پیش آنے والے ہیں حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ اتفاقیہ سفر اس اتفاقی حادثے کا ذریعہ بن گیا لیکن اپنے طور پر میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ میری دلی خواہش تھی۔ البتہ اس بات پر حیران ہوں کہ اس خواہش کی تکمیل میں آپ میری مدد کیوں کر رہے ہیں اور بھی بہت سی حیران کن باتیں ہیں جیسے وہ لیبارٹری جسے ہم نے تباہ ہوتے ہوئے دیکھا۔"

ہڈسن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ میلسا بھی ساکت ہو گئی تھی۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد ہڈسن نے کہا۔

"اور یہ سب کچھ یہ سب کچھ وہ ہے جو میری دلی آرزو تھی لیکن اس کے لیے تمہیں ایک طویل کہانی سننا پڑے گی۔ بشرطیکہ تمہارا ذہن تیار ہو۔"

"آپ نے ابھی کہا تھا کہ آپ میری نگاہوں کے منتظر تھے۔ میں وہاں سے اس کہانی کا آغاز چاہتا ہوں۔ آپ براہِ کرم پہلے اپنے ان الفاظ کی وضاحت کریں۔"

"مسٹر شاہ! میں یہ تصور آپ کے ذہن میں پیدا ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ اس کارروائی پر حیرت کا اظہار کریں اور مجھ سے وضاحت طلب کریں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ رُک کر کچھ سوچنے لگا پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ کر سر ہلا کر کہنے لگا۔

"سنو شاہ! مشن نے جس طرح شاطرانہ انداز میں تمہیں قائل کر کے اپنے حق میں ہموار کیا' میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ بات تو تمہارے علم میں ہو گی کہ یہ صنعت کاروں کی ایک بین الاقوامی انجمن ہے جس کا مقصد دنیا کی اقتصادیات کو اپنے تابع کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا ہے۔ یہی مقصد فوروِیل کا بھی ہے جسے کسی حد تک مشن سے بڑا ادارہ کہا جا سکتا ہے مگر حقیقت اس سے مختلف ہے کیونکہ مختلف حقیقت یہ ہے کہ ہار پر مشن نے اپنے ہاتھ پاؤں ابھی بہت زیادہ نہیں پھیلائے لیکن اس نے جو کچھ کیا ہے اتنی مضبوط بنیادوں پر کیا ہے کہ فوروِیل اس کی گہرائیوں میں کبھی نہیں اتر سکتا۔

ہار پر مشن نے ابھی ذرا محدود علاقے پر اپنے اختیارات قائم کیے ہیں لیکن جہاں اس نے جو کچھ کر ڈالا ہے وہ اتنا مستحکم ہے کہ اگر فوروِیل اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ اس چھوٹے سے علاقے ہی کو کنٹرول میں کرنے کی کوشش کرے تو زندگی بھر اس کوششوں میں ناکام رہے۔ درحقیقت مشن کا مکمل تعلق اسرائیل سے ہے' یہودی لابی چاہتی ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی مدمقابل باقی نہ رہے۔ دنیا بھر کے حوالے دینے کی بجائے میں آپ سے صرف آپ کی بات کرتا ہوں۔ فوروِیل نے ایشیا' یورپ اور امریکہ میں اپنے جو نمائندے مقرر کیے ہیں وہ ہر ملک' ہر شہر اور ہر چھوٹے سے چھوٹے علاقے میں بٹے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی بہت سی باتیں بہت سے مسائل اور ان بہت سے مسائل کے سلسلے میں بہت سے اخراجات جس میں فوروِیل کو ملوث ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح مختلف خیالات بھی ہوتے ہیں اور کسی بھی لمحے خیالات کی تبدیلی فوروِیل کے نمائندوں کو اس سے دور کر دیتی ہے اور اس وقت فوروِیل کو نئے سرے سے اپنے ان نمائندوں کو کنٹرول کرنے کے لیے نئے نئے کام کرنا پڑتے ہیں۔ اس طرح اس کے اخراجات بھی بڑھ جاتے

ہیں جس سے وہ پریشان رہتا ہے جبکہ ہار پر مشن نے آپ ہی کے سلسلے میں یہ طے کیا تھا کہ پورے ایشیا کا کنٹرول آپ کو دیا جائے اور آپ کا کنٹرول مشن کرے یعنی آپ صرف وہ سوچیں جو مشن کے حق میں ہو۔ آپ کی اپنی کوئی شخصیت نہ رہے۔ آپ بلاشبہ ایک طاقتور حکمران ہوں اور اپنا کام بخوبی سرانجام دیں آپ کو ان تمام لوگوں پر فوقیت حاصل ہو جو آپ کے مدمقابل آئیں لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ آپ ہار پر مشن کی مٹھی میں ایک روبوٹ کی طرح مشن کے لیے کام کریں اور مسٹر شاہ! مشن ایسے ہی روبوٹس تیار کر رہی ہے وہ آپ جیسے لوگوں کو تلاش کر کے اپنے کام کے لیے تیار کر رہا ہے اور آپ پر اس کا پہلا تجربہ ہوا ہے۔"

"میں اس تجربے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں وہی آپ کو بتا رہا ہوں شاہ...... درحقیقت صورت حال یہ ہے کہ آپ کو اس لیبارٹری میں بھیج کر آپ کا جسمانی اور ذہنی تجزیہ کر لیا گیا۔ آپ دنیا کے ان گنے چنے انسانوں میں سے ہیں جس کی شخصیت انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے یعنی ذہنی اور جسمانی طور پر خود اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر آپ کو ان تمام قوتوں سے نواز دیا جائے جو مشن کے بس میں ہیں تو پھر آپ کا ثانی ہونا مشکل ہے اور مشن نے وہی سب کچھ کیا ہے۔ اس وقت آپ مشن کے مکمل کنٹرول میں ہیں۔ آپ صرف وہ سوچ سکتے ہیں جو مشن سوچے۔ آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ جو سوچ آپ کے ذہن میں پیدا ہوئی ہے آپ کی اپنی نہیں ہے' آپ اسے اپنی ہی سوچ سمجھیں گے لیکن درحقیقت وہ مشن کی سوچ ہوگی۔"

"وہ کیسے۔" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا اور ہڈسن مسکرا دیا۔

"اس لیے کہ آپ کے لاشعور میں ایک ایسا نظام قائم کیا گیا ہے۔ جو آپ کو شعوری طور پر مشن کے لیے کام کرنے پر مجبور کرتا رہے گا۔"

"کس طرح؟"

"آپ کے دماغ کا آپریشن کر کے۔"

"میرے دماغ کا آپریشن۔" میں نے کسی قدر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں ایک مکمل آپریشن۔"

"لیکن مسٹر ہڈسن......"

"ہاں آپ یہی کہیں گے مسٹر شاہ کہ وہ آپریشن آپ کے علم میں نہیں ہے' نہ آپ کے سر میں کوئی زخم ہوا نہ آپ کو بے ہوش کیا گیا' پھر آپ کے دماغ کا آپریشن کیسے ہو گیا تو جدید ترین سائنس سے آپ اس بات کی توقع رکھیں کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ کون سے مرحلے پر کون سی چیز کو آپ جھٹلا سکیں گے۔ آپ کے دماغ کا آپریشن کیا گیا ہے اور وہاں ایک ایسی ڈسک لگا دی گئی ہے جس میں صرف وہ یادداشتیں رکھی گئی ہیں جن کا تعلق مشن سے ہو۔ یہ ڈسک آپ کے دماغ کا ایک خلیہ ہے اور خلیہ آپ کو پورے طور پر کنٹرول کرتا رہے گا اور اس کا ریموٹ مشن کے پاس ہوگا۔

اس ڈسک میں یہ خوبی ہے کہ مشن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اس تک منتقل کر سکتی ہے یعنی اس ڈسک کو اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے اور یہ ڈسک ریموٹ سے ہی تبدیل ہو سکتی ہے۔ گویا اس کا سارا فنکشن وہی ہوگا جو ریموٹ کنٹرول کا ہوتا ہے' جس طرح آپ ایک ڈی وی ڈی میں پلے بھی کرتے ہیں' ریوائنڈ بھی کرتے ہیں۔ فارورڈ بھی کرتے ہیں اور ریکارڈ بھی کرتے

ہیں۔ ہر چیز اپنی پسند کے مطابق آواز ہلکی اور بھاری کی جا سکتی ہے۔ بس ریموٹ کنٹرول میں تھوڑی سی تبدیلی یہ ہے کہ اس میں ڈسک کو تبدیل کرنے کی قوت بھی رکھی گئی ہے۔ یعنی آپ کے اس خلیے کو ناکارہ کر کے بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ اسے جلا کر اس کی جگہ ایک نیا خلیہ ریموٹ کے ذریعے ہی آپ کے دماغ تک بھیجا جا سکتا ہے اور یہ نیا خلیہ آپ کو علم میں لائے بغیر وہی کام سرانجام دینے پر مجبور کرے گا جو ادھر سے مناسب سمجھیں گے۔ باقی آپ کی شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ ڈسک یعنی خلیہ تبدیل کرتے ہوئے آپ کو اسی طرح کوئی احساس نہیں ہو گا جس طرح آپریشن کے وقت آپ کو کوئی احساس نہیں ہو سکا کہ جس مشین پر کھڑے ہو کر آپ پر تجربات کئے گئے تھے وہ درحقیقت ایک آپریشن ٹیبل تھی اور اس کے ذریعے وہ کچھ ہوا جو آپ کے تصور سے باہر ہے۔ یعنی آپ کے دماغ میں ایک ایسے خلیے کا اضافہ ہو گیا جو آپ کے دماغ کا اصل حصہ نہیں تھا۔"

میں سکتے کے عالم میں یہ ساری کہانی سن رہا تھا اور اپنے آپ پر حیرت کر رہا تھا۔ جہانزیب یہ سب کچھ بھی ہونا تھا تمہارے ساتھ۔ اپنی شخصیت کو دیکھو اپنی اوقات کو دیکھو اور اس کے بعد ان ساری کارروائیوں کو جس میں دنیا بھر کے یہودی سرمایہ دار ملوث ہیں، بڑی دور کی بات تھی۔ بہت سوچنے کی بات لیکن جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے کیا اس میں مکمل طور پر سچائی ہے۔ کیا یہ ایک حیرت ناک طریقہ کار نہیں ہے، پھر اچانک ہی میرے دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے ان واقعات کے بارے میں سوچا جو رونما ہوئے تھے۔ یہ کہانی جو ہڈسن نے سنائی تھی بلاشبہ دنیا کی پراسرار ترین کہانی تھی۔ سائنس کا ایک ایسا عجوبہ جس کے بارے میں ابھی تک نہیں سوچا جا سکا تھا لیکن لیبارٹری میں آخر کچھ تو ہوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ہڈسن درست کہہ رہا ہو۔ میری خاموشی کو محسوس کر کے ہڈسن نے کہا۔

"اور اس کے بعد میں کہانی کو ایک بالکل ہی نیا ٹرن دے رہا ہوں۔ تمہیں حیرت ہو گی میرے دوست شاہ کہ جو گفتگو میں کر رہا تھا اس میں یہ تبدیلی میں نے کیوں پیدا کی لیکن اس کی وجہ ہے جو بعد میں خود بخود تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ جس طرح تمہیں تمہارے وطن سے بلا کر یہاں اپنا قیدی بنا لیا گیا اسی طرح میرے ساتھ بھی یہی کیا گیا ہے۔ میرا تعلق مغربی جرمنی سے ہے اور اگر کبھی مغربی جرمنی جا کر تم ہڈسن کے بارے میں معلومات حاصل کرو تو تمہیں لوگوں کے خیالات بالکل مختلف ملیں گے۔ مجھے تمہاری طرح مدعو نہیں کیا گیا تھا بلکہ میرے حصول کے لیے انہوں نے بدترین مجرمانہ سازش کی تھی۔"

میری دلچسپیاں بیدار ہو گئیں اور میں ہڈسن کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میلسا...... خاموش تھی۔ لیکن دفعتاً ہی اس نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ! اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو کافی کی گولی دوں۔"

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔

"یہ میرے لیے ایک دلچسپ تجربہ ہو گا مس میلسا۔"

میلسا، ہڈسن کے پراسرار بیگ سے کافی کی گولیوں کی شیشی نکالنے لگی۔ ایک چھوٹی سی شیشی سے اس نے تین ننھی ننھی گولیاں نکالیں۔ ایک اپنے منہ میں رکھی، دوسری مجھے اور تیسری ہڈسن کو پیش کی۔ چند لمحات ہم کافی کا مزا لیتے رہے۔ مجھے واقعی یہ

سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہڈسن نے اپنا منہ صاف کرنے کے بعد کہا۔

"تو میں اس مجرمانہ سازش کا تذکرہ کر رہا تھا۔ مغربی جرمنی میں، میں ایک نیک نام سائنسدان کی حیثیت سے مشہور تھا اور میں نے اپنے وطن کے لیے بہت کام کیا تھا جس کی بناء پر میری وہاں بے حد عزت تھی اور حکام مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

پھر ایک دن چند افراد نے مجھ سے ملاقات کی یہ اپنے آپ کو سائنسدان بتاتے تھے اور انہوں نے اپنا تعارف مجھ سے مختلف ناموں سے کرایا تھا۔ وہ میری تعریف کرتے رہے اور انہوں نے میری ایجادات پر تبصرہ کیا۔ میں نے معزز مہمانوں کی حیثیت سے ان کی خاطر مدارت کی لیکن دوسرے دن کے اخبارات میں میری اور ان کی تصاویر شائع ہوئیں حالانکہ اس ملاقات کے وقت کوئی ایسا فوٹوگرافر موجود نہیں تھا جو ہماری تصاویر لے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، لیکن اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی جب اخبارات نے ان لوگوں کے بارے میں انکشاف کیا۔ انہوں نے جس نام سے مجھ سے اپنا تعارف کرایا تھا درحقیقت وہ اس نام کے لوگ نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق مغربی جرمنی کے مخالف ایک ایسے ملک سے تھا جس سے مغربی جرمنی کی ٹھنی ہوئی تھی اور یہ لوگ وہاں سائنسی امور سے تعلق رکھتے تھے۔

اخبار نے بڑی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ہڈسن جیسا محب وطن سائنسدان اگر ایسے لوگوں سے رابطے رکھتا ہے تو مستقبل میں خطرناک باتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ میں نے اس بات کی شدت سے تردید کی اور اخبارات کو اپنا بیان دیا۔ انہیں بتایا کہ درحقیقت میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی یہ مجھ سے اس حیثیت سے ملے تھے بلکہ انہوں نے دوسرے طریقوں سے مجھ سے ملاقات کی تھی اور ہماری خصوصی سائنسی امور پر گفتگو نہیں ہوئی۔ اس طرح مغربی جرمنی کے حکام کی نگاہوں میں میری شخصیت مشکوک بنادی گئی پھر کچھ اور ایسے معاملات ہوئے جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ان لوگوں سے میرا مسلسل رابطہ ہے لیکن خفیہ۔ اخباری فوٹوگرافر میری تاک میں لگ گئے تھے اور نجانے کہاں کہاں سے یہ مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے بہت واویلا کیا، بہت شور مچایا لیکن اب میری وہ آواز نہیں رہی تھی جو کبھی تھی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ حکام بالا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اور ان تمام باتوں کی تحقیقات کرائے بغیر مجھے مجرم قرار دیا جارہا ہے۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے ملاقاتیں کیں لیکن بدقسمتی سے جو لوگ یہ کارروائی کر رہے تھے، انہوں نے ایک مضبوط جال میرے گرد بُن لیا تھا۔

میری کچھ ایسی ایجادات اس ملک کے رسائل میں منظر عام پر آئیں جن کا تعلق صرف میرے اپنے ملک کے خاص خاص لوگوں سے تھا اور اس بات کو مکمل طور پر راز میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس اخبار نے یہ بتایا تھا کہ میں نے اس ملک کے نمائندے کو اپنی ان ایجادات کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں اور یہ ایک حقیقت تھی کہ جو تفصیلات اس میں شائع ہوئی تھیں وہ چند ہی لوگوں کو معلوم تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح انہیں پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد مجھ سے شدت سے بازپرس کی گئی اور ان کا موقف بالکل درست تھا۔ یعنی وہ باتیں جو صرف چند افراد کے درمیان تھیں باہر کیسے پہنچ گئیں۔ میرے علاوہ اس کا ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے بھی غصہ

آنے لگا۔ میں جو تردید کر رہا تھا اس پر توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے سخت اور تلخ رویہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں بات بگڑتی چلی گئی۔ مجھ سے کئی بار جواب طلبی کی گئی اور بالآخر مجھے مغربی جرمنی کا غدار قرار دے دیا گیا۔

میرے بارے میں بہت سے فیصلے کیے گئے' میری کوششوں کے نتیجے میں مجھے سزائے موت تو نہیں دی گئی لیکن جلاوطنی کا حکم دے دیا گیا اور بالآخر مجھے مغربی جرمنی سے جلاوطن ہونا پڑا۔ میرے ساتھ میری بیٹی میلسا اور میری بیوی تھی جو مغربی جرمنی سے نکلنے کے بعد انتقال کر گئی۔ ہم باپ بیٹی رہ گئے' مگر ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے وطن کے خلاف کچھ کریں۔ میں ابھی اسی اُلجھن کا شکار تھا کہ کچھ بالکل غیر متعلق لوگوں نے مجھے سہارا دیا اور اس طرح سہارا دیا کہ میں ان کا ممنون کرم ہو گیا اور ان کی گود میں آ بیٹھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان کا تعلق ہار پر مشن سے تھا اور ہار پر مشن کے ان نمائندوں نے بالآخر مجھے اپنی تحویل میں لے لیا اور ایک دن یہاں پہنچا دیا گیا' لیچن فور میں' میں ایک سائنسدان کی حیثیت سے ہی متعارف ہوا۔

مجھے بہت عزت و احترام کے ساتھ یہاں خوش آمدید کہا گیا اور مسٹر کراموپل کی تحویل میں دے دیا گیا۔ لیکن حقیقت معلوم ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا' تھوڑے ہی دنوں کے بعد مجھے تفصیلات معلوم ہو گئیں۔ یہاں لیچن فور میں پہنچنے کے بعد مجھے یہ پتا چلا کہ یہ سب ہار پر مشن کی سازش تھی۔ ان لوگوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں مجھ جیسے ایک ذہین سائنسدان کی ضرورت تھی' جو ان کے مقاصد کے لیے کام کرے۔ حکومت مغربی جرمنی مجھے کبھی نہ چھوڑتی' اگر میرے خلاف یہ سازش نہ کی جاتی۔ انہوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں زندگی بھر یہاں عیش و آرام سے بسر کروں اور ایک مختصر مدت تک ان لوگوں کے لیے خدمات سرانجام دینے کے بعد مجھے اتنی دولت دی جائے گی کہ میں بقیہ وقت بڑے آرام سے گزار سکوں گا لیکن جو کچھ میرے ساتھ کیا گیا تھا وہ ایک انتہائی مجرمانہ فعل تھا اور میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ مسٹر کراموپل ایک ناکارہ شخصیت ہیں۔ بے شک وہ سائنسدان تھے لیکن ان کی اپنی صلاحیتیں اس قدر نہیں تھیں کہ وہ اپنے طور پر کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتے' چونکہ وہ ہار پر مشن کے منظورِ نظر تھے اور انہوں نے مشن کے مجرمانہ کاموں میں بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ بدقسمتی سے وہ سائنسدان بھی تھے لیکن ایسے کہ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم انہیں میرا چیف مقرر کر دیا گیا اور اس کے بعد وہ میرے شانوں پر بیٹھ کر سفر کرنے لگے۔ میری کوئی بھی کارروائی ان کے نام سے منسوب کر دی جاتی ہے اور انہیں اس کا پورا پورا کریڈٹ جاتا ہے جبکہ اس کی تکمیل کرنے والا میں ہوتا ہوں۔ ان ساری باتوں سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرے دل میں تو ایک لاوا پک رہا تھا اور بار بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میری حیثیت کچھ بھی نہیں ہے اور میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات پر انتہائی رنج تھا کہ میرے وطن سے میرے تعلق کو ختم کر دیا گیا ہے اور وہ لوگ مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

جرمنی میری زندگی ہے' میرا خمیر وہاں سے اُٹھا ہے' مجھے اپنے وطن سے پیار ہے لیکن اگر میں اس پیار کا اظہار کروں تو اس کے نتیجے میں مجھے نفرت کے علاوہ اور کچھ نہیں دستیاب ہوگا۔ اس طرح سے تم میری اپنی

ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ شاہ! اس سے پہلے میں نے مشن کے لیے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور یہ لوگ میری خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور مجھے عزت دیتے ہیں لیکن ایک قیدی کو جس طرح عزت دی جاتی ہے اس کا تمہیں اندازہ ہوگا۔ صورت حال یہ ہے کہ میں یہاں ان کی پسند کے مطابق ہر طرح کے کام کرتا ہوں اور بس اس سے زیادہ میرا مستقبل کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر میں نے تمہیں مشینوں پر چیک کیا' مجھے تمہارے بارے میں تفصیلات بھی بتائی گئیں اور بتایا گیا یہ لوگ تم سے کیا کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ یہاں میں اپنی کہانی سے تھوڑا سا ہٹ رہا ہوں اور تمہیں وہ سب کچھ بتانا چاہتا ہوں جو یہ تمہارے ذریعے کرانے کے خواہشمند ہیں۔ بے شک تمہارے سلسلے میں یہ بالکل مخلص ہیں اور تمہیں وہ حیثیت اور وہ مقام دینا چاہتے ہیں جو بلاشبہ ایشیاء کے لیے انتہائی باعث افتخار ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں مشن کے نمائندے کی حیثیت سے تمہارے ملک میں انتہائی مستحکم کریں گے کیونکہ تمہارے ذریعے تمہارے ملک کو جو فائدہ ہوگا اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا' لیکن اس طرح سے تمہارے ملک کی جو اقتصادی پالیسی ہوگی وہ مشن کی پالیسیوں کے تحت ہوگی۔ بات یہیں تک محدود نہیں ہوگی' بڑا لمبا پروگرام ہے ان کا یہ دنیا بھر میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی اقتصادی تقدیر کے مالک بننے کے خواہشمند ہیں۔

دنیا پر اپنا اقتصادی کنٹرول حاصل کرکے سپر پاور کو بھی بلیک میل کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ بہت سے ملک آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ یہ ان کا انتہائی اہم کام ہے جسے وہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایشیاء' افریقہ' مشرق وسطی اور دوسرے تمام ممالک میں انہوں نے اپنی کارروائیوں کے جال پھیلا دیئے ہیں مثلاً جاپان جو صنعتی دنیا میں ایک انتہائی اعلیٰ مقام حاصل کرچکا ہے اس کی تمام بیرونی پالیسیاں اندرونی پالیسیاں تمہیں اپنے طور پر دیکھنا ہوں گی اور ایسی سازشیں کرنا ہوں گی جس کے تحت یہ پالیسیاں متاثر ہوں۔ اگر کبھی اس کا انکشاف ہوگیا تو بات تمہارے وطن پر آئے گی۔ ہر جگہ کے بارے میں ان کی اپنی پالیسی ہے۔ کوریا' تائیوان اور چین وغیرہ جہاں جو کچھ تیار ہوتا ہے تمہیں اس کے بارے میں تمام طور پر رپورٹیں تیار کرنا پڑیں گی اور اس طرح ایشیا میں صنعتی سیکشن کنٹرول کرنا ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے' لیکن اس سے جو خطرات رونما ہوسکتے ہیں اس کا سامنا کرنا ہوگا اور تمام تر ذمہ داری تمہاری ذاتی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کوششوں سے تم اپنے وطن کے لیے بہت کچھ حاصل کرسکتے ہو لیکن بات وہی ہوگی کہ اس وقت تم اپنے وطن کے لیے کچھ نہ کرسکو گے بلکہ تمہارے اپنے وطن کا معاملہ بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا اور یہ سب سے پہلے اپنے مفادات کو ترجیح دیں گے اور اس کے بعد دوسری کوئی بات سوچیں گے۔

سمجھ رہے ہو تم؟ یعنی تم اپنے طور پر ایک مستحکم حیثیت کے مالک ہوگے لیکن تمہاری شخصیت دنیا بھر کی نگاہوں میں خصوصاً ایشیا کے ممالک میں مشکوک ہوجائے گی۔ بڑا لمبا پروگرام ہے اور اس وقت تم ان کے رحم و کرم پر ہو۔ یعنی تمہیں وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ تمہارے دماغ کا جو آپریشن کیا گیا ہے وہ شعاعی آپریشن ہے اور اس کا ریموٹ کنٹرول کہیں اور ہے یہاں سے میں پھر اپنی کہانی پر آجاتا ہوں' تمہیں دیکھ کر میرے دل میں ایک تصور

پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں اس مصیبت سے بچاؤں چنانچہ کراموبل کو دھوکا دے کر میں نے تمہارے آپریشن میں کچھ خصوصی تبدیلیاں کیں یعنی سب کچھ انہی کی پسند انہی کی مرضی کے مطابق ہوا۔ تمہارا ذہن ان تمام قوتوں کا حامل بن چکا ہے لیکن تمہارے ذہن کی تمام تر قوتیں ایک خصوصی کنٹرول میں ہیں اور وہ لوگ اب اسی کے ذریعے تمہیں اپنی ہدایات جاری کریں گے لیکن میں نے اپنے طور پر ذرا سی تبدیلیاں کیں اور اس کا پتا نہ مسٹر کراموبل کو چل سکا اور نہ ہار پرمشن کے کسی آدمی کو۔“

میں ششدر نگاہوں سے ہڈسن کو دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور وہ مشینی انداز میں بول رہا تھا۔

❀......❀......❀

”مجھے میرے وطن میں مجرم بنا دیا گیا تھا' میں ان لوگوں سے دوستی کیسے رکھ سکتا ہوں۔ تمہارے ذہن میں' میں نے وہ تمام چیزیں پیدا کیں لیکن اس کا ریموٹ کنٹرول جو ان لوگوں کے پاس ہے بالکل مختلف ہے اور اس کے ذریعے وہ تمہیں نہیں مجبور کر سکتے نہ تمہیں کنٹرول کر سکتے ہیں بلکہ تمہارا کنٹرول میں نے اپنی بیٹی میلسا کو دے دیا۔ یہ کنٹرول جس شکل میں ہو سکتا تھا اس شکل میں نہیں ہے' بلکہ اس جیسی ایک ڈسک تمہارے دماغ میں پہنچائی گئی ہے۔ اس کا دوسرا حصہ میں نے میلسا کے دماغ میں محفوظ کر دیا ہے۔ یعنی اب یہ ہوتا ہے کہ تم اپنے طور پر ہر بات سوچ سکتے ہو۔ تمہیں احساس نہ ہوگا کہ تمہارے اندر کوئی نمایاں تبدیلی ہوگئی ہے' یہی کیفیت ان کے ساتھ بھی ہوتی۔ یعنی تم اپنی شخصیت میں مکمل طور پر آزاد ہوتے اور تمہارے ذہن میں کبھی یہ تصور بیدار نہیں ہوتا کہ تم کسی کے زیر تحت کام کر رہے ہو' لیکن جہاں تمہاری سوچ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آتی وہ اپنا ریموٹ استعمال کرتے اور تم اسی انداز میں سوچتے جس انداز میں وہ چاہتے۔ چاہے وہ تمہارے حق میں تمہارے ملک کے حق میں بہتر ہوتا یا نہ ہوتا۔ میں نے ان کے ریموٹ سے تمہارا کنٹرول ختم کر کے تمہارا تعلق اس ریموٹ سے کر دیا جو میلسا کے ذہن میں ایک ڈسک کی شکل میں محفوظ ہے اور میرے دوست مجھے معاف کرنا درحقیقت جب ہم نے اس سفر کے لیے پروگرام ترتیب دیا تو ہمارے ذہن میں ایک پورا خاکہ موجود تھا۔ یہ بیگ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں نے اس میں وہ تمام چیزیں محفوظ کیں جو عارضی طور پر کی جاسکتی تھیں اور اس کے بعد ہم سیاحت کی غرض سے چل پڑے۔

لیکن ہیلی کاپٹر میں سفر کرتے ہوئے میلسا نے اپنے ریموٹ کے ذریعے تمہیں حکم دیا کہ پائلٹ کو قتل کر دو اور خود ہیلی کاپٹر کا کنٹرول سنبھال لو۔ تم نے وہی سب کچھ کیا۔ پائلٹ کو قتل کرنے کے بعد ہیلی کاپٹر ہم لوگ یہاں اتار لائے اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے علم میں ہے۔ تمہیں اس وقت میلسا کنٹرول کر رہی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف اس قید سے نکلنا چاہتے تھے۔ میں تمہیں بڑے خلوص اور بڑی محبت سے تمام تفصیلات بتا رہا ہوں حالانکہ اگر میں چاہتا تو تمہیں یہ سب کچھ نہ بتاتا اور ہم خاموشی سے تم سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے لیکن میں بددیانت انسان نہیں ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں تمہیں اپنے طور پر محکوم بنا کر رکھوں' مائی ڈیئر شاہ۔ میں ویسا ہی دوسرا آپریشن کر کے تمہارے اور میلسا کے درمیان رابطہ ختم کر سکتا ہوں اور یہ میری ذمہ داری ہے لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے یہ سب کچھ بے حد ضروری تھا اور اب میں

آئندہ منصوبے کی تکمیل تم سے چاہتا ہوں۔ کیونکہ بے شک یہ سب کچھ تمہارے ذہن تک پہنچا دیا گیا ہے میں اس سلسلے میں مکمل طور پر معذور ہوں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری اس کارروائی کے نتیجے میں مجھے موت ملنی چاہیے تو میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن ایک درخواست ضرور کروں گا' تم ہمیں قتل کر دینا لیکن میرے ملک تک یہ اطلاع پہنچا دینا کہ ہڈسن درحقیقت جرمنی کا دشمن نہیں تھا بلکہ ہارپر مشن نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ میں تمہارے ہر قدم کا ساتھی ہوں شاہ' لیکن اگر تم میری زندگی کو اس لحاظ سے مناسب نہ سمجھو تو ہم دونوں کو گولی مار کر ختم کر دو اور اس کے لیے میں اور میری بیٹی اپنے آپ کو بخوشی پیش کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہماری زندگی میں کوئی دلکشی نہیں ہے لیکن' لیکن میں ان لوگوں کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ تمہیں اندازہ ہو گا کہ جب وہ لوگ تمہارا جائزہ لے رہے تھے تو تمہارے دل میں اپنے وطن کی محبت کا تصور اُبھرا تھا' یعنی اپنے وطن کی محبت کا۔ تم نے سوچا تھا کہ تم دنیا میں جو کچھ بھی کرو گے اس میں تمہیں اپنے ملک کا مفاد سب سے زیادہ عزیز ہو گا۔ درحقیقت یہ وہ احساس تھا جس کے تحت میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ تمہیں اپنے قابو میں نہیں کر سکے۔

یہ میرا ایک تحفہ تھا تمہارے لیے کہ میں نے تمہارے ذہن کو ان کی ہوس کا نشانہ نہیں بننے دیا اور اس کے بعد میں یہ بھی اعتراف کروں گا میرے دوست کہ وہ لیبارٹری جس میں مجھے ایک طویل عرصہ قید رکھا گیا میری نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے وہاں طاقتور قسم کے بم فٹ کر دیئے تھے اور جب فضا میں پہنچے اور ہیلی کاپٹر کا کنٹرول تمہارے ہاتھ میں آ گیا تھا تو میلسا نے اپنے ریموٹ کے ذریعے تمہیں حکم دیا کہ ہیلی کاپٹر کو اس جانب واپس موڑ دو اور میرے پاس جو بم ریموٹ کنٹرول تھا میں نے اس کے ذریعے وہ بم بلاسٹ کر دیا اور اس طرح لیبارٹری تباہ ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ طویل عرصے تک وہ لوگ اپنی اس شاندار تجربے گاہ کا ماتم کرتے رہیں گے لیکن میری روح اس انتقام سے خوش رہے گی۔ سمجھے شاہ' یہ ہے پوری کہانی اور اب اس کے بعد اس کہانی کو آگے بڑھانے کی تمام تر ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں۔ صرف تم پر۔'' میں پاگلوں کی طرح ہڈسن کا چہرہ دیکھ رہا تھا جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا نا قابلِ یقین تھا لیکن اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ایک بھی بات تو ایسی نہیں تھی جس کی تفصیل میرے سامنے نہ ہو۔ میلسا خاموش تھی۔ میں ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہڈسن نے بڑے خلوص کے ساتھ یہ کہا تھا کہ اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں چاہیے تو وہ اس کنٹرول کو ختم کر سکتا ہے یا اگر اس پر بھی مجھے شبہ باقی رہ جائے تو وہ اپنے وطن کے نام پر مر مٹنے کے لیے تیار تھا۔ ایک محبِّ وطن آدمی چاہے اس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو میرے لیے جس قدر باعث عزت اور قابل قدر ہو سکتا تھا آپ غالباً اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہڈسن نے درحقیقت میرے خلاف تو کچھ نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ مجھے ان کے چنگل سے نکال لیا تھا۔ درحقیقت اگر میرا ایسا کوئی آپریشن ہوا ہے اور جس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو رہا تھا کہ ایسا ہوا ہے تو اگر اس کا کنٹرول مشن کے ہاتھ میں ہوتا تو پھر میری کیفیت کیا ہوتی۔ آہ' درحقیقت بڑا بدترین وقت ہوتا وہ میں اپنے طور پر سب کچھ کرتا لیکن حقیقت یہ ہوتی

کہ یہ سب کچھ کسی اور ہی کے ایما پر ہو رہا ہوتا۔ اس وقت ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ ذہنی کیفیت بری طرح متاثر ہوگئی تھی۔ ہڈسن نے کہا۔

''شاہ' ہم بے شک ابھی مشکل حالات کا شکار ہیں لیکن ان پہاڑوں میں کوئی مہم جوئی نہیں کی جاسکتی۔ ہیلی کاپٹر بے شک استعمال کیے جاسکتے ہیں لیکن ہم یہاں محفوظ ہیں وہ جگہ بلندیوں سے تلاش نہیں کی جاسکتی اور پھر ضروری نہیں ہے کہ وہ سیدھے اسی سمت آنکلیں۔ ابھی تو انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں بھی وقت لگے گا اور یہی وقت ہمارے پاس محفوظ ہے۔ میں بڑے مخلصانہ انداز میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ رات گزارو' آرام سے فیصلہ کرو اور اس کے بعد ہم دن کی روشنی میں کوئی پروگرام بنائیں گے۔''

''ہاں مسٹر ہڈسن یہ میرے لیے بے حد ضروری ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

ہڈسن اور میلسا بہتر جگہ تلاش کرکے لیٹ گئے۔ باپ بیٹی بالکل خاموش تھے۔ یقینی طور پر ان کا میں گہری سوچوں کا شکار ہوگا۔ رات پوری طرح ہوگئی تھی اور جسم آرام طلب کر رہا تھا اور ذہن ہزاروں سوچوں میں گرفتار تھا۔ بے شک یہ بات فیصلہ کن تھی کہ ہڈسن اس وقت میرا محسن تھا لیکن یہ تو کسی طور ممکن نہیں کہ میرا ذہن اس لڑکی کے کنٹرول میں رہے۔ اس طرح تو میں اپنے آپ سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں نے بہت سے فیصلے کیے' سب سے پہلے میں نے یہ سوچا کہ ہڈسن سے یہ بات معلوم کروں کہ میرا ذہنی کنٹرول ہڈسن سے کس طرح ختم ہوسکتا ہے اور یہ سوال زیادہ دیر اپنے ذہن میں نہ رکھ سکا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں نے اسے آواز دی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

''کیا بات ہے...... خیریت۔''

''ایک سوال ذہن میں چکرا رہا ہے۔ مسٹر ہڈسن اور آپ یقین کیجئے کہ وہ سوال میرے لیے سب سے زیادہ اہم نوعیت کا حامل ہے۔''

''پوچھو۔'' اس نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

''آپ نے اپنے طور پر جو فیصلہ کیا میں اسے خلوص دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ بے شک اگر یہ آپریشن کامیاب ہوجاتا تو میں خاصی حد تک مشن کے قبضے میں ہوتا۔ یہ بعد کی باتیں ہیں کہ ان حالات میں جب میں ان کے کنٹرول میں نہ ہوتا میں اپنے بارے میں کیا سوچتا اور ان کے خلاف کیا عمل کرسکتا۔ تاہم مسٹر ہڈسن میں کسی بھی قیمت پر یہ پسند نہیں کروں گا کہ میرا ذہن کسی کے کنٹرول میں رہے۔ میلسا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ جس انداز میں سوچے گی وہ میرے حق میں بُرا نہیں ہوگا آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں آپ کی زندگی چاہتا ہوں' ہر قیمت پر آپ دونوں کی زندگی چاہتا ہوں۔ اپنے محسن کو کوئی نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتا لیکن میری پہلی خواہش یہی ہے کہ میرا ذہن میلسا کے ذہن سے آزاد ہو جائے۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ ایسا ممکن ہے کسی طرح؟'' ہڈسن مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''دو صورتیں ہیں۔ ہم اس لیبارٹری کو کھو بیٹھے ہیں جہاں یہ شعاعی آپریشن کیا جاسکتا تھا لیکن مجھے آپریشن کرنے کا کوئی موقع درکار ہے اور یہ آپریشن تمہارا نہیں ہوگا بلکہ میلسا کا ہوگا۔ میں اس کے ذہن سے وہ ڈسک نکال دوں گا۔ درحقیقت یہ سب کچھ میں نے کس لیے کیا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میں ایسا نہ کرتا کرتا تو اپنے ہاتھ بھی کٹوا بیٹھتا اور تمہیں بھی ان لوگوں کے حوالے کردیتا۔ میلسا کم از کم اس وقت ہماری زندگی بچانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ تو

مائی ڈیئر دو ہی صورتیں ہیں یا تو تم ہمیں زندگی سے محروم کر دو میلسا کو قتل کر دو۔ اس کا سر پتھروں سے کچل دو یا پھر اس وقت تک انتظار کرو جب تک مجھے آپریشن کرنے کے بہتر مواقع نہ حاصل ہو جائیں۔ میلسا کو میں حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی ذہنی قوتوں کو کسی بھی جگہ اب تم پر استعمال نہ کرے اور یقیناً وہ ایسا نہیں کرے گی۔ ہم تمہیں کسی بھی طرح مجبور نہیں کریں گے اگر تم ہمیں زندگی کا موقع دو۔ ورنہ دوسری صورت تمہارے سامنے ہے۔"

میں نے صبر و سکون سے سوچا ایک طرح سے اس کا کہنا بالکل درست تھا۔ ظاہر ہے باپ بیٹی کی موت نہیں چاہتا اور مجھے بھی یہ درندگی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر ہڈسن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے' کیا آپ کو ان راستوں کی جغرافیائی کیفیت معلوم ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ کچن فور میں رہ کر میں نے بہت کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ بالآخر ہمیں سمندری راستہ تو اختیار کرنا ہی پڑے گا اور اس کے لیے ظاہر ہے ہمیں جانے کیا کیا خطرات مول لینا پڑیں گے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کچن فور سے ایک ایسی شہری آبادی کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے جہاں سے ہم اپنے لیے نئے راستے منتخب کر سکتے ہیں۔"

"اور یہ انتہائی مشکل کام ہے۔ آپ کو اندازہ ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اور یہی سوچ رہا ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں وہ لوگ فوری طور پر ہماری تلاش نہ شروع کر دیں۔ ایسے حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ایک طویل تر مفاد حاصل کرنے کے لیے ہم یہاں خاصا وقت گزار دیں۔ ان کا ذہن جہاں جہاں تک پہنچے ہم وہاں ان سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ یہ سب کچھ اگر ممکن ہو تو ٹھیک ہے ورنہ پھر جیسا تم مناسب سمجھو۔"

"نہیں' جہاں تک آپ نے میلسا کی زندگی کی بات کہی تو میں انسان ہوں' جانور نہیں مسٹر ہڈسن۔ بہرحال ٹھیک ہے۔ بس یہی خیال میرے ذہن میں تھا' لیکن اگر کبھی مجھے یہ احساس ہوا کہ ذہنی طور پر مجھے جانوروں کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے تو شاید میں اپنا یہ معیار برقرار نہ رکھ سکوں۔"

"میں خود تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔" ہڈسن نے کہا اور پھر میلسا سے بولا۔

"یقینی طور پر تم ہماری گفتگو سن رہی ہو۔" میلسا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ہڈسن نے آہستہ سے کہا۔

"میلسا تمہیں اس بارے میں مسٹر شاہ کو مطمئن کرنا ہوگا اور جواب میں میلسا کی سسکیاں سنائی دی تھیں۔ میں چونک پڑا۔ ہڈسن نے اسے دیکھا۔ میلسا زار و قطار رونے لگی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"میں بُری لڑکی نہیں ہوں شاہ' میں بُری لڑکی نہیں ہوں۔ ڈیڈ نے جو کچھ مجھ سے کہا' میں نے اسی کے مطابق آپ کو ہدایت دی۔ اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ......کہ" وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اور میں اپنے دل میں شرمندہ ہو گیا۔ بلاشبہ میلسا کے ساتھ جتنا ساتھ رہا تھا اس میں مجھے وہ ایک نسبتاً پاکیزہ اور اچھی فطرت کی مالک لڑکی نظر آئی تھی۔ اس کے اپنے احساسات اس کے بارے میں نجانے کیا ہوں گے۔ میں نے کہا۔

"نہیں مس میلسا' آپ یقین کریں مجھے آپ پر مکمل بھروسہ ہے اور یہ بھروسہ مسٹر ہڈسن کے کہنے

سے نہیں بلکہ میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات جو رہے ہیں ان کی بنیاد پر ہے۔ آپ براہِ کرم میرے الفاظ کو محسوس نہ کریں بلکہ میرے احساسات کو محسوس کریں اور اگر ایسا ہوا تو مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے قابلِ معافی تصور کریں گی۔''

''میں جانتی ہوں۔ پلیز میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں اور یہ بات میں ڈیڈ کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کو اپنے طور پر بھی کوئی حکم نہیں دوں گی بلکہ آپ یقین کرلیں اب میں ڈیڈ کا بھی ایسا کوئی حکم نہیں مانوں گی جس میں وہ آپ کو کنٹرول کرنے کے لیے کہیں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے اور...... اور۔'' وہ سسکیاں لیتی ہوئی خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے تسلیاں دیں تھیں پھر میں نے کہا۔

''اب بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم لوگ آرام کی نیند سو جائیں۔'' ہڈسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا تھا۔ نیند نجانے کس وقت آئی تھی۔ میرا اپنا ذہن سوچوں میں گھرا رہا تھا۔ نجانے کیا کیا خیالات تھے۔ یہ تصور بھی تھا کہ بالآخران تمام ہنگاموں سے نمٹ کر مجھے اپنے وطن واپس پہنچنا ہے۔ ویسے مجھے اس تجربے سے جو کچھ مل گیا تھا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں اپنی اندرونی کیفیات محسوس کرتا تو لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ میں ہوں۔

نیند نے یہ تمام احساسات چھین لیے۔ دوسری صبح ہم نے غذائی گولیاں کھا کر جسمانی تسکین کی۔ لیکن وہ تشنگی بھلا کہاں مٹتی ہے جو اصل غذا کھانے سے ہوتی ہے۔ دوسرا دن انتظار کرتے رہے البتہ تشویش سب کو تھی اور یہ سوچ رہے تھے کہ فرض کیجئے اگر وہ لوگ ہمیں تلاش نہیں بھی کرتے تو پھر کچن فور کو عبور کرنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ مس ہڈسن اور ہڈسن کا بھی یہی خیال تھا کہ ان برفانی تودوں کی جانب رُخ کرنا موت کو قریب بلانا ہے جنہیں ناقابلِ عبور سمجھا جاتا ہے۔ پہاڑی تودوں کا یہ سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا تھا جہاں ہم آچھپے تھے لیکن آگے جاکر یہ اس طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجاتا تھا کہ صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ ایک طرح سے ہم لوگوں نے یہ تصور تو ذہن سے نکال ہی دیا تھا کہ سمندر کو اسٹیمر وغیرہ کے ذریعے عبور کرنے کے علاوہ اور بھی کوئی چارہ کار ہوسکتا ہے۔ دن تیزی سے گزر گیا مکمل خاموشی طاری تھی۔ یہ بات تو کچھ عجیب سی محسوس کی جاتی کہ وہ لوگ اس لیبارٹری میں ہماری موت بھی تصور کرلیتے لیکن پوری رات اور پورا دن گزرنے کے بعد یہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ حقیقتوں کو پانے میں ناکام رہے۔ تاہم بے شک یہ بات سوچنے والی تھی کہ انہوں نے لیبارٹری کی تباہی ایک سانحہ یا حادثہ کیوں سمجھ لی۔ یہ تو سوچنا ہی پڑا ہوگا انہیں کہ لیبارٹری کی تباہی میں کسی کا ہاتھ ضرور ہے اور وہ ہاتھ کس کا ہوسکتا ہے۔ بہرطوران کی ہماری طرف سے بے پروائی ہمارے لیے ہی سودمند تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وقت نے تبدیلی کا اعلان کیا اور یہ تبدیلی رات کے کسی حصے میں نمودار ہوئی تھی۔ دن میں ہمارے درمیان کوئی خاص اور اہم گفتگو نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ ہم نے ایک دو بار یہاں سے واپسی کے بارے میں سوچا تھا۔

مالمو جانے کا خیال بھی دل میں آیا تھا لیکن وہاں پہنچنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ کچن فور کی جغرافیائی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ بہرطور رات کو کچھ بیزاری کے سے انداز میں سونے کے لیے لیٹے۔ ذہن کو آزاد ہی چھوڑنا زیادہ بہتر تھا کیونکہ اسے اُلجھائے رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن پھر رات کا وہ نجانے کون سا حصہ تھا اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی

اور آنکھ بلاوجہ نہیں کھلی تھی۔ مجھے گولیوں کی آواز سنائی دی تھی اور یہ گولیاں زیادہ دور نہیں چل رہی تھیں۔ میں اُچھل کر بیٹھ گیا حالانکہ غار میں مکمل تاریکی پھیلی ہوئی تھی لیکن نگاہیں اس تاریکی میں بھی جائزہ لے سکتی تھیں۔ ایک لمحے میں مجھے احساس ہوگیا کہ ہڈسن اور میلسا غار میں موجود نہیں ہیں۔ میں اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ایک ہی خیال ذہن میں آسکتا تھا وہ یہ کہ ان لوگوں نے ہمارے بارے میں اندازہ کرلیا۔ شبہ تو ہونا ہی تھا انہیں سو ہوگیا لیکن وہ اتنی صحیح جگہ پہنچ جائیں گے اس کا مجھے یقین نہیں تھا۔

گولیوں کی آواز خاصی تیز تھی اور یقینی طور پر سب مشین گن استعمال کی جارہی تھی۔ ایک لمحے تک میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ آواز کی سمت کون سی ہے اور اندازہ لگانے کے بعد آہستہ آہستہ رینگتا ہوا غار کے دہانے کے قریب پہنچ گیا لیکن میرا ذہن جاگ رہا تھا۔ میں سینے کے بل رینگتا ہوا غار سے باہر نکل آیا اور باہر تاروں کی چھاؤں میں، میں نے وہ مناظر دیکھ لیے جن سے میری بات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ غار کے دہانے سے کوئی چالیس گز کے فاصلے پر میں نے تاریکی میں ایک ہیلی کاپٹر کا ہیولا دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ایک ٹیلے کی آڑ سے گولیاں برسائی جارہی تھیں۔

ان کا رُخ کس جانب تھا۔ یہ اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو پایا تھا۔ میں اسی طرح رینگتا ہوا بے آواز آگے بڑھتا رہا۔ صورتِ حال سے صحیح واقفیت بہت ضروری تھی۔ میں نے یہ تو اندازہ اچھی طرح لگایا تھا کہ گولیاں برسانے والے کم از کم ہڈسن اور میلسا نہیں ہو سکتے۔ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے، زیادہ سے زیادہ ہڈسن کے پاس وہ شعاعی گن تھی جسے اس نے ہیلی کاپٹر پر استعمال کیا تھا۔ میں رینگتا ہوا اس جگہ سے کوئی پانچ گز پیچھے رک گیا جہاں میں دو سایوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک خاص سمت کا نشانہ لے کر گولیاں برسا رہے تھے لیکن ان کی سمت کا مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کیونکہ دوسری طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہورہی تھی۔ میلسا اور ہڈسن کہاں گئے، کیا یہ جنگ انہی سے کی جارہی ہے مگر یہ لوگ غار میں کیوں نہیں داخل ہوئے۔ انہیں یہ کیسے علم ہے کہ ادھر کوئی دشمن چھپا ہوا ہے جدھر سے گولیاں برسا رہے ہیں۔

صورت حال سمجھ میں نہیں آرہی تھی، تب مجھے اپنے عقب میں کوئی دو گز کے فاصلے پر ایک ٹیلا نظر آیا۔ یہ ٹیلا بھی اچھا خاصا بلند تھا۔ ٹیلا کیا ایک مضبوط چٹان تھی، جو اپنی جگہ سے کبھی اکھڑ گئی ہوگی لیکن یہاں اب اس نے مضبوط جڑیں بنا لی تھیں۔ میں ایک لمحے تک سوچتا رہا اگر اس ٹیلے پر چڑھنے کے بعد میں ان دونوں افراد پر حملہ کرنے کی کوشش کروں تو مجھے یقینی طور پر کامیابی ہوسکتی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے سب مشین گنوں سے گولیاں برسا رہے تھے، میں نے ایک لمحے میں یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں ٹیلے کی جانب بڑھا اور چند لمحات کے بعد ٹیلے کی بلندی پر پہنچ گیا۔ یہاں سے اپنے جسم کو تول کر ان لوگوں پر ایک کامیاب چھلانگ لگائی تھی۔ اگر ناکام رہا تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اپنے آپ کو پوری طرح مستعد کر کے پاؤں چٹان پر جما کر بالآخر میں کسی بہت بڑی چیل کی طرح اپنے ہاتھ پھیلائے ان پر پرواز کرگیا اور میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ میں ان دونوں کے اوپر جا پڑا۔ دونوں کی گردنیں بری طرح سے زمین سے ٹکرائی تھیں چونکہ پتھریلی زمین تھی اور نیچے نوکیلے

پھر بھی۔ چنانچہ میری کوشش انتہائی کارگر رہی۔ ان دونوں کے حلق سے چیخیں نکلیں اور انہوں نے سب مشین گنیں پھینک کر خود کو سنبھالنا چاہا لیکن یہ اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا کہ وہ میرے ساتھی نہیں تھے۔ بس اتنا ہی کافی تھا ان کے علاوہ جو کوئی بھی ہوتا وہ دشمن کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی گردنیں میرے ہاتھوں کے شکنجے میں تھیں اور میں نے ان کے چہرے بُری طرح ان پتھروں پر رگڑنا شروع کر دیئے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کے حلق سے شاید آخری ہی کراہیں نکلی تھیں کیونکہ جس قوت سے میں نے سر ٹکرائے تھے اس کے بعد ان میں زندگی بحال رہنا ممکن نہیں تھا۔ نیند کے عالم میں جاگا تھا اور ذہن پر وحشت چھائی ہوئی تھی اس لیے یہ کارروائی بھی بڑی بے خوفی سے کر ڈالی ورنہ عام حالات ہوتے تو میں انہیں زندہ رکھنے کی کوشش ہی کرتا۔ کسی کی موت سے بہر طور مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن کیا کیا جاتا میں نے انہیں پلٹ کر سیدھا کر دیا۔ چہرے تو ناقابلِ شناخت ہی ہو گئے تھے اور ویسے بھی رات کا وقت تھا۔ کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کون ہیں۔ البتہ یہ خوف ضرور تھا کہ ان کی چیخوں سے ان کے دوسرے ساتھی ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ ذہن نے فوراً ہی عمل کیا۔ میں نے ایک سب مشین گن پر قبضہ کر لیا۔ ان تمام چیزوں کا استعمال اب میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا اور اس سلسلے میں میں یقینی طور پر مشن والوں کو دعائیں دے سکتا تھا۔

سب مشین گن سیدھی کر کے میں نے فوراً ہی اپنی پوزیشن سنبھال لی اور انتظار کرتا رہا کہ کوئی میرے قریب آئے۔ میرے کان دور دور تک کی آوازیں سن رہے تھے۔ تاحدِ نگاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کوئی سرسراہٹ تک بلند نہیں ہو رہی تھی۔ ان دونوں کے جسم ساکت ہو گئے تھے اور وہ اس طرح پاؤں پھیلائے پڑے ہوئے تھے جیسے ان کی روحیں پرواز کر گئی ہوں۔ جب دیر تک مجھے کوئی ایسا شبہ نہ ہو سکا کہ اور کوئی بھی یہاں موجود ہے تو میں ان لوگوں کے قریب پہنچا۔ جھک کر ان کا معائنہ کیا۔ وہ دونوں موت کا شکار ہو گئے تھے۔ سب مشین گن میں نے اپنے پاس ہی رہنے دی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں صرف یہ دو افراد آئے ہوں گے' ہیلی کاپٹر کافی بڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی کو کہ احساس ہو گیا ہو کہ جنگ ہو رہی ہے اور وہ چھپ گیا ہو اور طویل انتظار کرتا رہا ہو۔

بہر حال اب اس انتظار میں رات تو نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ میں آگے بڑھ کر ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچا۔ اس میں اندر جھانکا اس کے اطراف میں دیکھا لیکن کوئی موجود نہیں تھا' پھر مجھے ہڈسن اور میلسا کا خیال آیا آواز دیئے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے پہلے دو بار آہستہ اور اس کے بعد با آواز بلند انہیں پکارنے لگا۔ چند لمحات کے بعد فضا میں مجھے ایک نیلا شعلہ نظر آیا میں چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس سمت یہ دونوں افراد گولیاں برسا رہے تھے یہ وہی سمت ہے جہاں سے نیلا شعلہ ابھرا تھا اور یہ نیلا شعلہ یقینی طور پر اس شعاعی گن کا کارنامہ تھا جس سے ہیلی کاپٹر تباہ کیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے دل میں ایک اور خیال آیا۔ ہڈسن نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا۔ بہر طور جو کچھ بھی تھا ادھر جانا یقینی تھا۔ چنانچہ میں احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ہیلی کاپٹر سے کوئی پچاس گز دور گیا ہوں گا کہ میں نے زمین پر کچھ دھبے دیکھے۔ دھبے غیر

متحرک تھے۔ چند لمحات ان کا جائزہ لیتا رہا۔ سب مشین گن ہاتھ میں موجود تھی۔ اگر وہ کوئی حرکت کرتے تو جواب دے سکتا تھا لیکن وہ جس طرح ساکت پڑے ہوئے تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر انسان ہیں بھی تو بہتر حالت میں نہیں ہیں۔ میں تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا اور میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی لیکن جھک کر ان کے جسموں کو ٹٹولا تو اُچھل پڑا۔ ان کے جسم کوئلہ ہو چکے تھے۔ ان کی انسانی شکل جوں کی توں برقرار تھی لیکن پورا بدن کوئلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ فوراً ہی ہڈسن کی شعاعی گن کا خیال آیا جس کا کارنامہ ایک بار دیکھ چکا تھا۔ گویا یہ ہڈسن کا شکار ہوئے ہیں، اس سیدھ کا ابھی تک اندازہ تھا جہاں سے نیلا شعلہ لپکا تھا۔ چنانچہ میں انہیں چھوڑ کر اس جانب چل پڑا۔ ہڈسن اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں اس ٹیلے کے قریب پہنچ گیا جہاں سے نیلا شعلہ ابھرا تھا۔ دل میں ایک خدشہ سر ابھار رہا تھا اور وہاں پہنچ کر اس خدشے کی تصدیق ہوگئی۔ دو انسانی لاشیں یہاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک ہڈسن کی تھی اور دوسری میلسا کی۔ دل بُری طرح پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے شدید غم کا اظہار ہوا تھا حالانکہ ان دونوں سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا لیکن دل کے گوشوں میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ بے شک وہ غلط لوگ ہیں یا پھر میرے سامنے غلط انداز میں آئے ہیں لیکن فطری طور پر بُرے نہیں ہیں۔ خصوصاً ہڈسن اور اس کی بیٹی، اس نے اپنی جو کہانی سنائی تھی اب حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گئی تھی۔

لیکن...... لیکن ان دونوں نے یہ کیا حماقت کی، میں تو گہری نیند سو گیا تھا۔ اگر ہیلی کاپٹر کی آواز سنی تھی انہوں نے اور ہیلی کاپٹر اتنے قریب آ کر اُترا تھا تو مجھے بھی ہوشیار کر دینا ضروری تھا۔ صورت حال عملی شکل میں سامنے آ رہی تھی۔ ہڈسن اور میلسا میرا تحفظ کرنے کے لیے شعاعی گن لے کر باہر نکلے۔ انہوں نے جگہ تبدیل کر لی، مقابلہ کیا اور اس کے بعد ان لوگوں کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی لاشیں دیکھتا رہا۔

میلسا کا سر ہڈسن کے سینے پر رکھا ہوا تھا اور اس کا جسم گولیوں سے داغ دار تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ ہڈسن کے پورے جسم میں بہت سی گولیاں پیوست تھیں یقیناً انہی سب مشین گنوں کا شکار ہوئے ہوں گے اور اس وقت تک کم از کم ہڈسن ضرور زندہ ہوگا جب میں نے اسے آوازیں دی تھیں۔ وہ نیلا شعلہ اس نے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہی فضا میں بلند کیا تھا اور اس کے بعد مر گیا تھا لیکن حماقت کی تھی ان لوگوں نے۔ اگر مجھے جگا لیتے تو شاید۔ مگر ان کی ایثار پسندی نے انہیں موت سے ہمکنار کر دیا۔

میں رنج و غم کے عالم میں ڈوبا رہا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ ہیلی کاپٹر اور ان لوگوں نے صحیح جگہ کا اندازہ کیسے لگا لیا۔ مشن والے بہر طور اتنے احمق نہیں تھے کہ لیبارٹری کی تباہی کو نظر انداز کر دیتے اور اسے ایک اتفاقیہ حادثہ سمجھتے۔ تمام تر توجہ میری ہی جانب گئی ہوگی اور انہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ میں بہترین صلاحیتوں کا مالک بن چکا ہوں۔ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے لیے ایک خطرناک دشمن تیار کر لیا تھا اور شدید نقصان سے دوچار ہوئے تھے۔ اگر ان تمام باتوں کو سوچنے کی بجائے یہ سوچا جائے کہ کیا کیا جائے۔ جب ایک ہیلی کاپٹر یہاں پہنچا ہے اور اس سے پانچ افراد یہاں تک آئے ہیں

توان کے پیچھے دوسرے بھی آ سکتے ہیں۔ اس وقت تو بہتر طریقہ یہی ہے کہ اپنے بچاؤ کا معقول بندوبست کرلیا جائے۔ ان دونوں لاشوں کو ان کی جگہ سے ہٹانا بھی بیکار تھا۔ اب ان کے پاس کیا رکھا تھا۔ وہ بیگ جس میں غذائی گولیاں اور دوسرا سامان موجود تھا۔ میرے لیے اب باعثِ دلچسپی تھا۔ میں نے کبھی اس کا جائزہ نہیں لیا تھا لیکن ہڈسن اپنی تمام ضرورتیں اسی سے پوری کرتا تھا۔ ان دونوں پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور واپس چل پڑا۔ راستے میں ایک اور خیال آیا۔ میلسا ختم ہو چکی ہے اور اب اس کے بعد وہ تمام رابطے بھی ٹوٹ چکے ہیں۔

آہ! یہ سب کچھ بڑے عجیب و غریب انداز میں ہو گیا تھا۔ حالانکہ بارہا دل میں سوچا تھا کہ میرا ذہنی کنٹرول میلسا کے پاس ہے، کہیں کسی وقت وہ کسی دباؤ کے تحت مجھے مجبور نہ کر ڈالے اور اس سلسلے میں میرا ذہن ہمیشہ ہی اُلجھا رہتا تھا۔ لیکن اب یہ ساری کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میرا ذہن اب ہر قسم کے کنٹرول سے آزاد تھا جہاں تک اس میں موجود کسی بیرونی شبہ کا معاملہ تھا تو اس کے لیے نہ میں کچھ کر سکتا تھا اور شاید کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہرطور یہ مستقبل کی بات تھی۔ فی الحال اس وقت دیکھنا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر کو لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ تیز رفتاری سے واپس اس غار کے قریب پہنچا۔ اندر داخل ہوا، ہڈسن کا تھیلا اُٹھایا اور ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ گیا۔ ہیلی کاپٹر اُڑانے کی کوئی تربیت میں نے کبھی نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن جو خفیہ صلاحیتیں میرے ذہن میں محفوظ کی گئی تھیں ان کے تحت میں نے بآسانی پہلی ہی بار ہیلی کاپٹر پائلٹ کر لیا تھا اور اس وقت بھی مجھے اس میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہیلی کاپٹر کا فیول وغیرہ میں نے دیکھ لیا تھا چنانچہ سمت کا تعین کرنے کے بعد میں نے فضا میں ایک سیدھ اختیار کر لی۔ رات کا وقت تھا اور صبح ہونے میں شاید ابھی اچھی خاصی دیر تھی۔ نیچے سمندر تھا۔

ہڈسن نے راستوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے جب سمت کا تعین کیا تھا تو میں نے اسے اچھی طرح ذہن میں رکھا تھا حالانکہ اس وقت ایسی کوئی بات دل میں نہیں تھی کہ اس طرح کبھی فوری طور پر پرواز کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن اس وقت یہ سب کچھ بڑا کارآمد ثابت ہوا تھا۔ سمندر کے اوپر پرواز کرتا ہوا میں فضا میں نگاہیں جمائے سینکڑوں خیالات کا شکار ہیلی کاپٹر کو آگے بڑھاتا رہا اور پھر بہت زیادہ وقت نہیں گزرا، رات کی تاریکیاں بدستور قائم تھیں۔ جب میں نے مدھم مدھم روشنیاں دیکھیں، یہ روشنیاں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں خوشی کی ایک لہر جاگی اس کا مقصد ہے کہ کم از کم میں نے درست ہی سمت اختیار کی ہے اور کسی شہری آبادی تک پہنچ گیا ہوں۔ یہ پتا نہیں تھا کہ یہ مالمو سے کتنی دور ہے لیکن بہرطور اتنا ہی کافی تھا۔ کم از کم ایک ایسی جگہ تو ہاتھ لگی تھی جہاں زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ میں اس سمت نگاہیں جمائے ہیلی کاپٹر پائلٹ کرتا رہا کچھ دیر کے بعد خشکی سامنے آ گئی۔ سرسبز و شاداب علاقہ معلوم ہوتا تھا، گو رات کی تاریکی میں اس کے نشانات پوری طرح وضاحت کے ساتھ نہیں دیکھے جا سکتے تھے لیکن ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھے تو بس ایسی جگہ درکار تھی جہاں میں ہیلی کاپٹر کو نیچے اُتار سکوں۔ درختوں کے جھنڈ سامنے آتے رہے۔ ہیلی کاپٹر کافی نیچے لے آیا تھا اور پھر ایک ایسا علاقہ نظر آ ہی گیا جہاں میں ہیلی کاپٹر کو بآسانی نیچے اُتار سکتا تھا۔

❁......❁......❁

مجھے خطرہ یہ تھا کہ ہار پرمشن نے ایک شخص کو میرا ہمشکل بنا دیا ہے جس کو وہ لارڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ اگر وہ پاکستان چلا گیا اور میری پوزیشن کو غلط استعمال کیا تو پھر کیا ہوگا لیکن پھر مجھے اعتماد ہو جاتا کہ آصف جوگی جیسا انسان وہاں بیٹھا ہے جو مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مالک تھا۔ مجھے حوصلہ ہو جاتا تھا۔ اسے میں نے کسی ہوٹل چلنے کا کہا اور پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔

خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھا سڑک کو دیکھتا جا رہا تھا۔ بالآخر ایک ہوٹل کے نیون سائن نظر آئے۔ ٹیکسی رُک گئی میں نے بل ادا کیا' ہڈسن کے بیگ سے کچھ رقم مل گئی تھی۔

ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد کمرہ حاصل کیا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں مَیں نے فرضی نام بیل لکھوایا تھا۔ غرض یہ کہ ہوٹل میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے مقیم ہوگیا۔

صبح جب میں ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ناشتہ کر رہا تھا تو میرے عقب سے ایک آدمی نکلا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''میرا نام فورٹ ہے۔ تم فورٹ سے دوستی کرلو۔''

''میرا نام بیل ہے۔'' میں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''آؤ۔ ڈیئر بیل۔ میں اس دوستی کی خوشی میں تمہیں کچھ پلاؤں۔''

''کافی کے علاوہ میں اور کچھ نہیں پیتا۔''

''ارے تعجب ہے۔ چلو ٹھیک ہے' میں بھی تمہارے ساتھ کافی پیوں گا۔'' ہم دونوں ایک میز پر آبیٹھے۔ فورٹ نے مجھ سے کہا۔

''تمہیں اگر کچھ رقم کی ضرورت ہے تو مجھ سے قرض لے لو۔ ویسے تم رہتے کہاں ہو؟''

''کہیں بھی نہیں اور تم مجھے قرض دے کر ہمیشہ افسوس کرتے رہو گے۔ کیونکہ میرے پاس قرض کی واپسی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''

''تو پھر دوستی کے نام پر صحیح۔ اچھے آدمی ہو' مائی ڈیئر مسٹر بیل۔ میرا خیال ہے میرے ساتھ وقت گزار سکتے ہو۔''

''لیکن ایک قلاش آدمی کے لیے کوئی جگہ کہیں بھی نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔

''میرے دل میں ہے' کیا سمجھتے ہو تم مجھے۔ فورٹ بہت بڑے دل کا مالک ہے اس کے واقف کاروں کا یہی کہنا ہے۔ ویسے تم کرتے کیا ہو؟''

''آوارہ گرد ہوں۔ سیاحت کرتا ہوں۔ ملک ملک مارا مارا پھرتا ہوں۔''

''اوہ' گڈ! اچھی زندگی ہے اور اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں؟'' میں ایک آنکھ دبا کر مسکرا پڑا اور فورٹ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''تب تو تمہیں مسٹر کربی فوسٹر کے پاس جانا چاہیے کیونکہ کربی فوسٹر کو ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے جو اس کے لیے کام کریں۔''

''مجھے اس کا پتہ نہیں معلوم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت آسان۔ ہائی لائن چلے جاؤ۔ کاٹیج نمبر بیس میں ملتا ہے وہ۔''

''وری گڈ۔ کیا وہ کربی فوسٹر کی پرائیویٹ رہائش گاہ ہے؟''

''نہیں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ وہ کربی فوسٹر کا دفتر ہے اور وہ عموماً وہیں ملتا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ مسٹر فورٹ۔'' فورٹ کے ساتھ کافی پینے کے بعد میں نے اس سے پرجوش

مصافحہ کیا اور فورٹ نے زبردستی کچھ کرنسی میری جیب میں ٹھونس دی۔ میں نے اس کا مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگر کربی فوسٹر کے ہاں کام مل گیا تو اسی جوئے خانے میں واپس آ کر میں اسے یہ کرنسی واپس کردوں گا اور فورٹ نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ صرف دوستی کے نام پر ہے۔ البتہ جب بھی مجھے اس کی تلاش ہو میں اسی جوئے خانے میں تلاش کرسکتا ہوں وہ عموماً یہیں ملتا ہے، کربی فوسٹر کی رہائش گاہ کے بارے میں تفصیل معلوم ہوگئی تھی۔

دوسرے دن تقریباً ڈھائی اور تین بجے کے درمیان میں اپنے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اس وقت بھی میں نے ذرا عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا۔ ٹیکسی سے میں اس علاقے میں پہنچا اور ہائی لائن کے کاٹیج نمبر بیس کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوائی اور نیچے اتر گیا۔ کاٹیج بہت خوبصورت تھا، لوگ آ جا رہے تھے اور میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا اندر کے ماحول کا نظارہ کرتا رہا تھا۔ پھر خود بھی آگے بڑھ گیا تھا، گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد میں برآمدے میں پہنچا تو ایک آدمی جو مسلح تھا اور بڑے دروازے پر موجود تھا میری جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے کرخت نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کہو کیا بات ہے؟''

''مسٹر کربی فوسٹر سے ملنا ہے مجھے۔''

''کیوں......؟''

''یہ میں مسٹر کربی فوسٹر کو ہی بتا سکتا ہوں۔ ویسے ایک بات میں آپ سے کہہ دوں مسٹر، اگر آپ نے مجھے کربی فوسٹر سے ملنے سے روکا تو اس نقصان کے ذمہ دار آپ ہوں گے جو مسٹر کربی فوسٹر کو پہنچے گا۔'' وہ شخص میرے ان الفاظ سے کچھ متاثر ہوا پھر بولا۔

''میں تمہیں خود مسٹر کربی فوسٹر کے پاس لیے جاتا ہوں۔ اگر وہ اندر آنے کی اجازت دے دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر تمہیں واپس جانا ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' وہ مجھے لیے ہوئے ایک بڑے سے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ نجانے اس دفتر میں کربی فوسٹر کیا کرتا تھا۔ بھاری بھرکم جسامت کا بلڈوگ نما آدمی بیٹھا ہوا میز پر رکھے کچھ کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ میری طرف گردن اٹھا کر دیکھا، دیکھتا رہا اور پھر دفعتاً اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس کی آنکھیں کچھ حیران سی ہوگئی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور اس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

''ہیلو...... ہیلو! آؤ کون ہو تم؟ آؤ اندر آ جاؤ۔ پلیز اندر آ جاؤ۔ خیریت آؤ...... آؤ۔'' میں اس کے الفاظ میں کچھ عجیب سی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ لانے والا آدمی واپس چلا گیا، کربی فوسٹر کرسی کے پیچھے سے نکلا میرے قریب آیا۔ میرا چہرہ دیکھتا رہا پھر واپس مڑا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر بولا۔

''اس وقت میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ براہ کرم کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور متحیرانہ نگاہوں سے کہنیاں میز پر ٹکا کر میری جانب دیکھنے لگا۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

''کیا میں تمہارا تعارف حاصل کرسکتا ہوں۔ ڈیئر؟''

''میرا نام نیل ہے۔''

''کہاں کے باشندے ہو؟''

''ایشیائی ہوں۔''

''یہاں کب سے ہو؟''

''کچھ دن ہوئے۔''

''ایشیا کے کون سے ملک سے تعلق ہے؟''
''پاکستان سے۔''میں نے جواب دیا۔
''کتنے عرصے سے یہاں آئے ہوئے ہو؟''
''یہاں آئے ہوئے تو زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن پاکستان سے نکلے ہوئے تقریباً سات سال ہوگئے ہیں۔''
''کیا۔''اس نے حیرانی سے منہ کھول دیا۔
''ہاں۔ پاکستان سے نکلے ہوئے تقریباً سات سال ہوگئے ہیں۔''
''وہاں تمہارا کیا کاروبار تھا؟''
''کچھ نہیں مسٹر۔ یوں سمجھ لیں۔ ایک دیہات سے تعلق تھا اور وہیں زندگی گزاری۔ اس کے بعد کچھ ایسے گھریلو حالات پیش آئے کہ گھر چھوڑ کر ایک جہاز پر چلا گیا۔ ملک ملک گھومتا رہا اور اس کے بعد اس ملک میں اتر گیا اور اپنے طور پر زندگی گزارنا شروع کر دی۔ آپ میری وجہ سے اتنے حیران کیوں ہیں؟''
''اوہ......اوہ مائی ڈیئر مسٹر بیل کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو بالکل درست ہے؟''
''مسٹر کربی فوسٹر میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔''
''مگر تمہارا مشغلہ کیا ہے؟''
''بس آوارہ گردی۔ آپ جیسے لوگوں کی تلاش' آپ جیسے لوگوں کے لیے چھوٹے موٹے کام کر لیتا ہوں اور زندگی گزارنے کا ذریعہ مل جاتا ہے۔''
''ناممکن......ناممکن۔''
''میں سمجھا نہیں مسٹر کربی فوسٹر۔''
''تم سمجھو گے بھی نہیں۔ میرے دوست' میرے عزیز۔ میری جان تم سمجھو گے بھی نہیں۔'' کربی فوسٹر کے رویے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر اس نے پُرخیال انداز میں آنکھیں بند کر لیں اور ایک دم چونک پڑا۔
''ارے ہاں تم یہ بتاؤ میں تمہیں کیا پلاؤں؟''
''اگر آپ واقعی مہمان نوازی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا جو دل چاہے منگوا لیجیے شراب کے علاوہ۔''
''اوہو ایشیائی ہو' پاکستانی ہو ظاہر ہے شراب نہیں پیتے ہو گے۔ اچھا ٹھیک ہے کافی منگواتا ہوں تمہارے لئے۔ آہ میری جان' میرے دوست' تم تمہارا قیام کہاں ہے؟''
''آپ کی سڑکوں پر۔''
''مطلب؟''
''مطلب یہ کہ میرے پاس پیسے ختم ہو چکے ہیں۔''
''اس کی تو تم فکر مت کرو۔ جتنی رقم چاہو لے لو۔ کربی فوسٹر کے مہمان ہو کسی معمولی آدمی کے نہیں۔ مگر خوش بختی اس طرح اپنے قدموں سے چل کر کسی کے پاس ہے یہ آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''
''میں سمجھا نہیں۔''
''سمجھاؤں گا' سمجھاؤں گا' آرام سے سمجھاؤں گا۔ یوں سمجھ لو کہ کربی فوسٹر کے پاس آنے کے بعد تم دنیا کی فکر سے بے نیاز ہو گئے۔ میں' میں بس تقدیر مجھے کچھ دینا چاہتی ہے۔'' میری حالت خراب ہونے لگی تھی اس شخص کو کیا ہو گیا تھا مجھے دیکھ کر یہ اس قدر کیوں دیوانہ ہو گیا ہے۔ میری پرتجسس نگاہیں اس کا جائزہ لیتی رہیں وہ مسکراتا رہا۔ کافی آ گئی اور اس کے بعد اس نے بڑی محبت سے کافی کی پیالی مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔
''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میرا دوست میرے شہر میں سڑکوں پر مارا مارا پھرے۔ مگر ایک بات بتاؤ' تم میرے پاس پہنچے کیسے؟''

''میں نے آپ کے بارے میں کسی سے سنا تھا۔''

''کس سے؟'' فوسٹر ایک دم سنبھل گیا۔

''مسٹر فورٹ سے۔''

''تم انہیں کیسے جانتے ہو؟''

''سڑکوں پر ملاقات ہوئی تھی۔''

''ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں مسٹر بیل۔ یہ نام بتایا تھا نا آپ نے۔''

''جی مسٹر کربی فوسٹر۔''

''مسٹر بیل آپ کی میرے پاس آمد صرف اس کے تحت ہے کہ فورٹ نے آپ سے میرے بارے میں تذکرہ کیا تھا۔''

''ہاں۔''

''میری جان مسٹر بیل' میں دلی طور پر اس کا خواہشمند ہوں کہ تم میرے پاس قید ہو جاؤ۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ میرے پاس رہ جاؤ۔ بھول جاؤ کہ تمہیں کوئی مالی پریشانی ہے۔ میرا نام کربی فوسٹر ہے اور سچی بات یہ ہے کہ تم میرے لیے اس قدر کارآمد ہو کہ میں تم پر ہر وہ رقم خرچ کر سکتا ہوں جس کی تمہیں ضرورت ہو۔''

''تو پھر ٹھیک ہے میں نے بھی آپ کو اپنی بات بتا دی' مسٹر کربی فوسٹر۔'' آپ اگر چاہیں گے تو میں طویل عرصے تک آپ کے ساتھ رہ کر کام کر سکتا ہوں۔''

''تو پھر میں تمہارے لیے پہلے رہائش گاہ کا بندوبست کرتا ہوں۔ ذرا ایک منٹ کی مہلت دو مجھے۔'' اس نے کہا اور میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ کام بن رہا تھا۔ کربی فوسٹر کی دلچسپی جو کچھ بھی ہو لیکن میں بھی اس سے اتنی ہی دلچسپی رکھتا تھا۔ کربی فوسٹر نے ٹیلیفون اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ کچھ دیر وہ ریسیور کان سے لگائے رہا اور جب دوسری جانب سے رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے کہا۔

''اوہ ڈیئر ایری۔ کیا کر رہی ہو تم۔ ٹھیک ہے میرے پاس آ جاؤ۔ ہاں براہِ کرم فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ پھر خاموش ہو کر مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے انداز میں جو عجیب سی کیفیت پائی جاتی تھی وہ میرے لیے بھی باعثِ حیرت تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد ایک خوبصورت سی لڑکی اندر داخل ہو گئی۔ دبلے پتلے بدن کی مالک اور نہایت سبک نقوش رکھتی تھی' وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی تو کربی نے میرا اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میری بیٹی ایری فوسٹر۔''

''ہیلو!'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ مسکراتی آنکھوں والی یہ لڑکی مجھے بھی پسند آئی تھی۔ چہرے پر شوخی' شرارت' معصومیت سب کچھ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے باپ کے معمولات سے متعلق نہ ہو۔ پھر کربی فوسٹر نے کہا۔

''ایری یہ ہمارے معزز مہمان ہیں اور میں نے طے کیا ہے کہ ان کی میزبانی تمہیں سونپ دی جائے۔''

''آپ کا نام مسٹر۔'' اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''بیل۔''

''گڈ۔ بہت خوبصورت نام ہے۔ میرا نام تو ڈیڈی آپ کو بتا ہی چکے ہیں ایری فوسٹر۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔''

''میں آپ کو ایک معزز مہمان کی حیثیت سے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں۔''

''اور ڈیئر پھر ان کے ساتھ فی الحال تمام تر دلچسپیاں محدود رہیں گی۔ میرا مطلب ہے انہیں تحفظ چاہیے۔ ہمیں انہیں اپنی کوٹھی ہی میں محدود رکھنا ہوگا۔''

''ہمارے پاس کافی انڈور گیم ہیں اور میرا خیال ہے مسٹر بیل ہمارے گھر میں بور نہیں ہوں گے۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تم اپنی گاڑی میں انہیں اپنے گھر لے جاؤ اور ذرا احتیاط رکھنا۔''

''اوکے ڈیڈی۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ کربی فورسٹر میری جانب رُخ کر کے بولا۔

''اور اس احتیاط کا مطلب یہ نہیں کہ ایری تم سے محتاط رہے۔ بلکہ میں نے اسے یہ ہدایت دی ہے کہ اطراف سے ذرا ہوشیار رہے اور تمہیں بہت زیادہ لوگوں کے سامنے پیش نہ کرے۔ اس تمام کارروائی کی وجہ میں بہت جلد تمہیں بتا دوں گا ڈیئر بیل۔ اس سلسلے میں فکر مند نہ ہونا۔''

''آپ کے پاس آنے کے بعد اور آپ سے دوستی ہونے کے بعد میں نے ہر فکر کو ذہن سے نکال دیا ہے۔ ویسے بھی میں فکر مند ہونے کا شوق نہیں رکھتا مسٹر فوسٹر۔ بلکہ کوشش کرتا ہوں اگر ان میں ناکام ہو جاتا ہوں تو مزید کوششیں کرتا ہوں یہی میرا طریقہ کار ہے۔''

''خطرناک بہترین اور نفیس۔'' کربی فوسٹر نے اعتراف کرتے ہوئے کہا اور ایری کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ایری کی کار بہت خوبصورت تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ اسی نے سنبھالی اور میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنے کی عادی تھی اور اس تیز رفتاری کی وجہ سے راستے میں اس سے گفتگو کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ میں خاموشی سے اس کا کھلنڈرا پن دیکھ رہا تھا۔ کار مختلف راستے طے کرتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ سرسبز و شاداب اور حسین رہائشی علاقہ تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کربی فوسٹر کے بارے میں مجھے جو اطلاع ملی تھی وہ بالکل درست تھی۔ وہ کاٹیج اس کا دفتر ہی تھا۔ رہائش گاہ بہت خوبصورت تھی اور خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ان لوگوں نے طرح طرح کے ننھے پرندے پال رکھے تھے۔ جن کی رہائش کے لیے قدرتی ماحول مہیا کیا گیا تھا اور اس کے لیے اس عمارت کا بہت بڑا حصہ وقف کیا گیا تھا۔ رہائشی حصہ بہت چھوٹا تھا صرف چند کمروں پر مشتمل۔ ایری مجھے اندر لے آئی اور میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنی زندگی میں کتنے حادثے کیے ہیں؟''

''سمجھی نہیں۔''

''بہت تیز رفتار ڈرائیونگ کرتی ہیں آپ۔''

''شہر سے باہر میری ڈرائیونگ دیکھیے۔ شہر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''یہ بھی بہت کچھ تھا۔ ویسے آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔''

''یہ پرندے میرے اور ڈیڈی کے مشترک شوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈیڈی کو بھی حسین پرندے جمع کرنے کا اتنا ہی شوق ہے۔ ہم دنیا کے مختلف گوشوں میں پرندوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان میں بیشتر نہایت قیمتی ہیں۔ میں آپ کو بڑی تفصیل سے سب کچھ سمجھاؤں گی۔ ویسے اگر آپ ہمارے ہاں قیام کریں گے مسٹر بیل تو آپ کو لباس وغیرہ کی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''ہاں میرے کپڑے ایک ہوٹل میں ہیں۔''

"میں وہاں سے منگوالوں گی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں بلکہ ڈیڈی کو فون کر دوں گی۔ آیئے فی الحال میرے اپنے چھوٹے سے گھر کا نظارہ کیجیے۔" مجھے ہر چیز سے نفاست ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ پھر کہنے لگی۔

"ڈیڈی تو اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں مگر ان کی دیکھ بھال مکمل طور پر میرے سپرد ہے۔"

"اور آپ کی ممی یا دوسرے لوگ۔"

"ممی نہیں ہیں، میں نے تو کبھی ممی کو دیکھا ہی نہیں۔ بس جب آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو ڈیڈی میری نگاہوں کے سامنے تھے۔"

"آپ کے ڈیڈی کا کاروبار کیا ہے؟"

"ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ کہ میں کبھی ان کے کاروبار کی چھان بین نہ کروں اور صرف اپنی دلچسپیوں سے سروکار رکھوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ کبھی نہیں پوچھا کہ میرے ڈیڈی کیا کرتے ہیں لیکن خوشحال لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دیکھیے عارضی طور پر آپ کے لیے یہ کمرہ مناسب رہے گا۔ یہی کمرہ ہم اپنے خاص مہمانوں کے لیے مخصوص رکھتے ہیں۔ وہ میرا کمرہ ہے اور وہ ڈیڈی کا۔ یہ ڈائننگ ہال ہے اور اسی ڈائننگ ہال کو آپ ڈرائنگ روم کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں کیونکہ ہم نے رہائشی جگہ بہت چھوٹی بنائی ہے۔ زیادہ لوگوں کو ہم کبھی مدعو نہیں کرتے۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں بھی کبھی ہی کوئی آ کر رہ جاتا ہے، آپ کی آمد سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔

"آپ کی اور مصروفیات کیا ہیں مس ایری؟"

"بس یوں سمجھ لیجیے سب سے بڑی مصروفیت یہ پرندے ہیں۔ اس کے علاوہ شطرنج کھیلتی ہوں اور ٹینس کھیلتی ہوں۔ تاش کھیل لیتی ہوں، یہ دو تین مشغلے ہیں۔ میری دوست بھی کبھی کبھی میرے پاس آ جاتی ہیں لیکن ان کے قیام کی اجازت یہاں نہیں ہے۔"

"آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔ آپ بہت خوبصورت آدمی ہیں۔ خاص طور سے آپ کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پائی جاتی ہے جو میں نے عام لوگوں میں نہیں دیکھی۔ معاف کیجیے گا میں ہر بات کو بے تکلفی سے کہہ دینے کی عادی ہوں لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس کے بعد میں آپ سے اظہار عشق کر دوں گی۔ میں نے اپنی زندگی کے لیے ایک فیصلہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ ڈیڈی کے ساتھ عمر کا آخری حصہ تک گزار دوں گی۔ عشق وشق جیسی چیزوں کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ آدمی خواہ مخواہ بے وقوف بن کر رہ جاتا ہے۔ ویسے مسٹر بیل آپ عشق و محبت کے قائل ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔

"کیا واقعی؟"

"جی۔"

"تب تو ہمارے اور آپ کے درمیان اچھی دوستی چلے گی۔ مجھے نوجوان اسی لیے ناپسند ہیں کہ ملاقات کے دوسرے ہی دن وہ اپنی آنکھوں میں تشنگی کیفیت پیدا کر کے اپنے مدمقابل کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں جیسے کوئی بھکاری سڑک پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہو۔" میں ہنس پڑا۔

"اور آپ بھی بہت دلچسپ ہیں مس ایری۔"

"شکریہ...... بے حد شکریہ۔" ایری نے تھوڑی دیر کے لیے ذہن شگفتہ کر دیا تھا اور اپنے آپ کو فکروں سے آزاد پا رہا تھا۔ پھر رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مسٹر کربی فوسٹر واپس آئے۔ لمبی سی خوبصورت کار پارکنگ پر آ کر رکی اور مسٹر کربی

فوسٹر ہاتھ میں ایک بریف کیس لیے ہوئے اندر آتے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے برآمدے میں ہی ان کا استقبال کیا' مسکراتے ہوئے بولے۔

''ویری گڈ۔ دونوں خوش نظر آرہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان خوب دوستی ہوگئی۔''

''مسٹر بیل مجھے بے حد پسند آئے ہیں ڈیڈی۔ بہت اچھے انسان ہیں یہ۔''

''مسٹر بیل۔'' کربی فوسٹر نے مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آہستہ سے بولے۔

''مسٹر فوسٹر بہت سے لوگوں کے لیے خوشی اور خوش بختی کا باعث ہے آیئے۔'' رات کا کھانا ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا اور کھانے کے بعد مسٹر کربی فوسٹر نے کہا۔

''ایری اگر تم اجازت دو تو میں اپنے مہمان کے ساتھ کچھ دیر تنہائی میں بسر کرلوں۔''

''یقیناً ڈیڈی ہم لوگ تو پورا دن ہی ساتھ رہے ہیں۔ اوکے۔ اوکے میں ذرا اپنے پرندوں پر ایک نگاہ ڈال لوں۔ الوداعی نگاہ۔ میرا مطلب ہے رات کی آخری نگاہ۔'' ایری نے کہا اور باہر نکل گئی۔ کربی فوسٹر مسکراتا ہوا بولا۔

''اور یقیناً اس لڑکی کی سادگی نے تمہیں پریشان نہ ہونے دیا ہوگا۔ بس میں اس کے بارے میں تفصیل نہیں بتانا چاہتا۔ یوں سمجھ لو میں نے اس کے ذہن کی ایک خاص تربیت کی ہے اور یہ اپنی فطرت بھی نہیں کھو پائی جتنی اس کی عمر ہے اتنی ہی معصوم ہے۔ لیکن جتنی وقت کی ضرورت ہے اتنی ہی سمجھدار بھی۔''

''میں نے اندازہ لگایا ہے مسٹر کربی فوسٹر۔'' کربی فوسٹر مجھے لیے ہوئے اپنے کمرے میں آیا اور پھر ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے خود بستر پر جا بیٹھا۔

''دن بھر کی مصروفیات اب تھکا دیتی ہیں۔ عمر خود اپنا اظہار کرتی ہے کہ اب وہ کس منزل تک پہنچ گئی ہے۔''

''مسٹر کربی فوسٹر' فورٹ نے آپ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا آپ کی شخصیت میں نے اس سے مختلف پائی ہے۔''

''خیر۔ اب ہمارے اور تمہارے درمیان وہ ضروری گفتگو ہوگی جس کے لیے میرا خیال ہے تم بھی بے چین ہوگے اور میں بھی۔''

''یقیناً مسٹر کربی فوسٹر۔'' میں نے جواب دیا اور سوالیہ نگاہوں سے کربی فوسٹر کا چہرہ دیکھنے لگا جو ایک بار پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا جیسے اپنے ذہن میں خیالات جمع کررہا ہو۔ پھر میری طرف دیکھ کر اچانک مسکرایا اور بولا۔

''میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ جرم کی دنیا میں گزارا ہے مسٹر بیل۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں یہ اعتراف کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتا اور یقینی طور پر آپ کو بھی جب میرے بارے میں علم ہوا ہوگا تو آپ نے میری شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگایا ہوگا۔ میں جھوٹ بولوں یا اپنے آپ کو کسی نئی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کروں تو ابتداء ہی غلط ہوجائے گی۔ یعنی آپ وہ اعتماد نہیں کرپائیں گے مجھ پر جو میں آپ سے چاہتا ہوں۔ ہم ہر آدمی کا ایک مقام تعین کرتے ہیں اور اسی کے مطابق اس سے گفتگو کی جاتی ہے۔ بعض جگہ جھوٹ کا سہارا لینا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے لیکن بعض جگہ حقیقتوں کا اس طرح کھل کر بیان کردینا ہوتا ہے کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے اور اس سے یقینی طور پر فائدے حاصل ہوسکتے ہیں۔

میرا یہ زندگی بھر کا تجربہ ہے۔ میں آپ کو جو کچھ

بتا رہا ہوں مسٹر بیل! اس میں ذرا برابر جھوٹ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میری زندگی کا بیشتر حصہ جرم کی دنیا میں بسر ہوا ہے اور میں نے ہر طرح کی مجرمانہ کارروائی کی ہے جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں مسٹر بیل وہ انتہائی عجیب و غریب تو نہیں ہے اور جرائم کی دنیا بہر طور سنسنی خیز واقعات سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اپنے اپنے چھوٹے گروہ بنا کر کام کرتے ہیں۔ میرے گروہ میں اس وقت بیالیس افراد ہیں، جو میرے لیے کام کرتے ہیں جو مختلف ممالک میں تعینات ہیں۔ جگہ جگہ اپنے عمل کرتے ہیں، کچھ گروہ چھوٹے ہوتے ہیں اور کچھ بڑے بڑے گروہ، چھوٹے گروہوں پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض جگہ ہم ان کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض جگہ وہ ہماری گرفت میں آ جاتے ہیں۔ پھر ہمارے درمیان سمجھوتے ہوتے ہیں اور یہ سمجھوتے بعض اوقات کارآمد ہوتے ہیں لیکن کسی بھی چھوٹے سے مسئلے پر ایک بار پھر ہم دشمنوں کی طرح سامنے آ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''دنیا مختلف قسم کے جرائم میں ملوث ہے اس وقت حکومتیں سیاسی بنیاد پر جرائم کرتی ہیں۔ سرمایہ دار معاشی بنیاد پر جرم کرتے ہیں اور ان جرائم سے انہیں کہیں بھی فرار حاصل نہیں ہے۔ ایک نیک نیت آدمی اپنا سرمایہ لے کر کاروباری دنیا میں آتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرے اس میں سچائیاں ہوں۔ وہ اپنے طور پر ان سچائیوں کو استعمال کرتا ہے مگر جب اس کا رابطہ بین الاقوامی دنیا سے ہوتا ہے تو اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس وقت اسے دو ہی فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنا سرمایہ سمیٹ کر گوشہ نشین ہو جائے اور خاموشی سے بیٹھا وقت گزارتا رہے یا پھر اسے اس سرمائے کو تحفظ دینا ہوتا ہے تو وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ایسے گروہ سے جا ملتا ہے جو معاشی دنیا میں سرپرستی کرتا ہے اور اس کے بعد وہ بھی عام آدمی بن جاتا ہے۔ اس وقت کاروبار زندگی اسی انداز میں چل رہا ہے اور اس میں منفرد ہونے کی کوشش تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یورپ، امریکہ، افریقہ، جتنے براعظم ہیں جس میں ایشیا بھی شامل ہے، اپنی اپنی معیشت کے لیے الگ پالیسی رکھتے ہیں لیکن جگہ جگہ انہیں دوسرے لوگوں سے بھی تعاون کرنا ہوتا ہے۔

یوں تو دنیا میں معاشی بنیاد پر کئی ادارے قائم ہوتے ہیں جن کا تعلق حکومتوں سے نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ داروں کی اپنی الگ حکومت ہوتی ہے اور یہ ایک ٹھوس بات ہے کہ اصل حکومت سرمایہ داروں ہی کی ہوتی ہے۔ سیاسی بنیاد پر وہ بظاہر سامنے نہیں آتے لیکن درپردہ وہ ہر ملک کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ اس میں ملکوں کی بقا چھپی ہوتی ہے اور اسی میں ملکوں کو معاشی استحکام حاصل ہوتا ہے۔ دو ایسے بڑے اداروں کے نام میں تمہارے سامنے لے آیا ہوں جو اس وقت صنعتی سرمایہ کاری پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک نام فورویل کا ہے اور دوسرا ہار پرمشن کے نام سے روشناس ہے۔ اگر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان میں سے کون سا ادارہ زیادہ طاقتور ہے تو ہمیں انتہائی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ دونوں ادارے اپنے طور پر انتہائی مضبوط اور طاقتور ہیں اور اپنا کام بخیر و خوبی چلا رہے ہیں۔ ان دونوں اداروں کے درمیان بھی وہی چپقلش رہتی ہے جس کا تذکرہ میں چھوٹے گروہوں کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ فورویل اپنے طور پر چھایا ہوا ہے تو ہار پرمشن کے جو معمولات سامنے آتے ہیں ان سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی فورویل سے کسی طور

پیچھے نہیں ہے۔ امریکی معیشت آزاد ہے بلکہ یہ سمجھ لو کہ یہ دونوں ادارے امریکی معیشت کے زیر اثر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کے حالات ذرا مختلف تھے کیونکہ ایشیا میں روس ایک بہت بڑا حصہ سنبھالے ہوئے تھا اور امریکی اور یورپین ممالک روس کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن بہرطور روس اپنی مصیبتوں کا شکار ہو گیا اور اس کے پس پردہ بھی بڑی سیاستیں کارفرما ہیں لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے کہ روس کی قوت ختم ہو جانے سے خصوصاً امریکہ اور اس کے ساتھیوں کو عظیم الشان مفادات حاصل ہوئے ہیں لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کرانے کے لیے اعلیٰ پیمانے پر کارروائیاں ہو رہی ہیں اور اس سلسلے میں یہ ساری دنیا میں تہلکہ خیز عمل جاری ہے۔

ایشیا کے بارے میں ہمیشہ ہی یورپین ممالک اور مغربی ممالک تشویش کا شکار رہے ہیں کیونکہ وہ ایک سرکش دنیا ہے اور اس دنیا نے اپنی تمام تر پسماندگی کے باوجود یورپین برتری پورے طور پر تسلیم نہیں کی۔ اس کی بے شمار مثالیں سامنے ہیں۔ اس سرکشی کو ہمیشہ تشویش کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے اور اس کے خلاف ایک طویل عمل جاری ہے لیکن کامیابی ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔ بے شمار ممالک ہیں جو ایشیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ تمام تر کوششوں کے باوجود ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ جاپان دنیا کی معیشت پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی حکومت پھیلتی جا رہی ہے، چین اپنے طور پر ایک مضبوط قوت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ممالک میں صنعتی انقلاب برپا ہے۔ کوریا، تائیوان اور ایسے بے شمار ممالک جنہوں نے امریکی معیشت پر کاری ضربیں لگائی ہیں اور امریکی برتری قبول کرنے کو تیار نہیں۔

خیالِ جدائی

- جدا ہونا اتنا اہم اور میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)
- محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)
- موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)
- جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)
- جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)
- ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

روبی علی...... سید والا

یہ امریکہ کے لیے بڑی تشویش کا باعث ہے اور وہ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے کوششیں کر رہا ہے کہ اس کی اپنی انفرادیت قائم ہو جائے۔ اس سلسلے میں اس کے تمام ساتھی اس کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور ایک انوکھا عمل جاری ہے۔ یہ گروہ جو فور ویل اور ہار پرمشن کے نام سے مشہور ہیں۔ دنیا بھر کے صنعتکاروں کے گروہ ہیں اور ان کا تعاون مختلف ممالک سے ہے۔ یہ اپنے طور پر بھی عمل پیرا ہیں اور طاقتور ممالک کے احکامات کی تعمیل بھی کر رہے ہیں۔ فور ویل اور ہار پرمشن ایک دوسرے کے حریف ہیں اور آپس میں بھی ان میں بہت سے ایسے عمل ہوتے رہتے ہیں جن سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مسئلے کو

نظرانداز نہیں کرتے' ان کی کوششیں ہوتی ہیں کہ دنیا کے ہر ممالک میں ان کے نمائندے ہوں اور مضبوط حیثیت اختیار کر جائیں۔ پچھلے دنوں فوروبل کا ایک کارکن تمہارے ملک میں فوروبل کے مفادات کو قائم نہیں رکھ سکا اور شکار ہو گیا۔ ہار پرمشن نے اس معلومات کے حصول کے بعد فوری طور پر کوششیں شروع کر دیں کہ وہاں اپنی اجارہ داری قائم کر لے اور اس سلسلے میں جہاں اور بہت سے عمل ہو رہے ہیں وہاں ایک نام سامنے آیا ہے اور یہ ہے جہانزیب شاہ۔

تمہارے ہی ملک کا ایک سرمایہ دار ہے لیکن نجانے کیوں یہ بہت سی نگاہوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ پچھلے دنوں جہانزیب شاہ یورپی دنیا کے دورے پر نکلا ہوا ہے اور اس نے دنیا کے کئی ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ اس وقت بھی وہ یورپ میں ہے اور فرانس میں مقیم ہے۔ فوروبل اس سلسلے میں کارروائیاں کر رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایک لڑکی پچھلے دنوں اچانک ہار پرمشن کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ پتہ یہ چلا ہے کہ اس کے پاس ہار پرمشن کے ایسے کچھ راز موجود ہیں جن سے ہار پرمشن کو بدترین نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس لیے ہار پرمشن اس کی تلاش میں ہے' لیکن تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہ لڑکی اب ان علاقوں سے نکل گئی ہے جبکہ کچھ دن پہلے تک اس کی یہاں موجودگی کے شواہد ملتے تھے لیکن اب یہ متفقہ طور پر علم ہو چکا ہے کہ لڑکی اس ملک میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا مسئلہ ایک حد تک پس پشت ہے۔

فوروبل نے ہار پرمشن پر ایک ضرب کاری لگانے کے لیے ایک اور فیصلہ کیا تھا۔ فوروبل کے لیے وہ جہانزیب شاہ کے سلسلے میں عمل کرنا چاہتے ہیں۔ جہانزیب نامی یہ شخص اس وقت فرانس میں موجود ہے اور فوروبل چاہتا ہے کہ اسے اغوا کر کے کسی ایسی شخصیت کو اس کی جگہ دے دی جائے جو فوروبل کے مفادات کے لیے کام کرے اور اس شخصیت کو ایشیا میں بہت بڑی طاقت دے کر اس کام کے لیے آمادہ کر لیا جائے کہ وہ وہاں فوروبل کے مفادات کی نگرانی کرے۔ ہم اس سلسلے میں باقاعدہ کام کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان میٹنگیں ہو رہی تھیں اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ فرانس میں موجود اس ایشیائی باشندے کو اغوا کر کے کسی ایسے شخص کو اس کی جگہ دیدی جائے جو وہاں جا کر فوروبل کے لیے کام کرے۔ چاہے ہار پرمشن اسے اپنا نمائندہ ہی کیوں نہ مقرر کر دے لیکن جب وہ ہمارا آدمی ہو گا تو پھر وہ فوروبل کے لیے کام کرے گا' تمہیں دیکھ کر ایک عجیب سا خیال ذہن میں ابھرا ہے اور یہ صرف تمہاری شکل وصورت اور جسامت کی بنیاد پر ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین کرو گے میرے دوست کہ تم اس اصل شخص کے ہو بہو ہمشکل ہو۔"

"جس کا نام جہانزیب ہے اور وہ فرانس میں مقیم ہے' تمہیں دیکھ کر فوراً ہی یہ تصور میرے ذہن میں ابھرا۔ ہے کیونکہ ایک دن پہلے ہی ایک میٹنگ میں ہمیں اس آدمی کے بارے میں تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی تھی مجھے یقین ہے اب تم اس کا صحیح طور پر اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہو گے اور اگر تم ہمارے اس مقصد کی تکمیل کے لیے تیار ہو جاؤ تو یوں سمجھ لو کہ تمہیں وہ عظیم الشان خزانہ مل جائے گا جس کا اس روئے زمین پر رہنے والا کوئی فرد تصور نہیں کر سکتا۔ اتنا بڑا مقام ہو گا تمہارا کہ تم خود اپنے آپ پر حیران رہ جاؤ گے اور یہ سب کچھ صرف

تمہاری شکل وصورت کی بنیاد پر ہے۔

باقی جہاں تک تمہاری صلاحیتوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تمہاری ہر طرح کی مدد کی جائے گی اور تم سے تعاون کیا جائے گا۔ یہ میرا منصوبہ ہے جو ابھی صرف میرے ذہن میں ہے لیکن تم سے گفتگو کرنے کے بعد میں اسے آگے بڑھانے کے لیے تیار ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ذرا بھی سمجھدار انسان ہیں تو اس سے بڑا کوئی فائدہ تمہیں اپنی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتا اور تم یقینی طور پر مجھ سے تعاون کرو گے۔"

دماغ دہل کر رہ گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سر پر کوئی وزنی چیز رکھ دی گئی ہو اور بھیجا بیٹھنے لگا ہو۔ عجیب و غریب بات تھی' ایک ایسا انوکھا انکشاف جو ذہنی حالت جس قدر بھی خراب نہ کر دیتا کم تھا۔ کیا اچھی بات تھی۔ مجھے میری حیثیت دی جا رہی تھی اور وہ شخص جو فرانس میں مقیم تھا درحقیقت ہار پر مشن کا وہ نمائندہ تھا جسے انہوں نے عارضی طور پر میری صورت دے کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا اور اب مجھے اس کی جگہ دے کر ایک نیا کام شروع کیا جا رہا تھا خدا کی پناہ۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ چھوٹے سے ذہن کا چھوٹا سا آدمی ہوں۔ آدمی کے اندر بڑائی یوں نہیں ہوتی کہ اس کے پاس کاریں' کوٹھیاں' جائیدادیں' فرم' فیکٹریاں' تعلقات ہوں۔ بڑائی انسان کے اندر ہوتی ہے بلکہ بڑائی نامی کوئی چیز انسان کے لیے ہوتی ہی نہیں ہے' سب سے بڑا نام اللہ کا پھر اس کے ان بندوں کا جنہوں نے اپنے نیک عمل سے اس کی قربت حاصل کی۔ ہم پانی کے بلبلے اپنے چھوٹے بڑے ہونے کا تعین خود کر لیتے ہیں۔

میرے دل میں اپنے پاکستان کا پیار ہے۔ میری آرزو ہے کہ مجھے ہزاروں سال کی زندگی ملے اور میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ پاکستان کی خدمت اور اس کی بہتری کے لیے وقف کر دوں۔ جعلی پیر امیر شاہ تہہ خانے میں طبعی موت مر چکے ہیں۔ نیلم خان نے ان کی موت کے بعد خودکشی کر لی تھی۔ میں آج تک ان کے جانشین کے طور پر پوجا جاتا ہوں۔ جن سازشیوں نے مجھے اس جزیرے پر قید کر لیا تھا میں نے انہیں ان کی موت مار دیا لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک پوری نسل میرے پاکستان کے خلاف صف آرا ہے' انہیں آج بھی صلاح الدین ایوبی کا خوف ہے اور ان کے حلیف اب بھی اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ آخر کار فلسطین سے ان کا انخلا ہو جائے گا اور انشاء اللہ ایسا ہو گا۔

نوعمری کے بہت سے مذاق میرے علم میں ہیں جیسے بھیروں جو جان بچا کر ایسا بھاگا کہ پھر اس کا نشان بھی نہیں ملا۔ کچھ نہیں ہے بھیروں ویروں۔ انسان اپنی ذات میں سب کچھ ہے بلکہ کچھ بھی نہیں۔ میں آج بھی ان متبرک ہستیوں کے سائے سے محروم ہوں جو انسان کی ابتدا ہوتے ہیں۔ یعنی ماں اور باپ۔ اپنی یہ آرزو پوری کرنا میری قوت سے باہر ہے۔

آہ کاش' کوئی معجزہ ہو جائے' کاش وہ مجھے مل جائیں۔

ختم شد

تاش کے پتے

وقار الرحمان

کہتے ہیں کہ جوا کسی کا نہ ہوا۔ تاش کے ملعون پتے' زندگی کے باؤن رنگ اور باؤن راستوں کی طرح ہوتے ہیں جو انسان کو الجھاتو دیتے ہیں لیکن منزل تک نہیں پہنچے دیتے۔
رنگین پتوں میں کھوجانے والے ایک شخص کا فسانہ۔

رحیم یار خاں میں گزرے ایام میرے لیے اثاثہ ہیں' انہیں بھلا میں کیسے بھلا سکتا ہوں لیکن زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود گردش ایام سے عبارت ہے۔

یہ داستان مختصر ہے مگر نصف صدی پر محیط ہے' 17 جون 1962ء کا ذکر ہے جب مجھے غم روزگار' کشاں کشاں ایک چھوٹے مگر خوب صورت ' صاف ستھرے شہر رحیم یار خاں لے چلا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اس شہر کے بارونق تجارتی مرکز' نیو صادق بازار میں اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ صادق بازار میں میری نئی سلائی مشینوں کی منفرد دکان تھی۔ یہ دکان شاہی روڈ پر' فردوس چوک سے دائیں ہاتھ صادق بازار میں چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

رہائش کے لیے مجھے قریب ہی بالائی منزل پر ایک کمرہ مل گیا جس کا کرایہ ماہوار 25 روپے تھا۔ اس کمرے کی چھت گرمیوں کی راتوں میں بڑا سہارا بنی۔

گھر سے تیار ہو کر جب میں دکان کو نکلتا' سعید مٹھائی فروش کی دکان راستے میں پڑتی تھی۔ یہ دکان شاہی روڈ کے فردوس چوک پر صادق بازار کی بائیں نکڑ پر تھیں۔ فردوس چوک پر پہنچنے سے پہلے ہی حلوہ پوری کی مہک فضا میں بکھر رہی ہوتی۔ ایک طرف برتن سے لسی تیار ہونے کی مخصوص آواز ایک ردہم سے آرہی ہوتی جو اشتہا بڑھانے میں معاون تھی۔

یہاں سعید مٹھائی فروش کا حلوہ پوری بہت مشہور تھا' سعید کی عمر ستائیس اٹھائیس برس ہوگی۔ کسرتی جسم' گول چہرہ' موٹی آنکھیں' موٹے لیکن پرکشش نقش' سپید رنگت' سیاہ گھنگھریالے بال' گھنی مونچھیں چہرے پر بھلی لگتیں۔ سفید شلوار قمیص پہنے آلتی پالتی مار کر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتا' خوب جچتا۔

میں ہفتے میں دو یا تین بار اس کے پاس ناشتا کرتا' میں جب ادائیگی کرنے لگتا وہ کہتا ''بھلا مہماں' ن سے بھی کوئی پیسے لیتا ہے''

''اب ہم مہمان کہاں' اب ہم بھی ٹھہرے آپ جیسے دکاندار'' مجھے جواب میں کہنا پڑتا۔ وہ مسکرا کر دبے لفظوں میں شکریہ ادا کرتے ہوئے پیسے لے لیتا اور میں مسکراتا ہوا اپنی دکان کی طرف بڑھ جاتا۔

میں جب بھی اس کے پاس سے گزرتا' سلام دعا ہوجاتی اور گو وہ مصروف ہوتا تو متبسم نگاہوں سے دیکھا کرتا۔

گرما میں رحیم یار خاں کے موسم میں بہت تغیر ہوتا' پورا دن شدید گرمی کی لپیٹ میں رہتا' لُو چلتی تو ہر شے کو جھلسا دیتی۔ بسا اوقات مٹی اور ریت کی آویزش سے تیز گرد آلود ہوائیں اٹھتیں تو سانس لینا دشوار ہوتا۔

شام کو موسم میں یکسر تبدیلی رونما ہوتی' خنک ہوائیں چلتیں تو فضا خوش گوار ہوجاتی۔ آدھی رات

کو ٹھنڈک کے احساس سے چادر اوڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

مضافات میں پھیلے ریگستانی علاقے' موسم میں خوش گوار تبدیلی کا باعث بنتے۔ گرمیوں کے دنوں میں رات کو چھت پر سوتا۔

سعید مٹھائی فروش میری رہائش کے عقب میں ملحق بالائی منزل پر ہی رہتا تھا' چھت پر ہمارے درمیاں بس پانچ فٹ کی دیوار حد فاصل تھی۔ رات گئے جب میں سو رہا ہوتا' وہ مجھے میرے نام سے پکارتا۔ میں چونک کر اٹھ جاتا' پاؤں کے بل کھڑا ہو کر اس کی بات سنتا' اس سے مخاطب ہوتا لیکن ہمارے درمیاں چند جملوں کے تبادلے کے بعد خاموشی چھا جاتی اور پھر میں سب بخیر کہے بغیر بستر پر دراز ہو جاتا۔

سعید سے میری گفتگو چند رسمی باتوں سے آگے نہ بڑھ سکی وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ نہ کہہ پاتا۔

پُرامن دور تھا' بھلے دن تھے' محنت کو شعار بنایا' محنت رنگ لانے لگی۔ وقت ساتھ دے رہا تھا' زندگی تابناک مستقبل کو آنکھوں میں سجائے پروان چڑھ رہی تھی۔ وقت کا دھارا بہتے دیر نہ لگی' دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔

ایک روز لاہور سے بڑے بھائی صاحب کا خط ملا' انہوں نے مجھے لاہور بلایا تھا' انہوں نے موٹر سائیکل درآمد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس لیے

انہیں میری ضرورت تھی۔ دو سالوں میں دوستی کے شجر، تن آور ہو چکے تھے۔ ان پر پھل لانے کے پھول کھلنے کو تھے، ایسے میں رحیم یار خاں سے واپسی ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن بڑے بھائی کی بات کو کیسے ٹالتا، سب چھوڑ چھاڑ کر لاہور پہنچ گیا۔

لاہور آنے کے بعد بڑے بھائی کے پاس پانچ برس کام کیا پھر باہم مشورے کے بعد میں نے نئی موٹر سائیکلوں کے کاروبار کا آغاز کیا۔

اب میں ایک بڑی برانڈ کی جاپانی موٹر سائیکل کا بااختیار ڈیلر تھا۔ اکتوبر 70ء کی بات ہے سرما کا آغاز ہو چکا تھا، میں میکلوڈ روڈ پر واقع اپنے شوروم میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور پھر مجھے کسی نے السلام علیکم کہا، میں نے ایک نظر دیکھا سامنے سعید مٹھائی فروش کھڑا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے تپاک سے ملا۔ میں خوشی اور حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے سات برس بعد ملا تھا۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور بیٹھنے کو کہا، وہ میرے سامنے رکھی گئی ایک نشست پر بیٹھ گیا۔

”لاہور کیسے آنا ہوا؟“ میں نے اس کے لیے چائے کا اہتمام کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں ایک نجی کام سے لاہور آیا ہوں۔“ اس نے جواب دینے کے بعد اپنی بات کو جاری رکھا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں دکان سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا پھر بھی کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن سے غفلت نہیں برتی جاتی۔ کل میری واپسی تھی سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“

”اچھا کیا جو ملنے چلے آئے ویسے بھی اب میرا رحیم یار خان آنا مشکل ہو رہا ہے۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

پھر پرانے دوستوں کا احوال دریافت کیا، کچھ دیر پرانے دوستوں کے حوالے سے بات چلتی رہی پھر وہ پہلو بدل کر بولا۔

”لاہور میں میرا ایک دیرینہ دوست ہے، جو مجھ سے خفا ہے۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ میں کیوں نہ آپ سے بات کروں کہ ہمارے درمیان جو خفگی ایک عرصہ سے چل رہی ہے، کسی طور ختم ہو جائے اس سلسلے میں معاونت فرمائیں اور میرے ساتھ چلیں۔“

میں نے حیرت واستعجاب سے اس کی بات سنی سوچنے لگا کہ میں نے آج تک تمہارے اس دوست کو دیکھا نہ سنا، میں تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں بھلا میں اس خفگی کو جو تمہارے درمیان میں ہے کیسے دور کر سکتا ہوں۔ میں نے برملا اپنے خیالات کا اظہار اس سے کیا لیکن وہ بضد تھا کہ آپ میرے ساتھ چلیں مجھے یقین ہے، آپ کے ملنے سے وہ راضی ہو جائے گا، آپ اس کو قائل کر لیں گے۔

اس کا اصرار بڑھ رہا تھا اور میں اس قضیے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کچھ ہی دیر بعد میرے ساتھ پیش آنے والا تھا۔ میری چھٹی حس احساس دلا رہی تھی کہ ان دوستوں کے درمیان ناراضی دور کرانے کا مرحلہ شفاف نہیں اس کے پس پردہ حقائق کچھ اور ہیں۔ ان خدشات کے باوجود میں سعید کو انکار نہیں کر سکتا تھا، وہ رحیم یار خاں سے میرے پاس آیا تھا پھر ایک عرصہ سے اس کے ساتھ شناسائی تھی، ایک اچھا پڑوسی ہونے کے ناتے مجھے اس سے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔

میں نے جاننے کی کوشش کی کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو اُن دوستوں کے مابین ناراضگی کا باعث بنی۔ میرے استفسار پر سعید نے صرف اتنا

کہا کہ وہ میرا دوست ہی بتائے گا۔
سعید کے ساتھ جاؤں یا نہ جاؤں تذبذب میں تھا کہ سعید نے ایک ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ کیا' ٹیکسی رکنے تک میں اس کے ساتھ جانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔
شام ہونے کو چلی تھی' میں نے اپنے خادم خالد سے کہا کہ مغرب کے بعد شٹر بند کر کے چابیاں بڑے بھائی کے حوالے کر دیں۔
''میں ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں' ممکن ہے مجھے دیر ہو جائے۔'' یہ کہہ کر میں سعید کے ساتھ ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ سعید نے ڈرائیور کو مال روڈ پر چلنے کو کہا۔
''مال پر کہاں جائیں گے صاحب؟'' ڈرائیور نے گاڑی کو اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔
''گارڈینیا۔'' سعید نے جواب دیا۔
''وہی جو ریگل چوک سے تھوڑا آگے نکل کر ہے۔'' ڈرائیور نے ہمیں اپنی معلومات بہم پہنچائیں۔
''ہاں ہاں وہی۔'' سعید بولا۔ ہم مال سے گزرتے تھوڑی دیر بعد گارڈینیا ریسٹورنٹ جا پہنچے۔ ٹیکسی سے اتر کر سعید نے بل ادا کیا اور پھر ہم ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر استقبالیہ سے گزرتے ہال میں جا پہنچے۔ ہال میں گہما گہمی تھی' شاید ہی کوئی نشست خالی ہو' ہال میں دھیمی روشنی آنکھوں کو بھلی معلوم دے رہی تھی۔ دائیں جانب دیوار کے ساتھ صوفوں پر بیٹھے چار افراد چائے پی رہے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے جب ہم ان کے قریب پہنچے تو سعید نے دور سے اپنے دوست کی نشاندہی کی جس سے میری ملاقات متوقع تھی۔
ایک دراز قد ساٹھ سالہ شخص پینٹ شرٹ پہنے

آنکھوں پر شفاف چشمہ لگائے صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں سلگتا سگریٹ دبائے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دھوئیں کے مرغولے بنا کر ہوا میں اڑاتا پھر نظریں جمائے ان کی طرف دیکھتا جب تک وہ بل کھا کر ہوا میں تحلیل نہ ہو جائے۔

ہم ان کے قریب گئے تو انہوں نے سعید کو اپنی جانب آتے دیکھ کر بیٹھنے کو جگہ بنائی' ہم ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سعید نے ان لوگوں سے مجھے متعارف کرایا پھر روٹھے ہوئے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ ہیں افگن...... شیر افگن! میرے ناراض دوست۔'' تھوڑی دیر بعد ہمارے لیے چائے آ گئی' میں نے بمشکل دو گھونٹ ہی لیے ہوں گے کہ سعید نے مجھے اشارے سے کہا کہ میرے دوست سے بات کریں' سعید کے کہنے پر میں چائے لینے کے بعد شیر افگن کو ایک طرف لے گیا تاکہ مدعا بیان کروں کہ میں کس کار خیر کے لیے یہاں آیا ہوں۔

سعید نے مجھے بتایا کہ آپ ان سے خفا ہیں' مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے درمیان خفگی کی کیا وجہ ہے؟'' میں نے شیر افگن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''برادر! بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس تاش کے پتے لگانے کا ایک ایسا فن ہے' جس میں جیت ہے مات نہیں۔ سعید کا اصرار ہے کہ میں یہ فن اس کو سکھلا دوں' لیکن میں ایک سادہ لوح دوست کو اس فن کے رموز و نکات سمجھانے کو تیار نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تاش کے پتوں کے اس کھیل میں کہیں اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ مات کھا جائے' فقط یہی بات ہماری ناراضگی کا باعث ہے۔'' افگن نے صفائی پیش کرتے ہوئے بات ختم کی۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ ایسا کریں کہ یہ فن آپ ہم سے سیکھ لیں پھر بھلے آپ اس فن کو اپنے پاس محفوظ رکھیں یا سعید کو منتقل کر دیں۔'' افگن نے رازدارانہ لہجے میں مجھے اپنے قیمتی مشورے سے نوازا۔

افگن کی شاطرانہ چال کو میں سمجھ گیا تھا' میں نے بات کی تہہ کو پالیا تھا' اب میں اس جال سے جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے افگن سے دو منٹ کی مہلت چاہی تاکہ فون کر کے گھر بتا سکوں کہ میں دیر سے آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں استقبالیہ کی طرف بڑھا۔ استقبالیہ میں داخل ہوا تو ڈیوٹی پر مامور ایک نوجوان کو کاؤنٹر کے ساتھ کھڑا فون پر بات کر رہا تھا میں اس کے پاس جا کر انتظار کرنے لگا کہ اس کی بات ختم ہو تو میں فون کر سکوں' بات ختم ہونے پر میں نے اس سے ایک کال کرنے کی اجازت چاہی' اس نے فون میری طرف سرکا دیا۔

میں نے کریڈل اٹھایا' جیسے بات کرنے لگا ہوں پھر گردن گھما کر ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک صوفے پر براجمان تھے' اب افگن بھی ان میں موجود تھا۔ میں نے کریڈل فون پر رکھا اور نظر بچا کر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکا' دروازے کے باہر ایک رکشے کو موجود پایا۔

میں نے رکشے میں بیٹھتے ہی رکشے والے کو فلیمنگ روڈ پر چلنے کو کہا' جہاں پر میرا گھر تھا۔

''میں تاش کے پتوں کے فن سے تہی دامن لوٹ آیا تھا۔''

❁......❁......❁

گزشتہ برس 6 جون کو میرا رحیم یار خاں جانا

ہوا' خیال گزرا کہ ایک عرصہ ہوا سعید مجھے نہیں ملا۔ سعید سے میری ملاقات آج سے چوالیس برس پہلے گارڈینیا ریسٹورنٹ لاہور میں ہوئی تھی۔

رحیم یار خاں قیام کے دنوں ایک روز سوچا کہ آج سعید کے پاس جا کر حلوہ پوری کا ناشتا کریں۔ لسی کا گلاس پئیں اور پھر پوچھیں کہ تاش کے پتوں کے رنگ نکھرے یا بے رنگ ہو گئے۔ اس خیال سے میں اس کی دکان پر گیا لیکن دکان کو اپنی جگہ نہ پا کر فکرمند ہوا اس جگہ ایک جنرل اسٹور بن گیا تھا۔

میں نے اسٹور کے اطراف میں دکان تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ سوچا واپس چلتا ہوں' واپسی کے لیے مڑا تو سامنے شاہی روڈ کے دوسری جانب ایک مٹھائی فروش کا بورڈ نظر آیا' میں شاہی روڈ عبور کرتے ہوئے اس دکان پر پہنچ گیا۔ باہر کڑاہی میں تازہ پوریاں تلی جا رہی تھیں اور لسی کے برتن سے لسی بنانے کی وہی مخصوص آواز ایک ردھم سے آ رہی تھی۔

میں اندر داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناشتا طلب کیا' ناشتا لگنے کے بعد میں اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہی خشک اور خستہ پوریاں' وہی لذیز لسی کا گلاس میں نے متجس نگاہوں سے کاؤنٹر کی طرف دیکھا لیکن وہاں ایک غیر مانوس چہرے کو پایا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں بل کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ کاؤنٹر پر موجود شخص میری طرف متوجہ ہوا' میں نے کہا۔

''میری ایک مشکل آسان فرما دیجیے۔''

''جی فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''سامنے نکڑ پر ایک مٹھائی کی دکان ہوا کرتی تھی۔'' میں نے سامنے اسٹور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وہی دکان ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہاں پر سعید ہوا کرتا تھا۔'' میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی تھی' کچھ دیر حسرت سے بولا۔

''سعید نے خودکشی کر لی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

میں نے سنبھل نہ پایا' گہرا لگاؤ لگا تھا۔ بجھے دل سے' بوجھل قدموں کے ساتھ' مٹھائی کی دکان سے نیچے اتر گیا۔

تاش کے پتوں کے بھی رنگ ماند پڑ چکے تھے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ پارسی اپنے مردوں کو نہ دفناتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ ایک خاص عمارت میں گدھوں کے کھانے کے لیے چھوڑ آتے ہیں اس خاص عمارت کو ''دخنہ'' کہتے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی سور کا گوشت نہیں کھاتے۔

☆ جھینگا مچھلی کے خون کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔

☆ بلی کو بدہضمی ہو تو وہ گھاس بھی کھاتی ہے۔

☆ فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کے دانت پیدائش کے وقت موجود تھے۔

فرید خان...... ڈی آئی خان

نکما

نیرہ احتشام

ایک انگریزی کہاوت ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں لیکن ٹوٹتے زمین پر ہیں اور پھر بار بار بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ رشتوں کی انہی ٹوٹ پھوٹ کی ایک دلچسپ کہانی۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن بیشتر بھارتی شادیاں تو آج بھی اسی دھرتی پر نائی اور پنڈتوں کے توسط سے طے ہوتی ہیں یہاں تک کہ اچھی بھلی پڑھی لکھی اور ستاروں کا ملاپ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملاپ کسی دھوتی، چوٹی دھاری پنڈت جی کے ذریعہ ہی مکمل ہوتا ہے بھلے ہی پنڈت جی کمپیوٹر سے جنم کنڈلی ملانے کا دعویٰ کریں۔ سب کچھ ان کی عقل اور مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ بھلے ہی پنڈت جی مڈل فیل ہوں لیکن انجینئر اور ڈاکٹر لڑکے، لڑکیوں کا مستقبل بھی وہی طے کرتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے پنڈت جی نہیں چاہتے کہ فلاں رشتہ نتیجہ خیز ہو تو کہہ دیں گے۔ ''شانی مہاراج کی نظر کچھ ٹیڑھی پڑ رہی ہے۔ لڑکی بھی منگلی جان پڑتی ہے اگر یہ رشتہ ہوگیا تو ساس سسر کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔''

بس، اتنا ہی کافی ہے رشتہ بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے اس بیچ اگر لڑکی والوں کی طرف سے کوئی سجن تھوڑی مٹھائی اور دو ایک کرارے نوٹ لے کر پنڈت جی کو پرنام کرے تو بات بدل بھی سکتی ہے۔ پنڈت جی چاہیں تو ستارے کی ترچھی گردنیں پکڑ کر مروڑ سکتے ہیں چٹکی بجاتے ہی منگل سیارے کو غلط جگہ سے اٹھا کر صحیح مقام پر بٹھا سکتے ہیں۔

ہمارے محلے کے ایک نالائق لڑکے کے ماں، باپ بے حد پریشان تھے۔ جوں جوں ان کا لڑکا جوان ہو رہا تھا۔ اس کے نکمے پن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ایسے میں نیک پڑوسیوں نے مفت مشورہ دیا۔

''اس کی شادی کر دو، خود ہی راستے پر آجائے گا۔''

انہیں لڑکی ڈھونڈنے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ ہمارے ہاں چاروں طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں جن کے ماں باپ انہیں کسی کھونٹے سے باندھنے کے لیے پریشان ہیں۔ انہیں یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ لڑکا درحقیقت کیسا ہے کیا کام کرتا ہے اور اس میں کون کون سی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ بھلے اس جلد بازی کے لیے انہیں باقی عمر پچھتانا پڑے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ شادی کے قابل ہر لڑکی سندر، سگھڑ اور امور خانہ داری میں ماہر ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک لڑکی کے ماں باپ اس نالائق لڑکے کے ماں باپ کے پاس رشتہ لے کر آئے، لڑکے، لڑکی کی جنم کنڈلیوں کا ملاپ کیا گیا پنڈت جی بولے۔ ''جوڑی بہت شاندار ہے لڑکے اور لڑکی کے چھتیس میں سے بتیس گن آپس میں میل کھاتے ہیں۔ شادی جتنی جلدی ہوجائے اتنی ہی بہتر ہے اگلے مہینے ایک بہت ہی شبھ لگن ہے۔ اگر اس سے چوک گئے تو سال بھر انتظار کرنا پڑے گا۔''

لہٰذا چٹ منگنی، پٹ بیاہ ہوگیا دولہا اور دلہن کے بتیس گن پنڈت جی کے قول کے مطابق میل کھاتے تھے اگلے دن سے ہی ان گنوں یا خوبیوں کے میل

نے گل کھلانے شروع کر دیے۔ دولہے راجا تو بچپن سے نکمے اور نالائق تھے ہی ان کی دلہن رانی ان سے بھی سیانی نکلی۔ آیئے آپ کو ان کی بیاہتا زندگی کی کچھ جھلکیاں دکھانے ان کے گھر لیے چلتے ہیں۔

لڑکے کا نام سورج اور لڑکی کا نام ہے چندا۔ دونوں سو رہے ہیں۔ صبح کے دس بج چکے ہیں اور محلے کے لوگ اپنے اپنے کام دھندوں پر جا چکے ہیں۔ سورج اور چندا بے فکر ہو کر سو رہے ہیں۔ شادی سے پہلے سورج دس گیارہ بجے تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر ابلی چائے پی کر پھر سے چادر تان کر دوپہر تک کے لیے سو جاتا تھا۔ اب شادی کے بعد اس نے چائے پینی بھی چھوڑ دی۔ سورج اور چندا دوپہر بعد جاگتے ہیں ان کے کمرے میں تیز دھوپ پھیل چکی ہوتی ہے۔ سورج کی ماں ان دونوں کو کھانا گرم کر کے دیتی ہے کھانا کھانے کے بعد دونوں پھر آرام کرنے کے لئے لیٹ جاتے ہیں۔ سورج کی بوڑھی ماں نے بڑی امیدوں سے اس کا بیاہ رچایا تھا سوچا تھا کہ بہو آئے گی تو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے گی۔ لیکن ہونا کچھ اور ہی تھا۔

ایک صبح ماں نے چندا کو جگا کر پانی بھرنے کو کہا۔ بے چاری کومل چندا کے نازک جسم کو پانی کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی وہ چھینکنے لگی۔ سورج ترنت دوڑ کر ڈاکٹر صاحب کو گھر بلا لایا۔ اس نے ماں سے کہا کہ چندا کو آرام کی ضرورت ہے اس سے کوئی کام مت کرانا۔ چندا کی ماں نے سورج کی ماں کو چٹھی لکھی۔

''ہم نے سوچا تھا کہ چندا کی ساس ابھی زندہ ہے چندا آرام سے رہے گی داماد کی چٹھی پا کر لگتا ہے کہ آپ اس سے کام کراتی ہیں اسے پرائی بیٹی سمجھتی ہیں۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ہماری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔''

سورج کی ماں سیدھی سادی ہے اس نے سوچا جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہے تو دوسروں کو کیا دوش دینا جب سے بہو کو چھینکیں آئی تھیں اس نے بستر سے اٹھنا ہی بند کر دیا تھا بہو کے کپڑے تک سورج خود دھوتا اور باہر رسی پر خشک کرنے ڈالتا۔ بیچ بیچ میں جا کر انہیں الٹتا پلٹتا اور دیکھتا کہ کپڑے سوکھ گئے ہیں یا نہیں۔ محلے کی عورتیں اپنی کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ کر اپنے منہ میں پلو ڈال کر ہنستیں اپنی گھر والی کی اتنی فکر کرنے والے سورج کو اپنے بوڑھے ماں باپ اور دنیا داری کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس سے کہہ کہہ کر تھک گئے تھے لیکن وہ کوئی کام دھندا کرنے کو تیار نہیں تھا۔

ایک دن اس کے بوڑھے باپ نے ناراض ہو کر

اسے خوب برا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا۔ سورج یہ سن کر خودکشی کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس کے باپ اس کی جھوٹی دھمکیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ سورج یہ کہہ کر گھر سے نکل گیا کہ وہ ریل گاڑی کے نیچے کٹ کر اپنی جان دے دے گا۔

گھر میں رونا، پیٹنا شروع ہو گیا۔ چندا چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ سورج کی ماں بھی دھاڑیں مار کر بلکنے لگی۔ سورج کے باپ چیخ کر بولے۔ ''ایسی اولاد مر ہی جائے تو اچھا ہے۔''

چندا کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔ اس نے بھی خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ کہنے لگی کہ وہ تالاب میں ڈوب کر جان دے دے گی۔ روتی سسکتی وہ تالاب کی طرف چل پڑی۔ سورج کے بوڑھے ماں، باپ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے پڑوسیوں کو آواز دی کچھ پڑوسی ریل کی پٹریوں کی طرف سورج کو ڈھونڈنے نکل پڑے اور باقی مختلف سمتوں میں چندا کو لانے تالاب کی طرف دوڑے جیسے تیسے دونوں کو منا کر گھر لایا گیا۔

اس کے بعد دونوں کا حوصلہ بڑھ گیا ذرا ذرا سی بات پر سورج اپنے ماں باپ کو آنکھیں دکھانے لگا۔ جتنا نکما وہ شادی سے پہلے تھا اب اس سے بھی زیادہ نکما ہو گیا کچھ ہی مہینوں میں سورج اور چندا کے درمیان جو کشش تھی گھٹنے لگی۔ اکثر ان میں تو، تو میں، میں اور ہاتھا پائی ہونے لگی۔ ان کا گھر میدان جنگ بن گیا۔ جس میں رات دن گھریلو مہابھارت کی لڑائی چلتی رہتی۔ اب سورج کے ماں باپ کے بوڑھے کاندھوں پر مسٹنڈے سورج کے ساتھ ساتھ ایک نکمی اور جھگڑالو بہو چندا کو کھلانے کا بوجھ بھی آ پڑا تھا۔ وہ دن رات اس منحوس گھڑی کو کوستے رہتے جب انہوں نے پڑوسیوں کا مشورہ مان کر سورج اور چندا کے بیاہ کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ یہ مان کر چل رہے تھے کہ بہو کے قدم دہلیز پر پڑتے ہی ان کا نالائق بیٹا اپنی ذمہ داریاں سمجھنے لگے گا۔ پنڈت جی نے بھی ان دونوں کی جنم کنڈلیوں کا ملاپ کر کے کہا تھا کہ وہ جوڑی بہت ہی شاندار ہے لیکن یہاں تو سب کچھ الٹا ہی ہو رہا تھا۔

ایک صبح بخشش اور عطیہ کے چکر میں پنڈت جی ان کے گھر تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی سورج کی ماں ان پر برس پڑی۔

''کیسی بخشش اور کیسا عطیہ؟ ایک تو بے جوڑ بیاہ کرا دیا اوپر سے عطیہ مانگنے آ گئے ہم تو برباد ہو گئے ہمارا بیٹا تو پہلے ہی سے نکما اور نالائق تھا بہو بھی ہمیں ویسی ہی ملی۔ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔ آپ نے ان کی جنم پتریوں کا ملا کر کے کہا تھا کہ جوڑی بہت شاندار ہے۔''

پنڈت جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ لڑکے اور لڑکی کے چھتیس میں سے بتیس گن ملتے ہیں جب آپ کو اپنے بیٹے کی خوبیاں اور خامیاں معلوم تھیں تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے تھا کہ آپ کی ہونے والی بہو کی خوبیاں اور خامیاں بھی لگ بھگ ویسی ہی ہوں گی۔ غلطی میری نہیں، آپ کی ہی ہے۔ آپ ہی کو اپنے بیٹے کی شادی کی جلدی پڑی تھی۔''

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

سزا جزا	فاطمہ زہرہ
زرد پتا	فلک شیر ملک
بااصول	صداقت حسین
مکافات عمل	جاوید صدیقی
یادیں	زعیم جتوئی

سزا جزا

فاطمہ زہرا

"ذراسی تُوتُو...... میں میں...... ہوئی پھر بات بڑھ گئی' بات صرف ٹریکٹر کو کھڑا کرنے کی تھی مگر......"

"تمہارا ڈرائیور کیوں خیال نہیں کرتا' کیوں میرے ڈیرہ کے سامنے کھڑا کیا؟"

"ڈیرہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی ہے۔" جواب ملا۔

"اس وقت یہاں میرے مہمان بیٹھے ہیں اور......"

"اور...... اور کیا...... کیا تمہارے مہمان آسمان سے اترے ہیں؟"

یوں بے بات کی بات بنی پھر ہاتھا پائی ہوئی جو ایک دھماکا پر منتج ہوئی۔ دھماکا تھا ملک ریاض کی پستول سے چلنے والی گولی کا دردناک چیخ بلند ہوئی' ملک اسد کے منہ سے پھر وہ چیخ کراہ میں بدلی پھر سسکی میں تبدیل ہوئی ار پھر...... اسد کی سانس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گولی سینہ پر لگی' ڈاکٹر کو بلانے کی مہلت بھی نہ ملی' موت زندگی پر غالب آ گئی۔ ستائیس سالہ اسد ذراسی دیر میں ابدی نیند سو گیا۔ ملک ریاض بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں زمین پر گر سا گیا' پستول ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

دونوں ہم عمر اور چچازاد تھے' ریاض چچا کا بیٹا مقتول اسد تایا کا بڑا بیٹا۔ جائیداد تقریباً برابر تھی' ایک چہار دیواری میں بنے بڑے سے گھر کے دو حصے تھے۔ انہی دو حصوں میں دونوں کے گھر آباد تھے۔ ریاض ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کا بھائی تھا' بہنیں دونوں اس سے چھوٹی تھیں اور اسد دو بھائی اور ایک بہن۔ دونوں گھرانوں میں مثالی محبت تھی' اتفاق اتنا کہ دونوں گھر بظاہر الگ الگ مگر اندر سے دل ایک دوسرے کی محبت سے معمور۔

دونوں گھروں کے بڑے بیٹے اسد اور ریاض اسکول کی عمر کو پہنچے تو ایک ہی اسکول میں داخل کیے گئے۔ دونوں کے ایک جیسے شوق ایک جیسے مشغلے' دوستی بہت زیادہ۔ اسکول پاس کیا' کالج پہنچے اور گریجویشن سے فارغ ہوئے تو دونوں کے ماں باپ نے اپنی اپنی زمینوں کی ذمہ داری ان پر ڈال کر خود سکون کی سانس لی۔ فراغت کی زندگی گزارنے کی امید پر دونوں بھائی بڑے خوش تھے۔ عدالتی چکر' زمین داری کے بکھیڑے' پانی کے جھگڑے' نوکروں کی چپقلش' سیر و شکار کے پروگرام غرض کہ کوئی موقع ایسا نہیں تھا جب وہ دونوں اکٹھے نہ ہوتے۔

مگر یہ کیسی قیامت ٹوٹی یا نظر لگ گئی کسی بدنظر کی جو کبھی سوچا نہ تھا وہ ہو چکا تھا۔ شیطان اپنا کاری وار کر گیا تھا' مقتول کی لاش پر روتا قاتل اپنے تایا کا مجرم بن گیا۔

ایک کہرام بپا ہو گیا' ماں باپ تو تڑپ ہی رہے تھے۔ چچا کا اور بُرا حال تھا' بیٹے جیسا پیارا بھتیجا خون میں لت پت پڑا تھا اور اکلوتے بیٹے کے سر پر پھانسی کا پھندا لٹکتا نظر آ رہا تھا اور ان کا دل دہلا جا رہا تھا۔

کمرہ میں بیٹھے دوستوں نے بتایا کہ ریاض ہمیں اپنی نئی پستول دکھا رہا تھا کہ اسد آ گیا' گولی نادانستگی میں چلی ہے ارادتاً نہیں۔ تایا نے ریاض کو نظروں سے دور ہونے کا حکم دیا مگر معاملہ پولیس تک نہیں پہنچنے دیا۔

جنازہ اٹھا چچا ساتھ تھے مگر بالکل پیچھے مجرموں کی طرح سر جھکائے' ایک دن گزرا دوسرا دن گزرا اور سوئم بھی ہو گیا۔ دونوں گھروں میں سناٹا چھایا رہا' کوئی تعزیت کے لیے آتا تو کچھ دیر کو کچھ ہلچل ہوتی اور پھر وہی خاموشی۔

ملک ریاض ایک کمرہ میں بند ہو کر رہ گیا تھا' لوگوں کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہ پاتا۔ بس نہیں چلتا کہ اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتا' کھانا پینا چھوٹ گیا۔ رو رو کر آنسو بھی خشک ہو گئے مگر دل کا درد ایسا کہ چین نہ لینے دیتا۔

''کیسے کفارہ ادا ہو گا میرے اس جرم کا؟'' یہ سوال ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا۔ کوئی جسمانی سزا مل جاتی تو شاید احساس جرم میں کچھ کمی ہو جاتی مگر جسمانی سزا یا پھانسی' گھر کی ہیبت سے تو خود تایا نے بچا لیا۔ وہ بار بار یہی سوچتا کہ اس ذہنی اذیت سے تو پھانسی اچھی تھی۔ بچپن کا دوست بچپن کا ساتھی' پیارا بھائی' اس کے ساتھ گزرے ہر لمحہ کا' ساتھ الف ب سے کالج کے دور کی وہ کون سی بات تھی جو یاد نہیں آتی تھی۔ کرکٹ کا میچ' ائرگن سے چڑیوں کا شکار' چھپ چھپ کر نہر پر جانا' اس کا ذہن سالوں پیچھے بھٹک رہا تھا۔

نو سالہ نازیہ' اس کی گڑیا دونوں لازم و ملزوم تھے۔ وہ تو گڑیا کے بغیر سوتی نہیں تھی اور اس روز اسی گڑیا کی شادی تھی اور گڈا سعدیہ کا تھا۔ شادی کے انتظام کی ذمہ داری سمیرا کے کاندھوں پر تھی' سمیرا نازیہ سے دو سال بڑی تھی اور اس وقت بڑا سا دوپٹہ اوڑھے بڑی بزرگ بنی بیٹھی تھی۔ شرکت کے لیے آئی ہوئی تینوں کی سہیلیاں ڈھول پیٹنے اور گانے میں مصروف تھیں۔ کھانے کا بہت سا سامان سامنے رکھا تھا' تائی اور چچی دونوں نے ہی بہت سی چیزیں کھانے کے بھیج دی تھیں۔ اچانک شور مچاتے ریاض' اسد اور سعد جو تینوں لڑکیوں سے بڑے تھے آ دھمکے۔

''تم نے ہمیں شادی میں نہیں بلایا' نا؟'' اسد نے آتے ہی شکوہ کیا۔

''مگر ہم خود آ گئے۔'' ریاض نے جملہ پورا کر دیا' انداز بڑا فاتحانہ تھا۔

''مردوں کو بھی شادی میں بلاتے ہیں' کیا تمہیں معلوم نہیں تھا؟'' سعد نے بہنوں کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ ابھی جواب کسی نے بھی نہیں دیا تھا کہ لڑکوں کی نظریں بھی ہوئی پلیٹوں پر جم گئیں' بسکٹ' بادام' کشمش' جلیبیاں' ریوڑیاں۔

''ارے اتنی چیزیں۔'' ریاض کی نظریں تو جلیبیوں پر جم کر رہ گئیں۔

''کب کھائیں گے؟'' اسد ندیدے پن سے بولا۔

''جب بھی کھائیں تمہیں کیا۔'' سمیرا تنک کر بولی اور اپنا دوپٹہ پلیٹوں پر پھیلا دیا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ملے گا' سب ہماری سہیلیوں کے لیے ہے۔'' اس کا منہ لٹک گیا مگر سعد کو اچانک ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے فکر مند ہو کر سمیرا سے پوچھا۔

''کیا گڑیا کا نکاح ہو گیا؟''

''نکاح......وہ کیسے ہوتا ہے؟'' لڑکیاں پریشان ہو گئیں۔

''تمہیں تو کچھ بھی معلوم نہیں' نکاح آدمی پڑھاتے ہیں۔ تمہاری گڑیا کا نکاح ہم پڑھائیں گے۔'' ریاض نے بڑی فیاضانہ پیشکش کی مگر سمیرا نے صاف انکار کر دیا۔

''ہم خود ہی نکاح کر لیں گے۔''

''مگر نکاح تو قاضی کرتا ہے ورنہ شادی نہیں ہوتی۔'' ریاض نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''پھر کیا کریں؟'' نازیہ اور سعدیہ فکر مند ہو گئیں' مہمان بچیوں نے بھی تائید کی کہ نکاح تو قاضی ہی

پڑھاتا ہے۔

"ہم نے خود دیکھا تھا آپی کی شادی میں شیروانی پہنے قاضی صاحب آئے تھے۔" صائمہ نے گواہی دی۔

"اچھا! اب......؟"

"ارے پریشان نہ ہو تمہارے بھائی سب کام کر سکتے ہیں اور اسد تو نکاح پڑھا سکتا ہے اس نے اسکول میں سیکھا ہے۔" تینوں لڑکوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

اور نکاح کی تیاری شروع ہوگئی اسد نے چچا کی شیروانی پہنی ٹوپی سر پر رکھی بڑے بڑے جوتے بھی چچا کے ہی پہنے چھڑی ہاتھ میں دبائے قاضی تیار ہوگیا۔ ریاض جلدی سے قلم اور ایک کاپی لے آیا۔

"سب لڑکیاں کمرے سے باہر جائیں نکاح ہونے والا ہے؟" سعد نے اعلان کیا۔

"بھائی ہماری چیزیں تو نہیں کھاؤ گے نا؟" سمیرا کا فکر مندی سے بُرا حال تھا۔

"ارے کیا تم نے ہمیں بدنیت سمجھا ہے۔" بے چاری سمیرا شرمندہ ہوگئی۔ لڑکیاں کمرے سے باہر نکل گئیں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا گیا کچھ دیر تو اندر سے آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

"بھائی کیا نکاح ہوگیا؟ بھائی بولیں نا نکاح کب ختم ہوگا؟"

"بھائی...... بھائی......" تینوں نے کتنی ہی آواز دے ڈالیں مگر اندر سے جواب ندارد اور دروازہ بند۔ بچیوں کی آوازیں سن کر چچی تائی اپنی باتیں چھوڑ کر آگئیں۔

"کیا ہوگیا؟"

"تینوں بھائی نکاح کر رہے تھے مگر اب نہیں بول رہے۔"

"دروازہ بھی نہیں کھولتے۔"

"ہماری چیزیں......" سمیرا چیزوں کے لیے فکر مند تھی۔

چچی نے فوراً نوکر کو باہر بھیجا کہ باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ دیکھ کر آئے وہ باہر گیا دروازہ کھلا پایا تو کمرہ میں جا کر اندر کا دروازہ کھولا پھر سب ہی حیران رہ گئے۔ کھانے کا تمام سامان غائب گڑیا گڈا دو دو حصوں میں بٹے پلیٹوں میں رکھے تھے اور قاضی کی شیروانی ٹوپی چھڑی سب ایک طرف پڑی تھیں۔ سوچتے سوچتے ریاض بے اختیار مسکرا دیا۔

ذہن بچپن کی پگڈنڈیوں پر دوڑ رہا تھا بے اختیار "یار اسد" اس کے منہ سے نکلا پھر جیسے دوڑتے دوڑتے ٹھوکر لگ گئی وہ سسکنے لگا۔

"کیا ہوگیا...... یہ کیا ہوگیا میرے ہاتھ سے۔" سائیڈ پر رکھی میز پر بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ دے مارا۔ تنہائی ریاض کو گھما پھرا کر وہیں لے جاتی اب تو اس کے خیالوں کا محور صرف اسد تھا۔

"زندگی کتنی حسین تھی ہر بات میں مزہ تھا ہر لمحہ دلچسپ نئے نئے پروگرام تو صرف اسد ہی بناتا تھا بناتا ہے نہیں بناتا تھا۔ اسد ماضی بن گیا اس کے لیے تھا استعمال کرنا دل ہلا دینے کے لیے کافی تھا کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب وہ اسد کے لیے نہ رویا ہو۔

قتل والے دن سے ریاض کمرہ میں بند تھا' گھر کے کسی اور حصہ میں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ تایا تو شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ ماں باپ کا سامنا کرنے کی خود اس میں ہمت نہیں تھی' اسد کا چھوٹا بھائی سعد اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا' سعدیہ سے ریاض کا اور سمیرا سے اسد کا رشتہ تو دادی مرنے سے پہلے طے کر گئی تھیں مگر اب حالات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

دن گزر رہے تھے' تایا تائی' چچا چچی سب مہر بہ لب تھے۔ سمیرا اور نازیہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی سعدیہ کی طرف جانے کی۔ خود سعدیہ نے بھی اس دن سے چچا کے گھر قدم نہیں رکھا تھا' چند قدم پر رہنے والے دونوں خاندان گویا میلوں دور ہو گئے تھے۔

چہلم گزر گیا قریبی رشتہ داروں نے مسئلہ اٹھایا کہ اس طرح زندگی کیسے گزارو گے' کب تک ایک دوسرے سے دور رہو گے۔ کوئی حل نکالو آخر کار خاندان کے سارے بڑے اکٹھے ہوئے' حل ڈھونڈ لیا گیا۔ پچھلے رشتہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے نازیہ کا رشتہ سعد سے طے کیا گیا اور صرف طے نہیں کیا گیا بلکہ نکاح بھی کر دیا گیا مگر رخصتی یوں ہوئی گویا دلہن نہیں جا رہی بلکہ کنیز خرید کر لے جائی جا رہی ہے۔

چلبلی شرارتی نازیہ ایسے برتی گئی جیسے سگی بھتیجی نہیں ملازمہ ہو۔ تائی تو اس کا نام بھی لینا گوارا نہ کرتیں' اے...... او کہہ کر کام چلاتیں۔ انداز انتہائی حقارت آمیز ہوتا' بھائی کے کیے کی سزاوار نازیہ ٹھہری۔ وہ جو گھر میں مینا کی طرح چہکتی اور تتلی کی طرح اڑتی پھرتی' گم صم ہو کر رہ گئی۔ جو ہل کر پانی نہ پیتی تھی جسے اس ڈر سے ماں باپ باورچی خانہ میں نہ جانے دیتے کہ ہاتھ نہ جل جائے۔ شادی کے دوسرے روز سے ہر وہ کام کر رہی تھی جو اس سے پہلے ملازمائیں کرتی تھیں کیونکہ شادی کے فوراً بعد دو ملازماؤں کو گاؤں واپس بھیج دیا گیا تھا۔

صبح اذان سے پہلے اٹھنا' ساس سسر کو وضو کا پانی دینا' ناشتا بنانا اور پھر گھر کی صفائی کرنا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کے دوران ساس کے پیر دبانا بھی اہم کام تھا۔ اس کی ہم عمر سعدیہ جو اس کی دوست اور بہن کی طرح تھی اس کے لیے اجنبی بن گئی تھی۔ گاؤں سے آنے والے مزارعوں کے لیے ڈھیروں روٹیاں ڈالنا ایسا کام تھا جو دن کے کسی بھی حصہ میں کرنا پڑ جاتا' اس کے لیے سب سے تکلیف دہ کام شوہر کی گھورتی آنکھوں کا سامنا کرنا تھا اور آخر میں ان کیے گئے کاموں میں خامیاں تلاش کر کے جھڑکیاں دینا' تائی امی کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ نازیہ اب کسی کی بیٹی بہو یا بیوی نہیں صرف مشین تھی جو سارا دن مسلسل چلتی پھر بھی میاں کا رویہ ہتک آمیز تائی کا ذلت آمیز اور نند کا رویہ تضحیک آمیز۔ تایا کا رویہ نہ اچھا نہ ہی برا انہیں تو شاید وہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ زندگی اتنی مشکل بھی ہو سکتی ہے اس کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ماں باپ ملنے نہیں آ سکتے تھے کہ وہ بھائی کے جرم کا تاوان تھی' ماں باپ کے گھر وہ نہیں جا سکتی تھی کہ وہاں مقتول کا قاتل رہتا تھا۔

چار سال گزر گئے سزا میں کمی نہیں آئی' کوئی رعایت نہیں ملی' ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ کوئی رشتہ دار آتا تو ملنے کی اجازت نہیں تھی مگر یہ شکایت ہر رشتہ دار سے ہوتی کہ کوئی کام نہیں کرتی' کھاتی ہے یا سوتی ہے۔

پھر قسمت نے اس گھرانہ پر ایک وار اور کیا یا نازیہ کی سزا میں اضافہ مقدر بنا کہ رات میں سوتے سوتے کسی وقت تائی اماں پر فالج کا حملہ ہوا' جسم کا داہنا حصہ مفلوج ہو گیا۔ ہلکا سا اثر زبان پر بھی ہوا' سعدیہ تو شادی ہو کر

سسرال جا چکی تھی ماں کی بیماری کا سن کر آئی ہفتہ بھر رہی اور چلی گئی۔

جو حکمرانی کرتی تھیں وہ چلنے اور بولنے کے قابل نہ رہیں اب ہر کام کے لیے تائی نازیہ کی محتاج تھیں۔ نازیہ نے ان کی خدمت کا بیڑہ بھی اٹھالیا' ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوگیا اس کی بے زبانی بے لوث خدمت نے آخر کار پتھر میں شگاف ڈال دیا۔ مگر سعدیہ کو یہ سب نظر نہیں آتا تھا ایک روز تائی اماں نے جھڑکیاں دیتے سعد کو اشارے سے اپنے پاس بلایا پھر نازیہ کو بھی پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈری سہمی قریب پہنچی تو بے اختیار اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں پھر نازیہ کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ میں تھما کر کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے کچھ اشاروں سے "سمجھایا" کہا۔

"بخش دو اسے' معاف کردو' سزا ختم کردو۔" سعد تو حیران تھا ہی نازیہ کو تو جیسے سکتہ ہوگیا پھر جو منظر دونوں کی آنکھوں نے دیکھا وہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ تائی امی اپنے صحیح والے ہاتھ سے فالج زدہ ہاتھ کو تھامے نازیہ سے معافی مانگ رہی تھیں' ملتجی نظریں نازیہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ تایا ابا کمرہ میں داخل ہوئے تو یہ عجیب منظر دیکھ کر جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

قسمت نے پلٹا کھایا قدرت نے نازیہ کو زمین سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دیا اس کے خدمت وایثار کے عمل نے اس کا نصیب بدل دیا۔

تائی کا انتقال تین مہینہ بعد ہوگیا' آج نازیہ اس گھر کی ملکہ ہے' تین بیٹے ہوئے' ایک زمینداری کررہا ہے دو ڈاکٹر بن چکے ہیں۔ دونوں کی بیویاں بھی ڈاکٹر ہیں' بڑی بہو بھتیجی ہے' تینوں بہوئیں نازیہ کی بیٹیاں بن گئی ہیں۔

نازیہ ربّ کی شکر گزار ہے' جس نے اسے ہر لحہ ثابت قدم صابر وشاکر رکھا اور سعد' جس نے شادی کے ابتدائی دنوں میں اس کی طرف کبھی محبت کی ایک نظر نہیں ڈالی تھی آج تین بہوؤں کے ہوتے ہر لحہ نازیہ کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔

زرد پتا

فلک شیر ملک

اس ہلکی ہلکی سرسراتی ہوا میں ہر طرف ملائم خوشبو اپنا لمس ہر شے پر ثبت کررہی تھی شاید درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے صبح کی نوید سے باخبر ہوچکے تھے ان کی ملی جلی خوب صورت آوازیں فضا میں جلترنگ بکھیر رہی تھیں۔ نماز ادا کرکے طارق بنگش اپنی ماما جانی کے پاس آبیٹھا۔ ماما جانی نے اس کی ٹھنڈی پیشانی پر اپنے جلتے لب ٹیک دیئے تو ایک بہت گہری طمانیت اس کے وجود کو ڈھیروں سکون بخش گئی۔

بسا اوقات دماغ کے ساتھ ساتھ دل بھی بغاوت پرآمادہ ہونے لگتا ہے۔ خیالات باغی ہوجاتے ہیں' آج ایسا ہی کچھ طارق بنگش کے ساتھ بھی ہورہا تھا' ماضی کے دریچوں سے جھانکا تو سوگوار یادوں نے دامن تھام لیا۔ دو سال' پانچ سال اور پھر وہ پورے بیس سال پیچھے چلا گیا۔

تب وہ ایک کھلنڈرہ سا نوجوان تھا' ایف ایس سی کرنے کے بعد وہ آرمی میں بطور کیڈٹ بھرتی ہوگیا' پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں ٹریننگ کرکے وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ بن چکا تھا اور پھر ترقی کرتے کرتے دو سال بعد ہی کیپٹن

کے عہدے تک پہنچ گیا۔ کیپٹن طارق بنگش پشاور کے نزدیک ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ماں بابا کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جہانزیب بنگش جو ابھی زیر تعلیم تھا۔

پتھروں کو تراش کر بنائی گئی یہ اونچی فصیلوں والی حویلی پہلی نگاہ میں ہی بے حد مرعوب کر دیتی تھی۔ وسیع وعریض صحن، طویل برآمدے اور کشادہ کمرے جس میں طارق بنگش کا باپ ہاشم خان اور ماں بخت آور کے علاوہ بھائی رہائش پذیر تھے۔ ایک پرانا وفادار ملازم گل بابا تھا جو گھر کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا تھا۔ حویلی کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر چاچا لال شیر کا گھر تھا جس کے ساتھ بھینسوں کا باڑہ اور گھوڑوں کا اصطبل علیحدہ تھا۔

چچا لال شیر کی ایک ہی بیٹی تھی، کرن جو طارق کی ہم عمر ہی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے اکٹھے ہی کھیلتے آئے تھے مگر جب کرن نے جوانی میں قدم رکھا تو وہ پردہ کرنے لگی تھی کیونکہ یہ پٹھانوں کی ریت ہے کہ جب بچی دس بارہ سال کی ہو جائے تو پردہ کرے۔ کرن اکثر کن انکھیوں سے طارق بنگش کو دیکھ لیتی تھی مگر وہ ایک ایسا مرد تھا جس کے عجیب مشغلے تھے گھڑ سواری، نشانہ بازی، اسپورٹس سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔

پچیس سالہ کیپٹن طارق بنگش ایک خوب صورت اور دلکش پرسنالٹی کا مالک تھا۔ کشادہ سینہ، بڑی رعب دار آنکھیں، کھلتی رنگت اور چھ فٹ سے نکلتا قد پھر ہلکی مونچھوں کے نیچے گلابی ہونٹ جن پر ہر وقت مسکراہٹ عیاں رہتی اس کے حسن کی دلکشی میں اور بھی اضافہ کرتے تھے۔ اس کے ساتھی آفیسر اسے کیپٹن بنگش ہی کہہ کر پکارتے تھے وہ ایف ایف رجمنٹ ایبٹ آباد میں اپنے عسکری فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ ایک نڈر اور دلیر آفیسر تھا، اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل شیر جیسا تھا جب وہ ایک ماہ کے لیے گلیشیر گیا تھا تو اس نے دشمن کی کئی چوکیوں کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔

کیپٹن بنگش کا نام ہی سن کر ہندوستانی فوجی لرز اٹھتے تھے۔

❁ ❁ ❁

وقت کا پنچھی پنکھ لگا کر اڑتا رہا، یہ اوائل نومبر کی ایک گہری شام رات کی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ کیپٹن بنگش اس شب کچہری روڈ پر واک کرتے کرتے ایبٹ آباد شہر کے پُررونق مین بازار کی طرف نکلا جا رہا تھا۔ سردی بڑھنا شروع ہو چکی تھی اور وہ کوئی اونچی ٹوپی اور واسکٹ خریدنا چاہ رہا تھا۔

جب وہ کلاتھ مارکیٹ کی ایک شاپ کے اندر جانے لگا تو ایک بلیک سوک کار اسی دکان کے سامنے آ کر رکی۔ گاڑی میں سے ایک لڑکی نکلی جس کی عمر لگ بھگ سترہ، اٹھارہ سال رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ ایک معمر خاتون بھی تھی۔ وہ دونوں بھی کپڑوں کی شاپنگ کرنے اسی کلاتھ ہاؤس میں داخل ہو گئیں، لڑکی بلا کی حسین تھی۔ وہ اس وقت سفید شلوار، دوپٹے کے ساتھ ریڈ شرٹ میں بہت سج رہی تھی۔

یہ وہ لمحہ تھا جب پہلی دفعہ کیپٹن بنگش کے ماتھے پر اتنی سردی کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے اور دل کی دھڑکنوں کی رفتار بھی تیز ہو رہی تھی جب وہ ٹوپی اور واسکٹ دیکھ رہا تھا تو ساتھ ساتھ اس کی نظریں اس ساحرہ کو دیکھنے میں بھی مصروف تھیں۔

نکھری نکھری رنگت، روشن روشن آنکھیں، پانچ فٹ سات انچ سے نکلتا قد گویا حسن وشباب کا پیکر تھی۔ کہتے

ہیں کہ جذبے سچے ہوں تو امیدیں بر آتی ہیں۔
لڑکی نے ایک سرسری سی نظر کیپٹن بنگش پر ڈالی تھی' اور چونک سی گئی تھی۔ سرخ وسفید رنگت' دراز قد والا کیپٹن بنگش بلیک پینٹ' سفید اور چیک والی شرٹ پر سیاہ جیکٹ میں بہت ہی شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی طارق بنگش کی پرسنالٹی سے متاثر ہو چکی تھی اور بار بار کن آنکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
کیپٹن بنگش اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا مگر اک گمبھیر سناٹا ان دونوں کے درمیان رقصاں تھا پھر کیپٹن طارق نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس حسینہ کا نام پوچھ کر اس خاموشی کو توڑا۔
"شاردا۔" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے یاقوتی لبوں پر اک دلکش مسکراہٹ ابھری تھی اور وہ سرتاپا گلابی گلابی ہو گئی تھی۔
"کیپٹن طارق بنگش فرام پشاور۔" بنگش نے اپنا تعارف کروایا۔ شاردا نے ایک کارڈ تھماتے ہوئے اسے کہا تھا۔
"رات کسی بھی وقت کال کر لینا۔"
"اوکے' شکریہ۔" بنگش نے کہا۔ وہ جا چکی تھی اور کیپٹن بنگش بھی اپنی یونٹ میں لوٹ آیا' شاردا اس کا چین قرار چرا کر لے گئی تھی۔
یہ پہلا موقع تھا جب کیپٹن بنگش کو کوئی لڑکی بھا گئی تھی اور وہ ڈماڈول ہو رہا تھا۔ شاردا اسے اپنے خوابوں کی شہزادی لگی تھی حالانکہ اس نے اپنے گاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک ایسی کئی مٹیاریں تھیں جو بنگش کی ایک ہاں پر اپنی جان لٹانے کے لیے تیار تھیں جن میں اس کی چچازاد کرن سب سے پہلے تھی مگر وہ اس کول سی دوشیزہ پر مرمٹا تھا اور اس سے بات کرنے کے لیے رات گہری ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔
ادھر شاردا کی دل کی نگری میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی' اس مہیب اندھیری رات میں وہ پل بھر کے لیے بھی نہ سو سکی۔ طارق بنگش جیسا شہزادہ اس کی ویران زندگی میں بہار بن کے چھا گیا تھا۔
وہ بار بار اپنے فون کو بھی دیکھ رہی تھی' کیپٹن بنگش کی کال کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تو کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی مگر ہر ہر سطر پر کیپٹن طارق کا خوب صورت چہرہ دکھائی دے جاتا۔ پل پل ذہن کے پردے پر وہ خوبرو چہرہ جھلملاتا دکھائی دیتا۔ اداسیاں اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ہر لفظ پر طارق کی شبیہہ ابھری تو گھٹنوں پر رکھی کتاب بند کرتے ہوئے وہ ماتھا اس پر ٹیک لیتی۔ رت جگے سے اس کی گلابی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں کہ سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ شاردا نے لپک کر فون کان سے لگا لیا' دوسری طرف کیپٹن طارق بنگش تھا اور اس کی آواز میں لرزش واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔
"ہیلو مس شاردا!" شاردا کو بات کرنا مشکل ہو رہی تھی' وہ کانپ رہی تھی اور اس کا بدن ہلکورے کھا رہا تھا۔ وہ حزن وملال کی کیفیت سے دوچار ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو گھور رہی تھی۔
"شاردا پلیز بولیے نا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ شاردا کی سوچیں باغی ہو رہی تھیں پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''جی طارق بنگش صاحب!'' آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر آہستہ آہستہ تھوڑی دیر تک دونوں اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا چکے تھے اور اب کھل کر بات کر رہے تھے۔ کیپٹن طارق نے اپنے اور اپنی فیملی کے متعلق سب کچھ شاردا کے گوش گزار کر دیا تھا اور شاردا نے بھی بتایا تھا کہ اس کا گھر شملہ پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا باپ ایک بڑا سرمایہ دار ہے ''زمان جدون'' نے دو شادیاں کی تھیں۔ شاردا کی والدہ فوت ہو چکی تھی' دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ سرسبز و شاداب پہاڑوں کے دامن میں شاردا اپنی سوتیلی ماں کے پاس رہ رہی تھی۔ وہ گریجویشن کر چکی تھی' اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے وہ بڑی لاڈلی اور حساس طبیعت تھی۔

❁......❁......❁

کیپٹن طارق بنگش چند دنوں کے لیے اپنے ماں' بابا سے ملنے اپنے گاؤں جا رہا تھا' شاردا کو اس نے رات ہی بتا دیا تھا وہ کچھ پریشان سی ہوئی تھی مگر کیپٹن بنگش نے جلدی آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اس شام وہ مغرب کے وقت گاؤں پہنچا تھا جہاں ماں' بابا' جہانزیب بھائی' گل بابا' چاچا لال شیر اور اس کی بیٹی کرن بھی اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ گل بانو جو کیپٹن طارق کی چچی بھی تھی انہوں نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا' جس میں گاؤں میں رہنے والے قریبی عزیز و اقارب بھی مدعو تھے' نمکین گوشت کے ساتھ سجی بنائی گئی تھی اور پھر اوپر کشمیری چائے نے کھانے کا مزہ ہی دوبالا کر دیا۔ اس دوران کرن نے کئی مرتبہ طارق کی طرف بڑی دلربا اداؤں سے دیکھا تھا مگر وہ تو انجانی منزلوں کی طرف پرواز کرنا چاہتا تھا۔

رات کو بختاور ماں نے طارق کو اپنے پاس بٹھا لیا اور دیر تک اس کا ماتھا چومتی رہی پھر بابا جانی اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''طارق بیٹا! بہت دنوں بعد چکر لگایا ہے' سب گھر والے اداس تھے۔''

''بس بابا جان! ملکی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں' سرحد پر بھارتی فوجیوں کی جارحیت بڑھتی جا رہی ہے' حالات کافی کشیدہ ہیں اس لیے چند دن کی چھٹی ملی ہے۔'' کیپٹن طارق نے بتایا تو سب خاموش ہو گئے۔ ماں کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔ کرن دو تین مرتبہ حویلی آ چکی تھی مگر طارق کی طرف سے مسلسل خاموشی نے اس کی روح تک کو سلگا دیا تھا۔

وقت کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی چلتی رہیں' وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ طارق بنگش کی چھٹی ختم ہو چکی تھی' آج اسے واپس جانا تھا' تمام لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اتنے مضبوط چچا کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو نکل رہے تھے' اپنی ماں کو روتا دیکھ کر اس نے ماں کی گود میں اپنا چہرہ چھپا لیا تب اس نے چپکے سے دعا کر ڈالی۔

''اے مالک کائنات! اس پناہ گاہ نما گود کو ہمیشہ میرے لیے سلامت رکھنا۔''

❁......❁......❁

یہ خیال بھی عجیب ہوتے ہیں' وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیتے۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ شاردا کے سنگ انجانی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔

آج صبح سے ہی مطلع ابر آلود تھا' اچانک سیاہ بادل چھا گئے اور پھر ہلکی بوندا باندی ہونے لگی اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی تا کہ بارش سے پہلے پہلے ایبٹ آباد پہنچ جائے مگر کچھ دیر بعد ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ وائپر چلتے رہے اور گاڑی کے فرنٹ والے شیشے کو صاف کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی جب وہ حویلیاں شہر کو کراس کر رہا تھا' وہ شاردا سے بات کرنے کو بے قرار تھا اور جلدی جلدی اپنی منزل پر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھا دیا تھا' گاڑی اور تیز دوڑنے لگی۔

شام ڈھل چکی تھی اور رات کا دھندلکا چھانے لگا تھا' جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات گیارہ بجے کے قریب اس نے شاردا کو کال کی جسے فوراً پک کر لیا گیا' وہ بہت اداس لگ رہی تھی' گلے' شکوے بھی کر رہی تھی اور اقرار وفا بھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”طارق! میں نے جب پہلی نظر آپ کو دیکھا تھا' اسی لمحے صدیوں کا سفر ایک پل میں طے کر لیا تھا' تم میرے ذہن میں دریا کی طرح ایک ہی وقت ہر جگہ موجود رہتے ہو۔“

چٹان سے مضبوط اعصاب والا کیپٹن طارق بنگش' اس پھول سی پنکھڑی کی محبت کے سحر میں پوری طرح ڈوب چکا تھا۔ اس کا فولادی جسم شاردا کے حسن بے مثال کے آگے موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ اس کا دل اپنی گرفت سے آزاد ہو کر اب شاردا کی مٹھی میں چلا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ نازک سے مزاج والی لڑکی کتنی تیزی سے اس کے من میں رچ بس گئی ہے۔ جانے وہ میرے ساتھ خوش رہ بھی پائے گی یا...... اس سے آگے اس نے سوچنا بند کر دیا۔ کال کٹی تو وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

کچھ دن تو فون پر باتیں ہوتی رہیں اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی کسی ہوٹل پر تو کبھی پہاڑوں کی اوٹ میں وہ ملتے رہے۔

اس روز سر شام ہی ڈھیروں بادلوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا' تھوڑی دیر بعد بوندا باندی شروع ہو گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ گہرے رنگ کے بادل چھا جانے سے شام سے پہلے ہی سیاہی مائل اندھیرے چھا گئے تھے وہ کس وقت سے گود میں کشن رکھے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھی۔ گھنیری پلکوں کے نیچے آنکھیں اس وقت گلابی پن لیے ہوئی تھیں۔

آج کیپٹن طارق سے بڑی طویل اور بڑی اہم ملاقات ہونے والی تھی' شاردا نے دوپہر کو ہی اپنی سوتیلی ماں کو بتا دیا تھا کہ رات وہ اپنی ایک سہیلی کی رسم حنا میں شرکت کرے گی۔

ہلکے جامنی رنگ کے سادہ سوٹ میں وہ بے حد چارمنگ لگ رہی تھی' ہمیشہ چوٹی کی قید میں رہنے والے بادلوں کو آج اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بے حد سندر شاردا دھیرے دھیرے چلتی ہوئی خوب صورتی سے سجے ہوئے بے حد خوب صورت ہال میں چلی آئی جہاں کیپٹن بنگش انتظار کرتے کرتے کروٹیں بدل رہا تھا۔ ایوب میڈیکل کالج سے ملحقہ اس ہوٹل کا یہ ہال اس لحاظ سے بھی محفوظ تھا کہ کم و بیش ہی لوگ ادھر کا رخ کرتے تھے۔ اس میں زیرو پاور کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ کے بلب لگائے گئے تھے جو اس ملگجی اندھیرے میں ماحول کو رومانس پرور بنائے رکھتے تھے۔ چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھیرے' گلابی لبوں پر مسکان سجائے وہ بڑی تمکنت سے

چلتی ہوئی کیپٹن بنگش کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا اور شاردا سے اس طرح ملنے پر اس کا شکریہ ادا کرتا تھا۔

آج وہ دونوں ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہ رہے تھے کہ بیرے نے چائے' کافی اور سینڈوچ' برگر وغیرہ لا کر میز پر سجا دیئے۔ ان کی ٹیبل ہال کے ایک کونے میں تھی جہاں روشنی برائے نام تھی۔ شاردا چائے پینے لگی اور کیپٹن بنگش نے کافی کا مگ اپنی طرف کھسکا لیا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی خوب صورتی کو سراہا رہا تھا۔ کچھ شوخ و چنچل جوڑے اندر آ گئے تھے اور شور بھی کر رہے تھے اس لیے وہ باہر لان میں آ گئے باہر کا موسم قدرے بہتر تھا' شاردا نے کندھے پر لٹکے بیگ سے کشمیری شال نکال لی تھی کیونکہ رات یخ ہونے لگی تھی۔

کیپٹن طارق نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو شاردا کے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی اور اس کے حسن کے مندر میں سریلی گھنٹیاں بج اٹھیں اس نے اپنا سر کیپٹن طارق کے چوڑے سینے پر ٹکا دیا اور وہ اپنے ہاتھوں کی مضبوط انگلیوں سے شاردا کے کھلے بالوں میں کنگھی کرتا رہا۔ شاردا کے بدن سے اٹھنے والی مسحور کن مہک نے کیپٹن طارق کو مدہوش سا کر دیا تھا پھر کیپٹن طارق نے اس کے دونوں کندھے تھام کر اور اس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں جھانک کر دریافت کیا۔

''شاردا! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟'' نجانے کس طاقت نے یہ سوال اس کے منہ سے اگلوایا تھا' وہ خود بھی حیران تھا۔ اس نے شاردا کی نظروں میں نہ تو کوئی بے چینی دیکھی اور نہ ہی اس کے پُرسکون چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''کیپٹن طارق! میرے جذبات کی شدت میں کہاں ایسی کمی رہ گئی ہے جو تم نے مجھ سے یہ سوال کیا؟ لیکن شاید تم جلد محسوس کر لو گے کہ اب میں اس منزل سے گزر چکی ہوں جہاں انسان کی اپنی کوئی حیثیت کوئی سوچ باقی رہ جاتی ہے۔ میں تو اب خود تمہاری ذات کا ایک حصہ بن گئی ہوں۔'' جب شاردا یہ سب کچھ کہہ رہی تھی تو اس کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ' اعتماد اور وقار تھا۔

اس نے آج تک اپنے اندر لاکھ خواہش پیدا ہونے کے باوجود شاردا کے بدن کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس رات عالم وارفتگی میں جانے وہ ہوش و خرد کی کتنی منزلیں عبور کر گیا شاید یہ اس کی زندگی کا کمزور ترین لمحہ تھا جب اس نے تڑپ کر شاردا کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں سمو لیا۔ دونوں کا ہی دل یہی چاہتا تھا کہ وقت کی نبضیں تھم جائیں اور زندگی یہیں ساکت ہو کر رہ جائے مگر سہمی ہوئی دلہن کی طرح خاموش رات' دھیرے دھیرے گزرتی چلی گئی۔

رات کے چار بج رہے تھے پھر آہستہ آہستہ ہاتھوں سے ہاتھ جدا ہونے لگے۔ قدموں کے زاویے ٹیڑھے ہونے لگے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاردا بضد تھی کہ جلد از جلد کورٹ میرج کر لی جائے جبکہ کیپٹن بنگش اسے والدین کی باہمی رضامندی سے اپنانا چاہتا تھا۔ اس نے شاردا سے پیار نبھانے کے لیے بڑے عہد و پیماں کر لیے تھے اور بڑی قسمیں کھا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلا چکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ موسم بہار کے آتے ہی اپنی ماں اور پاپا جانی کو اس کا ہاتھ مانگنے شاردا

کے گھر بھیجے گا۔

❁......❁......❁

وقت کا پہیہ اپنے محور پر گردش کرتا رہا' کچھ ایسی خبریں گردش کرنے لگی تھیں جس سے کیپٹن بنگش کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے اور پھر ازلی دشمن نے کارگل کے محاذ پر جھڑپوں کی صورت میں جنگ چھیڑ دی تھی۔

کیپٹن بنگش کو فرض پکار رہا تھا اور وہ لبیک کہتا ہوا آندھی اور طوفان کی طرح کارگل کی چوٹیوں پر پہنچ گیا۔ ایک اچھے مجاہد کی یہی پہچان ہے کہ وہ دفاع وطن کی خاطر اپنی جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرے۔

اسے 1965ء اور 71ء والی بھولی ہوئی کہانی اچانک یاد آ گئی تھی' اسے ان شہیدوں کے لہو کی مہک آ رہی تھی جو چھ ستمبر 1965ء کو چونڈہ کے محاذ پر اپنے جسموں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے گھس کر جام شہادت نوش کر گئے تھے۔

کارگل کی لڑائی میں ہمارے جاں نثاروں نے دشمن کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ کئی ہندوستانی فوجی کیپٹن بنگش کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ کیپٹن بنگش اسٹانڈر آفیسر تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت دشمن کی ایک بڑی چوکی میں گھس گیا اور دشمن کے بزدل فوجی بھیڑوں کی طرح اس کے آگے بھاگ کھڑے ہوئے چند لمحوں میں ہی ان کی لاشیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔

جنگ جاری تھی اور پاک فوج نے انڈیا کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا کہ اچانک جنرل ہیڈ کوارٹر سے جنگ بندی اور سیز فائر کے آرڈر موصول ہو گئے اور ساتھ ہی پاک آرمی کو واپس بلا لیا گیا مکار دشمن نے جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس وقت فائرنگ کھول دی جب پاکستانی فوج واپس پلٹ رہی تھی' گولیوں کا ایک برسٹ کیپٹن بنگش کی دائیں ٹانگ کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ زخمی حالت میں کیپٹن بنگش کو ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے سی ایم ایچ راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔

فوجی اسپتال کے تمام سرجن سر جوڑے بیٹھے تھے' کیپٹن بنگش کی ٹانگ کی ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھیں اور زخموں کی نوعیت خطرناک حد تک تشویشناک تھی۔ گینگرین ہونے کے چانسز بڑھ رہے تھے اور کیپٹن طارق کی جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ ٹانگ کو کاٹ دیا جائے۔

ڈاکٹروں کے بورڈ نے ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ دے دیا تھا اور اگلے ہی دن کیپٹن بنگش ایک ٹانگ سے محروم ہو چکا پھر بھی اس کی آنکھوں کی چمک ماند نہیں پڑی

بابا جانی اور تمام اہل خانہ رو رہے تھے اور کیپٹن بنگش انہیں بڑے حوصلے اور تسلی سے چپ کرا رہا تھا۔ میڈیکل لحاظ سے ان فٹ ہونے کی وجہ سے وہ فوج سے فارغ ہو چکا تھا' اس کی شجاعت اور فوجی خدمات یا احسن انجام دینے پر اسے "تمغہ جرأت" سے نوازہ گیا تھا اور اب تک وہ نقلی ٹانگ بھی لگوا چکا تھا۔

❁......❁......❁

اسے پھر سے شاردا کی یادیں ستانے لگی تھیں نہ تو ٹیلی فونک رابطہ ہوا اور نہ ہی شاردا کی طرف سے کوئی خط آیا

تھا۔ وہ سہانی گھڑیاں جو شاردا کی قربت میں گزری تھیں۔ ایک ایک منظر کسی فلم کے سین کی طرح اس کے سامنے آتا رہا۔

خلوت کے وہ قیمتی لمحات جو شاردا کے سنگ بیتے تھے اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ ایک موہوم سی امید لے کر وہ ایک دن ایبٹ آباد جا رہا تھا اس کی گاڑی کا رخ شملہ پہاڑی کی طرف تھا' وہ شاردا کے گھر جا رہا تھا۔ پھر جو کہانی شاردا کی سوتیلی ماں شہناز جدون نے سنائی وہ کچھ یوں تھی' وہ کہہ رہی تھی۔

"طارق بیٹا! شاردا آپ سے بہت پیار کرنے لگی تھی' اس بات کا علم اس کے باپ زمان جدون کو بھی ہو چکا تھا جب آپ جنگ میں زخمی ہو کر سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل تھے اور آپ کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تھی' شاردا آپ سے ملنے راولپنڈی جانے کی ضد کر رہی تھی اس کے دل میں آپ کا احترام بڑھ گیا تھا اور وہ آپ سے جلدی شادی کرنا چاہتی تھی مگر زمان جدون کو یہ بات گوارہ نہ تھی کہ اس کی بیٹی ایک معذور انسان کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ زمان کا ایک ارب پتی دوست امریکا میں مقیم تھا اس کا بیٹا شہریار بھی تین دن کے لیے امریکا سے یہاں آیا اور جدون نے زبردستی شاردا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شاردا نے بڑا احتجاج کیا' خودکشی کی دھمکی بھی دی تھی مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ اب شاردا ہیروں اور ڈالروں کے ڈھیر میں دفن ہو چکی ہے۔"

شاردا کی شادی کی خبر سن کر بنگش کے سر پر آسمانی بجلی کی طرح گری تھی' اس کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ جیسے دل کرچی کرچی ہو گیا ہو وہ گھر پلٹ آیا تھا۔

زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی تھی' ایک سال یونہی گزر گیا۔ ایک دن طارق کی ماما نے بیٹے کا سر اپنی گود میں رکھ کر بہت پیار کرتے ہوئے اس کی شادی کی بات چھیڑ دی۔

"نہیں ماں...... میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔" طارق نے جواب دیا۔

"پھر بوڑھے ہو کر کرو گے شادی۔" ماں نے ذرا سختی سے کہا تو وہ کچھ نرم پڑ گیا۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے' جیسے آپ لوگوں کی مرضی مگر لڑکی خوب صورت ہونی چاہیے۔" طارق بنگش نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ کھل اٹھی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس گاؤں میں ہماری کرن سے بڑھ کر کوئی لڑکی حسین نہیں ہو سکتی۔" ماما کے ساتھ پاپا اور جہانزیب بھی سر ہلا رہے تھے' گل بابا تو مٹھائی کا ٹوکرا بھی لے آیا تھا۔

یوں چند دنوں میں ہی کرن مسز طارق بنگش بن گئی' بڑی سادہ سی تقریب ہوئی تھی مگر پھر بھی جہانزیب نے کلاشنکوف سے فائرنگ کر کے کچھ ارمان تو پورے کیے تھے۔

کرن ایک اچھی ہمسفر ثابت ہوئی تھی' وہ ایک پیار کرنے والی اور طارق پر جان چھڑکنے والی بیوی تھی۔ ہر وقت طارق کی خدمت میں لگی رہتی' بچپن میں اس کے ساتھ کھیلنے والی سادہ سی کرن اب وہ نہیں رہی تھی' بڑا رنگ روپ نکالا تھا اس نے۔

کرن کا پردے میں لپٹا ہوا حسن پہلی رات ہی طارق بنگش پر عیاں ہو چکا تھا اور شادی کے ایک سال بعد ہی ان کے آنگن میں "شیربانو" کی شکل میں ایک پھول کھلا۔ وہ ننھی بچی ہو بہو شاردا جیسی تھی اور سب گھر والوں کی

آنکھ کا تارا بن گئی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں سے طارق بہت خوش ہوتا۔
اس کے دل میں لگے وہ سارے زخم مندمل ہو چکے تھے جو شار دا کی جدائی سے ناسور کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ اس نے وہ بربت ہی توڑ دیا جس پر کبھی شاردا کی محبت کے گیت گائے تھے۔ اس کی سازِ حیات کے وہ تار خاموش ہو چکے تھے جو شاردا کے تصور سے بھی لرز اٹھتے تھے۔
آج کیپٹن طارق بنگش گاؤں سے تھوڑا دور پہاڑوں کی طرف نکل گیا تھا' پہاڑی کے دامن میں بکریوں کے ریوڑ ساکت و جامد چر رہے تھے اور کوئی چرواہا بانسری کی مدھر سریں بکھیر رہا تھا۔ وہیں چنار کا ایک درخت کھڑا تھا' جس کے زرد پتوں کو ہوا کے تیز جھونکے اڑا اڑا کر لے جا رہے تھے اور وہ ٹنڈ منڈ ہوتا جا رہا تھا۔
طارق بنگش نے سوچا کہ وہ بھی ایک زرد پتے کی طرح ہے اس سے پہلے کہ موت کا کوئی جھونکا آئے اور مجھے بھی لے جائے کیوں نہ جاتے جاتے نئے دیپ روشن کر جاؤں اور اگلے دن وہ پرائمری اسکول کے بچوں کو فوجی ٹریننگ دے رہا تھا۔

بااصول

صداقت حسین

"کیا یہ وہی ہے جس کے انتظار میں ہم یہاں کافی دیر سے کھڑے ہیں؟" چنکارے نے مجھ سے پوچھا۔
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، کیوں کہ اندھیرا کافی ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں کئی دنوں سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے اپنے نیفے میں اڑسی ہوئی سمتھ اینڈ ولسن پستول نکالی اور اس کی نال پر سائلنسر لگا دیا۔ میں جب سائلنسر لگا لیتا تھا، تو تب اسے 'چپ شاہ' کہتا تھا۔
ہم دونوں اس وقت ایک محفوظ اور خفیہ مقام پر چھپے ہوئے تھے۔ یہ محفوظ اور خفیہ مقام اس تاریک گلی میں موجود کوڑے کے ڈرم کا عقب تھا۔ کافی دیر سے میں وقاص کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اب تنگ ہو کر نکلنے ہی والا تھا کہ چنکارے نے میرا بازو پکڑ لیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔
"کوئی آ رہا ہے؟"
میں غور سے اس طرف دیکھنے لگا جدھر چنکارے نے اشارہ کیا تھا۔ واقعی کوئی پیدل چلتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ میرا انتظار ختم ہو گیا تھا۔ چنکارے نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ تو لگا لیا تھا کہ جس کے انتظار میں ہم کافی دیر سے کھڑے تھے، وہی آ رہا ہے۔ پھر بھی اس نے مجھ سے تصدیق چاہی تھی۔
میں جلد سے جلد اپنا کام پورا کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے آگے بڑھنا چاہا، لیکن مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا، کیوں کہ ایک کار اچانک نمودار ہو گئی۔ اس کار کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم وہیں رک کر کار کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ کار کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ روشنی کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے ہم اپنے اسی تاریک گوشے میں دبک گئے جہاں کچھ دیر پہلے ہم کھڑے وقاص کا انتظار کر رہے تھے۔
کار وہاں سے گزرنے کے بجائے وقاص سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ہم چونک پڑے کہ یہ

یہاں کیوں آ کر رک گئی ہے؟ ابھی ہم اس بارے میں کچھ اور سوچتے کہ کار کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک سایہ سا کار سے اتر کر کار کی سامنے والی روشنیوں کی زد میں آ گیا۔

"تت...... تت تم...... تم یہاں کیوں رکے ہو؟" وقاص کی حیرت زدہ آواز اندھیرے میں میں گونجی۔

"میں اس لیے رکا ہوں کہ تمھیں بتا سکوں کہ میں تمھیں کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔" ایک شخص کی آواز گونجی۔

یہ آواز سن کر میں چونک پڑا۔ یہ ظہور تھا...... وقاص کا بدترین جانی دشمن۔ میں حیران رہ گیا کہ اسے کیسے پتا چلا کہ ہم وقاص کو یہاں گھیرنا چاہتے ہیں۔ میں اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا، کیوں کہ اس معاملے میں میری چھٹی حس کچھ زیادہ ہی کام کرتی ہے۔ دوسرا یہ کہ میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے ہر غیر متوقع چیز مشکوک دکھائی دیتی ہے، اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے ہمارا تعاقب کیا تھا اور یہ تعاقب اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ ہمیں ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا بعد میں ظہور ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟ اگر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، تو کتنا......؟

اصل میں بات یہ تھی کہ ظہور اپنے بدترین دشمن وقاص کو مارنا چاہتا تھا۔ وہ خود یہ کام نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کے پاس یہ کام کرانے کے لیے رقم تھی، اسی لیے تو اس نے کسی اجرتی قاتل کی خدمات لینے کا سوچا۔ یوں قسمت اسے میرے پاس لائی تھی۔ میں نے پچاس لاکھ روپے میں معاملہ طے کر لیا تھا۔ اپنے اصول کے مطابق میں نے ساری رقم پیشگی وصول کر لی تھی۔ میں کچھ اپنے بارے میں بتاتا چلوں کہ میں ہر لحاظ سے ایک خوش حال زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن جانے میں کیوں جز وقتی اجرتی قاتل کے طور پر کام کرنے لگا تھا۔ آپ اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میرا اصل نام تو اس شعبے میں کوئی نہیں جانتا۔ یہاں مجھے استاد جانیا کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ جب استاد جانیا کسی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے، تو پھر اسے ہر حال میں پورا کرتا ہے خواہ اسے خود نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ میں نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا ہے، اسی لیے تو ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود میں سو فی صد کامیاب ہوں اور کبھی پکڑا نہیں گیا ہوں۔ میرا ایک شاگرد ہے۔ اسے چٹکارا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ ہر ایسے معاملے میں میرے ساتھ ہوتا ہوں۔ مجھے اس کی صلاحیتوں پر بہت بھروسا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب میں اس کام کو چھوڑوں گا، تو تب چٹکارا میرا حقیقی جانشین ثابت ہوگا اور میری کمی کو زیادہ محسوس نہیں ہونے دے گا۔

ظہور کی آواز پہچاننے کے بعد اب چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے میں اور چٹکارا اپنے پوشیدہ مقام سے نکل کر دوڑتے ہوئے روشنی میں آ گئے۔

میں نے چپ شاہ کا رخ وقاص کے سینے کی طرف کر دیا۔

وقاص کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ اس وقت سگریٹ پی رہا تھا۔ منہ کھلتے ہی سگریٹ اس کے منہ سے نکل کر سڑک پر گر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹا سا بیگ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ...... یہ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ہونا کیا ہے...... بس! تم قتل ہونے جا رہے ہو۔" ظہور نے سکون سے کہا۔

اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے بہت اچھی طرح سے محظوظ ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں فتح کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وقاص نے ظہور کی طرف اشارہ کیا اور سنبھل کر بولا۔

"اس نے تمھیں کتنی رقم دی ہے؟"

وقاص کے ماتھے پر پسینہ بارش کے قطروں کی طرح جگ مگا رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے...... تمھیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ میرا ایک اصول ہے کہ جب میں ایک بار رقم وصول کر لیتا ہوں، تو اس کام کو ہر حال میں مکمل کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے نہ بتاؤ، لیکن...... یہ بیگ دیکھ رہے ہو، جو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔"

"ہاں، دیکھ رہا ہوں...... کیا ہے اس میں؟"

"اس میں ساٹھ لاکھ روپے ہیں...... تم اسے مار ڈالو...... یہ رقم تمھاری ہو جائے گی...... بولو! کیا کہتے ہو؟"

ظہور نے یہ سنا، تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میں نے چٹکارے کو اشارہ کیا۔ وہ بیگ کی طرف بڑھ گیا۔

"تم اس وقت ساٹھ لاکھ روپے لے کر کہاں جا رہے تھے؟" ظہور نے اس سے پوچھا۔

وقاص نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔

اسی دوران میں چٹکارے نے بیگ کو اٹھا کر اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ پھر وہ بیگ اٹھا کر میرے پاس آ گیا اور بولا۔

"پوری رقم اس بیگ میں موجود ہے...... پانچ پانچ ہزار والی سو گڈیاں ہیں۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ رقم واقعی پوری ساٹھ لاکھ تھی۔

اب وقاص کے چہرے پر سے خوف کے اثرات ختم ہو گئے اور اس کی جگہ اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"پیارے!" وہ زہریلے لہجے میں ظہور کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تم نے جو بازی کھیلی تھی، وہ تم ہار چکے ہو...... میں نے جو عین وقت پر بازی کھیلی ہے...... اس میں ناکامی کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔"

یہ سن کر ظہور نے ایک قدم میری طرف بڑھایا اور بولا۔

"تم مجھ سے رقم لے چکے ہو...... تمھیں اسے قتل کرنا ہی ہوگا۔"

"ظہور! تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میں کسی کو ٹھکانے لگانے کے لیے رقم قبول کرتا ہوں، تو اس کی موت اٹل حقیقت بن جاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر میں نے وقاص کے سینے کا نشانہ لے کر چپ شاہ سے دو فائر کردیے۔
وقاص کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مکروہ مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی تھی اور اب اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ میں نے اتنی بڑی رقم لے کر بھی اسے قتل کردیا تھا۔ اسے میرے اصول کا پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنا سینہ تھام لیا تھا، کیوں کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ میرے بارے میں مشہور تھا کہ اگر میں اڑتی ہوئی مکھی کو بھی نشانہ بناؤں، تو وہ بھی خطا نہیں ہوتا۔ جب کہ یہ تو ایک جیتا جاگتا لمبا تڑنگا انسان تھا۔
خون وقاص کی انگلیوں کے درمیان سے ابل رہا تھا۔ وہ اپنا سینہ پکڑے دھیرے دھیرے سڑک پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ پھر تھوڑے سے اذیت ناک لمحات کے بعد اس کا تڑپتا ہوا جسم ساکت ہوگیا تھا۔
پھر میں ظہور کی طرف گھوم گیا۔
اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔
تب میں نے چپ شاہ کا رخ ظہور کے سینے کی طرف کردیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔
"یہ...... یہ یہ تم کیا کررہے ہو؟"
اس کے لہجے میں بے یقینی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔
میں نے بیگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔
"میں نے اس کی پیش کش بھی قبول کرلی تھی اور میں رقم وصول کرچکا ہوں ...... مجھے سو فی صد یقین ہے کہ تمہیں یاد ہوگا...... جیسا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میں کسی کو ٹھکانے لگانے کے لیے رقم قبول کرتا ہوں، تو اس کی موت ایک اٹل حقیقت ہوتی ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے چپ شاہ کا گھوڑا دبا دیا تاکہ اس کی موت اٹل حقیقت بن جائے۔
آپ کا کیا خیال ہے کہ میں بااصول ہوں یا نہیں

مکافات عمل

جاوید احمد صدیقی

ہم تین بہن بھائی اپنے والد کے ساتھ انتہائی سکون اور اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ تقریباً ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی، والدہ صاحبہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے گھر کو چلاتی آئی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ بڑی سگھڑ اور انتہائی صبر و شکر کرنے والی خاتون تھیں۔ میں نے انہیں کبھی ابو سے بلاوجہ گلہ شکوہ یا خوامخواہ کی فرمائشیں کرتے کبھی نہ دیکھا تھا، ہاں ذرا خاموش طبع تھیں۔ والد صاحب کے مصروف رہنے کی وجہ سے بچوں کی تربیت، دیکھ بھال، پڑھائی کی ذمہ داری یہ سب ہماری والدہ ہی کی ذمہ داریاں تھیں۔ والد صاحب بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلا رہے تھے۔ میں تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا حادثہ گزر جائے گا بلکہ واقع ہوجائے گا اور ہم سب دیکھتے رہ جائیں گے۔
اور پھر اچانک ہی والد صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ دوسری شادی کرنے چلے اور پھر شادی کر کے نئی امی کو گھر لے بھی آئے۔ والد صاحب کی شادی کے وقت جبکہ میں میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی اور دونوں

چھوٹے بھائی علی الترتیب کالج اور اسکول کے آخری سالوں میں تھے۔ ابو کی اچانک شادی کر کے نئی امی کو گھر لانے سے ہم سب عجیب صدمے اور انتہائی دکھ سے دوچار ہو گئے تھے۔ اس گہرے صدمے اور دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دینے والے واقعہ نے نہ صرف ہم بہن بھائیوں کو ہلا کے رکھ دیا وہاں ہماری امی پر تو صدمہ اور دکھ کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ اصل میں ابو نے اچانک اتنا جلدی اور ہم سب کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور یہ انتہائی قدم اٹھالیا۔

یہ نئی امی لڑکی سی تھی اور تقریباً مجھ سے چند سال ہی بڑی ہوگی۔ امی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو پتھر کی مورت بنی ہم تینوں کو انتہا سے زیادہ سنبھالنے میں لگی رہتی تھیں۔ اصل میں یہ شادی والا حادثہ خاص خاص زلزلوں کی طرح اتنا اچانک تھا کہ ذہنی طور پر ذرا بھی یہ سوچ نہ سکتے تھے اور زلزلہ سب کچھ لے ڈوبا اور اس طرح اچانک ذہنی اور دلی صدمہ بھی تھوڑا نارمل ہوتے ہوتے کچھ وقت لے لیا کرتا ہے۔

اصل میں ابو کے اس اقدام سے ہم اندر سے جیسے بالکل ہی ہل کر رہ گئے تھے۔ گھر میں عجیب سوگواری اور بٹوارے کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ امی تو جیسے خاموش مٹی یا برف کا تودہ بن کر رہ گئی تھیں۔ شوہر سے شکوہ کیا نہ شکایت' لڑیں نہ جھگڑیں...... جیسے اپنے سارے حقوق سے دستبردار ہوگئی ہوں۔ ابا جان کے اس اچانک اقدام نے ہمیں اور ہماری ماں کو رشتہ داروں' عزیزوں' گلی محلے کے لوگوں کی نظروں میں تماشا بنادیا تھا۔ ہمارے پاس رشتہ داروں اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں تھے بجز ان آنسوؤں کو جو ہم سب مل کر تنہائی میں بہالیتے تھے۔ امی جیسے چپ تھیں' ویسی ہی چپ رہیں۔ اپنے اندر کے ابال اپنے اندر کے دکھ درد کو انہوں نے کبھی بھی ہم بچوں کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ ابا جان نئی دلہن کے ساتھ اوپر کمرے میں شفٹ ہو گئے تھے اور یہ بھی غنیمت تھا کہ آبائی گھر موجود تھا اور اوپر کی منزل میں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے ورنہ شاید ماحول اور بھی گمبھیر اور بدتر ہوتا چلا جاتا۔

ابو جان کا سلوک' رویہ ہم بچوں کے ساتھ پہلے کی طرح شفیق اور مہربان تھا لیکن معلوم نہیں ہم لوگوں کو ابو جی سیڑھیاں چڑھتے اترتے بیگانے بیگانے سے محسوس ہوتے۔ ایک غیر مرئی دیوار تھی جو ہمارے اور ان کی درمیان حائل ہوگئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حادثہ ہم لوگوں نے قبول کرلیا اور اس عورت کو بھی سوتیلی والدہ کے روپ میں تسلیم کرلیا۔ وہ اکثر نیچے اتر آتی اور ہم بچوں کے ساتھ خوب مزے مزے کی باتیں کرتی' وہ عورت حسن اخلاق سے آراستہ تھی۔ ہمارا غصہ' رنج اور کوفت اس سے مل کر دور ہونے لگے تھے اور ہم بہن بھائیوں نے کبھی مل کر اس واقعہ پر غور کرتے تو سوچتے تھے کہ اس سانحہ کے پیچھے قصوروار کون زیادہ ہے؟ ابو جان جو بغیر بتائے چپ چاپ اپنی بیوی لے آئے تھے یا اپنی امی جنہوں نے کبھی ابو جان سے گھر ہوتے ہوئے بات نہ کی تھی۔ ایک عجیب سی سرد سی جنگ ان دونوں کے درمیان ہم نے ہمیشہ محسوس کی تھی۔ کیا دوسری شادی اسی رویہ کا تو نتیجہ نہ تھا مگر دونوں کو کون صفائی پیش کرنے کی عدالت کے کٹہرے میں لاکھڑا کرتا؟

اصل قصہ شروع ہونے جارہا ہے کہ آگے واقعات کس طرح بڑھے' ہم سب بچے چند سالوں میں تعلیم سے فارغ ہوگئے اور اسی دوران ابو جان بھی نوکری سے ریٹائر ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ پر جو جمع پونجی ملی اور ابو جان نے ہم تینوں کی شادیاں کردیں اور ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہوگئے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ابو جان کو مزید

تین عدد بچوں سے نوازا یعنی اب ہم چھ بہن بھائی تھے' ہم لوگوں کی شادی سے گھر میں جو خلا آیا تھا اس خلاء کو کم از کم ابو جان نے تو ہرگز محسوس نہ کیا تھا' رہی ہماری امی جان...... تو وہ اپنے دکھ' اپنی تنہائی صرف اپنے ساتھ ہی شیئر کرتی رہیں انہوں نے اپنے اکیلے پن کے دکھ میں ہمیں بھی شریک نہیں کیا تھا یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری ماں نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی ہو اور اپنی زبان پر خاموش کے تالے لگا لیے ہوں۔

ابو جان اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد معاشی طور پر پہلے کی طرح خوشحال نہیں رہے تھے۔ اوپر سے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی کفالت کا بوجھ بھی اس عمر میں آن پڑا تھا۔ میں اس وقت تک برسر روزگار ہو چکی تھی اور میری پریکٹس بھی خوب چل رہی تھی۔ میں ہر لحاظ سے چھوٹے بھائیوں سے بہتر تھی' تنخواہ میں اور مراعات میں بھی۔ میرے شوہر جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے اور خاندانی پشت ہا پشت سے گاؤں میں جائیداد کی شکل میں خاصی زمین تھی۔ اس لیے مجھے پیسے وغیرہ کی ذرا بھی تنگی نہ تھی' ابو جان نے ایک دن اپنی معاشی پریشانی کے بارے میں مجھے آگاہ کیا انہوں نے کہا کہ ان کی تنخواہ بہت قلیل ہو چکی ہے۔ پانی' بجلی' گھر کا ٹیکس اور دوسرے اخراجات نکال کر محض چند ہزار بچتے ہیں جن سے اخراجات کا پورا کرنا ناممکن ہے۔ میرے بھائی بہتر زندگی گزار رہے تھے مگر محض ابو جان کے لیے بھی اتنے پیسے نکال نہیں سکتے تھے اور بحیثیت ڈاکٹر چوں کہ میری مالی حیثیت سب سے زیادہ مستحکم تھی اس لیے اس صورت میں مجھے کچھ رقم ان کی مالی امداد لیے ضرور بھجوانی چاہیے ایک باپ بیٹی سے مانگتے ہوئے جس طرح شرمسار' معیوب اور دکھی سا ہو رہا ہوتا ہے وہ دکھ میں نے اس دن ابو جی کی لرزتی ہوئی آواز میں محسوس کیا۔

اس وقت میں نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ابو آپ فکر نہ کریں آپ نے ہمیں نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ زیور تعلیم سے بھی آراستہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی' اتنے اخراجات اٹھائے اور اب مجھے آپ کی خدمت انجام دے کر خوشی ہوگی۔'' اور پھر ہر ماہ میں نے آٹھ ہزار روپے بھجوانے کا بندوبست کر دیا یوں اس طرح ان کی زندگی کی گاڑی قدرے ہمواری سے چلنے لگی۔ میرے شوہر بڑے نیک اور ہمدرد انسان ہیں اور اس طرح کی زندگی کی رکاوٹوں کو سمجھتے ہیں چنانچہ انہوں نے میرے رقم بھجوانے پر ذرہ برابر بھی احتجاج نہ کیا۔

آرمی میں ہونے کی وجہ سے شہر شہر پوسٹنگ ہونے سے لطف بھی اٹھاتی تھی۔ اب روز بروز بچوں کے ساتھ ہماری ضروریات میں بے پناہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ اچھا گھر اچھی تعلیم اور کار اور مستقبل کے لیے بھی ایک خطیر رقم ہمارا مقصد حیات تھی اور یہ بھی اللہ کی کرم نوازی تھی کہ کچھ رقم جمع کر کے ہم نے اسلام آباد اور لاہور میں اچھی جگہوں پر پلاٹ بھی لے لیے تھے۔ زندگی ایک ڈگر پر بڑے اچھے طرز سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔

اور پھر اچانک ابو جی کا ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے انتقال ہو گیا' اس وقت ہمارے سوتیلے بہن بھائی اتنے چھوٹے تھے کہ بڑا بیٹا ابھی صرف آٹھ سال کا تھا میرے دل میں نہ جانے کیا آیا یا بہک گئی کہ میں نے وہ رقم جو ابو جی کی زندگی ہی میں دینی شروع کی تھی وہ روک لی شاید یہ سوچ کر ابو جی سے وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ تو ابو جی کے ساتھ تھا۔ بہرحال ان کے بچوں کے ساتھ تو نہیں کیا تھا۔ میں ان سوتیلے بھائیوں پر جو کہ اب یتیم بھی ہو چکے تھے کیوں اپنی رقم خرچ کروں۔ آخر سوتیلی ماں کے خاندان والے بھی تو لوگ ہیں' ان بچوں کے نانا' نانی اور ماموں

وغیرہ تو ہوں گے۔ اب ان لوگوں کا فرض ہے کہ ان بچوں کی کفالت کریں۔ میری امی تو اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلی گئی تھیں گویا گھر کی ذمہ داری کا مجھ پر کوئی بوجھ نہ تھا۔

کئی مرتبہ اپنے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرواتے ہوئے میرے ضمیر نے مجھے جھنجوڑا بھی' اس دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے جہاں میں منی آرڈر کروایا کرتی تھی میرے قدموں نے کئی دفعہ مجھے روکا تھا لیکن میں نے اندر کی اس آواز کو خود ہی دبا دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا' اب اس عورت کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کا بوجھ خود اٹھائے اور ہو سکے تو کہیں چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لے لیکن انسان بڑا چھوٹے دل والا ہے اور ایسے فیصلے کر جاتا ہے جو قانونِ قدرت کے منافی ہوا کرتے ہیں۔ نامعلوم رفتار سے انسان اپنے ہی اعمال کے بھنور میں پھنستا چلا جاتا ہے غیر محسوس طور پر اور پھر مکافاتِ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی ایک انسان کی طرح سوچتے ہوئے بہت چیزوں کی پروا نہ کی لیکن قدرت کے قانون کے مطابق اب یہ عمل شروع ہو چکا تھا۔

آخر کار دوسرا ماہ شروع ہو گیا قدرت تو میری نیت اور عمل کو دیکھ رہی تھی۔ اس بار بھی میرا رقم بھیجنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں نے مہینہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کا چیک کاٹا تو کچھ دیر میں ملازم چلا آیا اور مجھے بتایا کہ میرے اکاؤنٹ میں تنخواہ ٹرانسفر نہیں ہوئی' میں دوسرے روز خود آفس آ گئی تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میں پچھلے کئی ماہ سے ہاؤس رینٹ کی مد میں اوورڈراف کرتی رہی ہوں اس لیے تنخواہ کئی ماہ کٹتی رہے گی۔ یہ آفس والوں کی غلطی تھی مگر اس کا خمیازہ تو مجھے بھگتنا پڑا۔ میں گھر لوٹی تو ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی' میرے شوہر جو زمینوں پر گئے ہوئے تھے وہاں ان کا کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے کے دوران ان کے ہاتھ سے مخالف پارٹی کے ایک آدمی کو چوٹ لگ گئی اور چوٹ بھی ایسی لگی کہ وہ زندگی اور موت کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ مخالف پارٹی بھی تگڑی اور اثر رسوخ والے لوگ تھے انہوں نے فوری طور پر ایف آئی آر کٹوا دی اور پولیس وارنٹ گرفتاری لے کر میرے شوہر کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔

یہ خبر سن کر تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی' اچانک لاکھوں روپے ضمانت کروانے اور پولیس کو کیس خارج کرنے اور مخالف پارٹی کے ساتھ صلح نامے اور علاج معالجے پر لگ گئے۔ آخر خدا خدا کر کے تمام مرحلے بخوبی طے ہو گئے اور کچھ سکون کا سانس لیا مگر سکون تھا کہاں گھر لوٹی تو میری چھوٹی بیٹی اچانک تیز بخار میں مبتلا ہو گئی۔ میں خود ڈاکٹر تھی اسے سی ایم ایچ لے گئی اسپیشلسٹ کو دکھایا لیکن بچی جو صرف سال بھر کی ہی تھی اس کا بخار نہ اترا۔

ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں دیں اور بچی سو گئی' اگلے دن صبح تو میں نے ڈیوٹی پر جانا تھا بچی کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ موجود تھی پھر بھی فون کر کے بار بار خیریت معلوم کرتی رہی لیکن ڈھائی بجے کے قریب ڈیوٹی سے واپس گھر لوٹی تو بچی ماما' ماما کہتی ہوئی میرے سامنے میری آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میرے تو حواس گم ہو گئے' میں اسی طرح دوبارہ بھاگی اور کار میں لیے ہسپتال پہنچی اس وقت تک بچی کا بخار 104 ڈگری سے بھی زیادہ ہو چکا تھا اسے جلدی جلدی انجکشن لگائے گئے۔ سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی رکھی گئیں' بخار تو اتر گیا لیکن شام کو پھر تیزی سے بڑھ گیا اور اسے دورے پڑنے لگے۔ لگاتار مرگی کے دورے......

''یا میرے خدایا! ہم سے ایسی کون سی خطا ہو گئی کہ ہمیں چاروں طرف سے غم کی آندھی نے گھیر لیا ہے۔'' میں

نماز میں روتے روتے اونچی آواز سے دعا مانگتے ہوئے خداوند کریم سے پوچھ رہی تھی۔ اس ذات پاک سے شکوہ کناں تھی تبھی یکدم اور اچانک ایک خیال دھماکے کی طرح پھٹا اور میری روح تک زخموں سے چور ہو گئی۔

اور یکدم ہی میں اعترافِ جرم کی طرف بڑھ گئی' ہاں میں نے ایک خطا کی' ایک جرم سرزد ہوا کہ میں نے اپنے والد سے کیے گئے وعدے سے انحراف کیا ہے۔ میں نے اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کو جو یتیم بھی ہو چکے تھے گھر پیسے نہیں بھجوائے۔

نہ جانے ننھے بچے کس کس طرح بلک بلک کر کھانے' دودھ کو ترستے ترستے سوتے ہوں گے۔ وہ عورت ان بچوں کے لیے کھانے کا خرچہ کس طرح پورا کرتی ہوگی؟ اللہ کی پکڑ نے تو مجھے نہ صرف جھنجھوڑ دیا بلکہ میں خوفِ سزا سے کانپ اٹھی۔ میں معافی کے لیے دوبارہ اللہ کے حضور جھک گئی' میں نے یتیم بچوں کے آٹھ ہزار روکے تھے اور میرے آٹھ لاکھ سے زیادہ لگ گئے۔ میری بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی حتیٰ کہ دورے پڑنے لگے تھے۔ میاں کی نوکری جانے لگی تھی اگر وہ زخمی آدمی مر جاتا تو سیدھا سیدھا قتل کا کیس بن جانا تھا۔ ایک کے بعد ایک دکھ اور آزمائش کے سلسلے نے میرے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

اگلی صبح سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کی رقم بھجوائی بلکہ پچھلے ماہ کا حساب کر کے دوگنے پیسے بھجوائے۔ اس کے چند دن کے بعد مجھے دفتر سے اطلاع آ گئی کہ آپ کی تنخواہ بحال کر دی گئی ہے' اب یہ رقم ہم تنخواہ سے آہستہ آہستہ کٹوتی کر لیں گے۔ بچی کو اللہ تعالیٰ نے صحت یاب کر دیا' دوبارہ اسے مرگی کے دورے بھی نہیں پڑے۔

شوہر کے ساتھ مخالف پارٹی کی صلح پائیدار ثابت ہو چکی ہے' آج میں جو بھی کماتی ہوں اس میں میرے سوتیلے بہن بھائیوں کے علاوہ ناداروں' غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد تو میری کمائی میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت برکت پڑ گئی ہے اور سوچتی ہوں کہ یہ برکت' یہ آمدنی' یہ فضل و کرم' یہ ریل پیل صرف اور صرف اس وجہ سے قائم ہوئی کہ میں اللہ تعالیٰ کے بندوں پر خرچ کر رہی ہوں۔ یتیم ہونا اور بات ہے اس کے علاوہ بھی حقوق العباد کو پورا کرنا بے حد ضروری ہے اس کا اجر وہ پاک ہستی ہی دیتی ہے اور دے گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب گناہ اور روگردانی کو معاف کر دے گا مگر حقوق العباد تو اس کے بعد زیادتی کرنے والے کو معاف نہ کریں گے تب تک وہ تو ذات پاک بھی معاف نہ کرے گی۔

میرے سوتیلے بہن بھائی بہت اچھے ہیں اور سوتیلی والدہ بھی بہت نیک اور باہمت خاتون ہیں میرے پیسے نہ بھیجنے کے دورانیے میں ان کا ایک بھی گلہ والا ٹیلی فون نہ آیا تھا اور اس نیک اور اللہ تعالیٰ پر بھرپور بھروسے کی وجہ سے مجھے بھی سبق سکھایا گیا اور ان کو بھی روکھی سوکھی سے نوازا گیا۔ اب میں ان کی زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی مدد کرتی رہوں گی جیسا کہ ایک سگا باپ بچوں کی کرتا ہے۔ میری یہ ڈیوٹی ابو جان لگا کر گئے تھے' میں ہی ڈیوٹی خاص سے بے وجہ غیر حاضر ہو گئی تھی اور اس ڈیوٹی کی انجام دہی میں ہی میری نجات اور میری اور میرے خاندان کی ساری خوشیاں مضمر ہیں اور میرے شوہر بھی اب میرے ساتھ ہر قسم میں بھرپور ساتھ دیتے ہیں' ارشادِ ربانی ہے' فرمایا:۔

''تم نے جو کچھ خرچ کیا اور جو نذر بھی مانی ہو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اپنے صدقات اعلانیہ دو تو بھی اچھا ہے حالانکہ اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی برائیاں اس عمل سے محو (ختم کردی جاتی ہیں) ہو جاتی ہیں اور جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اللہ کو ہر حال میں اس کی خبر ہے (البقرہ)''

اور یہ بھی عرض کردوں کہ میں اس ارشاد ربانی نہ بھولتی ہوں اور نہ ہی کبھی فراموش کرسکوں گی۔ میری داستان بھی ہوسکتا ہے، بہت سے مسلمان، بہن بھائیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔

یادیں

زعیما خان جتوئی

اس کا تعلق ایک ایسے شہر سے تھا جس کی وجہ شہرت رنگ برنگی چوڑیاں تھیں لیکن اس کی کلائیاں ہر وقت ایسی کسی قید سے آزاد دکھائی دیتی تھیں۔ اس شہر اور اس کے نواح میں ان کی برادری کی کئی بستیاں آباد تھیں۔ اس کی اپنی پرورش شہر میں ہوئی، لیکن اس کا تعلق گاؤں سے کافی مضبوط اور گہرا تھا۔ اس کے کئی رشتے دار گاؤں میں رہتے تھے۔ برادری کے لوگ اپنے جھگڑوں کے وقتی سدھار کے لیے اس کے بابا کے پاس شہر آتے۔ فراک کا کونہ دانتوں میں دبائی لڑکی سب حیرت سے سنتی اور سوچتی کہ لڑکی کے بڑے ہونے پر گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں ڈر کیوں پڑ جاتا ہے، بے چینی اور تشویش کے مارے وہ اپنے کچے گھروں کے دروازے مضبوطی سے کیوں بند کر کے سوتے ہیں مگر پھر بھی ان کی نیندوں میں چھید ہوتے، نوجوان بیٹی کے گم جانے پر پولیس کو رپورٹ لکھوانے کی بجائے اس کے باپ کے پاس کیوں آتے اور گم شدہ بیٹی یا بہن کے ملنے پر اسے قتل کیوں کردیتے، ایک ہی کوکھ سے جنم لینے والے بھائی اور بہن میں فرق کیوں کرتے کیوں کہ اس کی زندگی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھی اور اس نے اپنے گھر میں ایسا کبھی کچھ نہیں دیکھا تھا سو وہ یہ سب اور اس طرح کے بہت سے اور مسائل حیرت سے سنتی اور کبھی کبھی تو گھبرا بھی جاتی۔ گاؤں سے آنے والے لوگوں کو وہ اپنی عمر کے گاؤں زادوں سے تعلق کی بنا پر پہچانتی جن کے ساتھ وہ گاؤں جانے پر گڈی گڈے یا چور سپاہی کا کھیل کھیلتی، شام کو وہ آنکھوں میں آنسو لیے تر چہرے سے گنوار بچوں کی ماؤں کو ان کی شکایت کرتی کبھی نہ آنے کی دھمکی دیتی اور اپنے امی ابو کے ساتھ شہر کو چل دیتی لیکن اس کی یہ ناراضگی بس گھر آکر شام اور سونے سے پہلے تک، ہوتی اور نینداس سے خفگی اور ضد کہیں دور چھین کے لے جاتی۔

اکثر بچوں کو خصوصاً لڑکی کو ان کا بچپن بیتنے کا پتہ اس کی ماں کی گھورتی آنکھوں سے چلتا ہے اور وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب سمجھ جاتی ہے لیکن وہ بہت شرارتی اور لاڈلی تھی سو کسی کو کم ہی خاطر میں لاتی۔ اسے اس بات کا احساس تب ہوا جب گاؤں سے اس کا چچازاد کسی عدالتی مسئلے کے لیے آیا اور یہ عدالتی مسئلے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں حل بلکہ بڑھتے زیادہ ہیں۔ اس ایک مسئلے نے کئی ایسے مسائل کو جنم دیا جو زندہ لوگوں سے ان کے زندہ ہونے کی دلیل چھین لیتے ہیں۔

❀❀❀❀
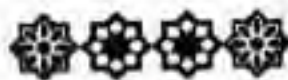
سب کچھ روایتی سا تھا کیوں کہ اس کے قبیلے میں روایتیں توڑنا ابھی فیشن کا حصہ نہیں تھا۔
گھر میں لاڈلی لڑکی گھومتی رہی، بے خطر باپ کے گلے لگتی، بھائی سے لڑتی، چھوٹی بہن پر رعب جماتی۔ بچپن سے لڑکپن تک آ پہنچی، باپ نے بہت سی باتیں اور مسئلے سمجھا دیے تھے، بہت سی باتیں سکھا دی تھی جن میں ہر کسی کے ساتھ بھلائی اور گھر میں آئے مہمان کو رحمت سمجھنا بھی تھا۔ ان میں ایک مہمان ایسا بھی تھا جس کی دو شفاف آنکھیں جن پر ابھی کسی کا سایا نہیں پڑا تھا بہت عقیدت سے اسے تکتیں جس سے کبھی کبھی وہ گھبرا جاتی، بے وجہ تنگ ہوتی، برتن پٹخ پٹخ کے دھوتی، تیز پتی والی کڑوی چائے پلاتی پھر بھی مہمان کے چہرے سے مسکراہٹ نا جاتی تو وہ اپنا سارا غصہ چھوٹی بہن پر اتارتی اور سردی ہوتی یا گرمی سر تا پاؤں چادر اوڑھ کے سو جاتی پھر شام کو اٹھتی تو گھر پھر ویسے کا ویسا۔ اس کی ہنسی اور باتوں سے کھنکتا گونجتا۔ زندگی میں خوشی تھی، روشنی تھی، امید تھی، محبت تھی، کہانی یونہی جا رہی تھی۔ وہ گڑیا بڑی ہوگئی تو اسے یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔ گاؤں زادے کی درباروں پر حاضریاں اور منتیں بڑھ گئیں۔ اس کی باتوں میں ٹھہراؤ اور پختگی آ گئی، اس کی باتوں میں وعدے اور ارادے ہوتے، تنگ کرنے کو بہت سے عجیب اور انوکھے نام جن پر وہ چڑ جاتی لیکن اتنی ہی عقیدت سے یاد بھی رکھتی جیسے کوئی پہلی محبت کے پہلے اقرار کو۔

دوستوں کے لیے جان دینا اس کے قبیلے میں سعادت سمجھا جاتا تھا۔ وہ گاؤں زادہ جسے اپنے سے زیادہ اپنی دوستی عزیز تھی، دوست کی لڑائی میں جان دے کر قبیلے کی روایت کو سرخرو کر گیا۔ سرخرو ہونے والے کے ساتھ بہت سے زندہ لوگوں کے خواب بھی دفن ہوئے۔ اس کے خون کے چھینٹے ایک آنچل پر بھی پڑے اور رنگوں اور جگنوؤں سے کھیلتی لڑکی کی زندگی تاریک اور بے رنگ ہوگئی۔

ایک عرصہ تک تو اسے جھنجوڑنے پر بھی یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہے یا وہ لوٹ کے کبھی نہیں آئے گا۔ وہ سوچتی کہ شاید ناراض ہے، لیکن کب تک ناراض رہے گا۔ کسی دن بارش میں بھیگتا، کسی گرم دوپہر یا کسی سرد شام کو آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کے لوٹنے کی امید مرجھا گئی اور اسے اس کی موت کا یقین کرنا پڑا۔

اس شخص کے دکھ کا اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہونی چاہیے جو اپنے مرنے کی دعا کرتا ہو لیکن ساری دعائیں قبول تو نہیں ہوتیں اور تب تو بالکل نہیں جب آپ کو ایسا ہونے کی شدید خواہش ہو۔ یہی تو انسان ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

کہتے ہیں نا کہ وقت ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسے یہ گھاؤ ہمیشہ ہی ہرا بھرا نظر آیا کسی خودرو ضدی پودے کی طرح جس پر موسمی تبدیلیاں بھی اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس کے پاس ایک ہی راہ تھی، اس سے منسوب لوگوں کی خوشی کی خاطر، جانے والے کی خاطر جس کی بہت سی خواہشوں میں ایک خواہش اس لڑکی کو خوش رکھنا بھی تھا۔

پھر اس نے خود سے عہد کیا اور شام کو موسم کی پہلی بارش میں کسی بت کی طرح ساکت کھڑی بھیگ رہی تھی اور بارش سارے وعدوں اور یادوں کی دھول اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ذوق آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

تین چیزیں

- تین چیزیں پاک رکھو۔ جسم' لباس' خیالات۔
- تین چیزیں قابو میں رکھو۔ زبان' نفس' غصہ۔
- تین چیزیں یاد رکھو۔ موت' احسان' نصیحت۔
- تین چیزیں برداشت نہ کرو۔ ظلم' جھوٹ' فحاشی۔
- تین چیزیں باقاعدگی سے پڑھتے رہو۔ نماز' قرآن' درود۔
- تین چیزیں دھیان سے اٹھاؤ۔ قلم' قدم' قسم۔
- تین چیزیں چھوٹی نہ سمجھو۔ قرض' فرض' مرض۔
- تین چیزیں ایک بار ملتی ہیں۔ والدین' وقت' زندگی۔
- تین چیزیں حاصل کرو۔ علم' دعا' اعتماد۔
- تین چیزیں کبھی نہ توڑو۔ دل' عہد' قانون۔
- تین چیزیں ذلیل کرتی ہیں۔ چوری' چغل' چاپلوسی۔

فائزہ فاروق...... کراچی

فرمودات حضرت علیؓ

...... حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے، حکمت خواہ منافق سے ملے لے لو۔

...... انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔

...... ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

...... جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو

...... بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے سے بچو۔

...... گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کر دیتا ہے۔

...... سب سے بہترین لقمہ وہ ہوتا ہے جو اپنی محنت سے کمایا جائے۔

...... جو شخص پاک دامن عورت پر تہمت لگاتا ہے اسے سلام مت کرو۔

...... ہمیشہ سچ بولو تاکہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

...... موت کو ہمیشہ یاد رکھو موت کی آرزو کبھی نہ کرو۔

ملک جواد نواز قریشی...... ڈیرہ اسماعیل خان

کل اور آج

☆ پہلے اولاد والدین کا سہارا ہوتی تھی اب خسارہ ہوتی ہے۔

☆ پہلے محبوب کو شالا مار باغ دکھاتے تھے اب سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔

☆ پہلے لڑکی کی صورت اور سیرت دیکھی جاتی تھی اب لڑکی کا جہیز۔

☆ پہلے انسان سے محبت کی جاتی تھی اب اس کی جیب سے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

طب نبوی ﷺ

- اپنے کھانے کا آغاز نمک سے کرو۔
- انجیر قولنج کے مرض کی دوا ہے۔
- کدو کھاؤ کیونکہ یہ سبزی دماغ کو قوت بخشتی ہے۔
- زکام سے مت گھبراؤ کیونکہ یہ تمہیں جنون سے محفوظ رکھے گا۔
- گرمیوں میں کھانا پکانے کیلئے بہترین تیل تل کا ہے۔
- سردیوں میں اخروٹ کھانا انتہائی مفید ہے۔
- آنکھوں کی تکلیف کے دوران بائیں کروٹ لیٹو اور کھجور سے اجتناب کرو۔
- نہار منہ غسل کرنے سے بلغم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
- بخار کے مریضوں کے لیے سیب سے بہتر کوئی

پھل نہیں۔
○ تازہ آلو معدے کی گرمی اور صفرا کی زیادتی کو ختم کرتے ہیں اور خشک آلو بھی زیادہ مفید ہیں۔
○ اگر لوگ کھانے پینے میں اعتدال سے کام لیں تو ہرگز بیمار نہ ہوں۔
○ ساگ کھانے سے بواسیر ختم ہو جاتی ہے۔
شجاع جعفری......تلہ گنگ

فیصلہ

ایک بزرگ کہیں جارہے تھے راستے میں چند لوگوں کو بحث کرتے ہوئے پایا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص برائی کرلے اور سچے دل سے توبہ کرلے وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔ جب ان لوگوں نے اسی بزرگ سے اسی بحث کا فیصلہ کرنے کو کہا تو وہ بزرگ فرمانے لگے کہ میں کوئی عالم تو نہیں ہوں کپڑا بننے کا کام کرتا ہوں دھاگے لمبے ہوتے ہیں اور پھر ان میں کوئی دھاگا ٹوٹ جائے تو میں اس میں اس کو گرہ لگا دیتا ہوں پھر کام کرتے ہوئے کھڈی کو چلاتے ہوئے اس گرہ والے دھاگے پر خاص نظر رکھتا ہوں کہ کہیں دوبارہ نہ ٹوٹ جائے ممکن ہے جس کی تار گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ٹو جائے اور پھر وہ اللہ پاک سے سچی توبہ کی گرہ لگا تا رہے لامحالہ مہربان رحم والا اللہ تعالیٰ اس شخص پر خاص رحمت والی نظر رکھتا ہے تا کہ پھر کہیں گناہوں کی کثرت کی وجہ سے تار نہ ٹوٹ جائے۔ سبحان اللہ۔
جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

دنیا اور آخرت سنوارنے کے اصول

✠ سچی توبہ کرنے کے بعد اللہ اور رسول کریم ﷺ کے حکموں کی پابندی۔
✠ اگر امیر اور غنی بننا چاہتے ہو تو قناعت اختیار کرو۔
✠ تقویٰ اختیار کرو گے تو بڑے عالم بن جاؤ گے۔
✠ چپکے چپکے صدقہ کرنا اور صلہ رحمی اللہ کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔
✠ سب سے بڑی برائی بداخلاقی اور بخل ہے۔
✠ سب سے بڑی نیکی اور اچھائی اچھے اخلاق صبر اور تواضع ہے۔
✠ آنسو، عاجزی اور بیماری ایسی چیزیں ہیں جس سے گناہوں کی معافی ہو جاتی ہے۔
✠ لوگوں پر غصہ کرنا چھوڑ دو، اللہ کے غصے سے بچ جاؤ گے۔
✠ دنیا کی مصیبتوں پر صبر کرنے سے دوزخ کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔
✠ اگر گناہوں سے پاک ہونا ہے تو جنابت کے بعد فوراً غسل کرلیا کرو۔
✠ عزت والا بننا چاہتے ہو تو مخلوق کے آگے ہاتھ پھیلانا چھوڑ دو۔
✠ اچھا آدمی بننا ہے تو مخلوق خدا کو نفع پہنچاؤ۔
✠ عادل بننا ہے تو پھر دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو۔
✠ طاقتور بننا چاہتے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔
✠ اللہ کا خاص بندہ بننا چاہتے ہو تو کثرت سے ذکر کرو۔
✠ رزق میں فراوانی چاہتے ہو تو ہمیشہ باوضو رہا کرو۔
✠ دعا میں قبول کروانی ہو تو حرام نہ کھاؤ۔
✠ مکمل ایمان والا بننا چاہتے ہو تو اپنے اخلاق اچھے کرلو۔
✠ گناہوں میں کمی چاہتے ہو تو کثر سے استغفار کیا کرو۔
✠ اللہ کا فرمانبردار بننا چاہتے ہو تو فرائض کا احترام کرو۔
✠ رسوائی سے بچنا چاہتے ہو تو زنا سے بچو۔
✠ اللہ کا رحم چاہتے ہو تو بندوں پر رحم کرو۔
✠ اپنی پردہ پوشی چاہتے ہو تو لوگوں کی پردہ پوشی کرو۔
✠ قیامت کے دن نور سے اٹھنا چاہتے ہو تو ظلم کرنا چھوڑ دو۔

⊕ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو جو اللہ اور رسول ﷺ کا محبوب ہے اسے اپنا محبوب بنا لو۔

⊕ احسان کرنے والا بننا چاہتے ہو تو اللہ کی بندگی اس طرح کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

فلک شیر ملک......رحیم یار خان

سفید و سیاہ

ہارون الرشید کو ایک مرتبہ ایک لونڈی کی ضرورت پیش آئی تو اس کے پاس دو لونڈیاں آئیں ایک کا رنگ کالا تھا اور ایک کا سفید۔ ہارون الرشید نے کہا مجھے تو ایک درکار ہے۔ تم دونوں میں سے اسے اپنی خدمت کے لیے رکھوں گا جو اپنے رنگ کی دوسری کے رنگ پر ترجیح ثابت کردے۔ چنانچہ سفید رنگ والی نے اپنے سفید رنگ کی کچھ خوبیاں بیان کیں۔ تو کالی نے کہا حضور دیکھیے اس کا اگر سفید رنگ ذرا سا بھی میرے منہ پر آجائے تو سب مجھے مریضہ برص سمجھیں اور اگر میرا سیاہ رنگ ذرا سا بھی اس کے چہرے پر چلا جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جائے کہ میرا رنگ تل بن کر اس کے چہرے پر چمکنے لگے۔ ہارون الرشید نے ان کی حاضر دماغی پر خوش ہو کر دونوں کو خرید لیا۔

نازسلوش ذشے......میرپور، آزاد کشمیر

خیالات

انسان دیکھے جاسکتے ہیں ٹٹولے جاسکتے ہیں۔ تم انہیں پکڑ سکتے ہو ان پر حملہ کر سکتے ہو اور قید کر کے ان پر مقدمہ چلا سکتے ہو اور انہیں تختہ دار پر لٹکا سکتے ہو لیکن خیالات پر اس طرح قابو نہیں پایا جاسکتا۔ وہ نامحسوس طریقے پر پھیلتے ہیں نفوذ کر جاتے ہیں۔ چھپ جاتے ہیں اور اپنے مٹانے والوں کی نگاہوں سے مخفی ہو جاتے ہیں۔ روح کی گہرائیوں میں چھپ کر نشوونما پاتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں جڑیں نکالتے ہیں جتنا تم ان کی شاخیں جو بے احتیاطی کے باعث ظاہر ہو جائیں کاٹ ڈالو گے اتنا ہی ان کی زمین دوز جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔

انتخاب: اشفاق شاہین......کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

❁ ایک صحت مند گداگر ایک مریض بادشاہ سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

❁ زندگی کی محبت فی الاصل موت کا خوف ہے۔

❁ عقل تجربے سے آتی ہے دانش و خرد کے مقولے حفظ کرنے سے نہیں اتی۔

❁ اکثر امرا ناخوش رہتے ہیں کیونکہ وہ تہذیب نفس کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔

❁ جس شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ تنہائی پسند ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ غیر معمولی ذہن و کردار کا مالک ہے۔

❁ غیر معمولی ذہن رکھنے والے کے دوست کم ہوتے ہیں کیونکہ اس کی باریک بین نگاہیں دوستی کے فریب کو بھانپ لیتی ہیں۔

❁ جس شخص کی ذات میں کوئی جوہر ہو اس کا شہرت حاصل کرنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ جسم کا سایہ ہونا۔

❁ مال و دولت سمندر کا شوربا ہے کہ جتنا پیو گے اتنی ہی پیاس بھڑکے گی۔

❁ بہت سے الفاظ میں کم خیالات کا اظہار جہالت ہے تھوڑی الفاظ میں زیادہ خیالات کا اظہار علمیت ہے۔

❁ ڈاکٹر انسان کی کمزوری کو وکیل اس کی خیانت کو اور مذہبی پیشوا اس کی حماقت کو خوب جانتا ہے۔

انتخاب: انجم فاروق ساحلی......

جھوٹ کی سزائیں

⌘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو (رحمت) کے فرشتے اس سے ایک میل دور ہو جاتے ہیں اس بدبو کے باعث جو جھوٹ بولنے سے پیدا ہوتی ہے (جامع ترمذی)۔

⌘ جھوٹ بولنے والے کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھا جاتا ہے (موطا امام مالک)۔

⌘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس شخص کے لیے ویل (یعنی جہنم) ہے جو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹی باتیں سناتا ہے اس کے لیے ویل ہے۔"
(ابوداؤد ترمذی)

⌘ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے (بخاری و مسلم)۔

نورالدین...... ناگرہ

اے مسکرائو نا......!

ایک بوڑھی عورت کسی گھر میں تعزیت کے لیے گئی گھر سے نکلتے وقت اس کی نظر ایک کونے میں پڑے مریض پر پڑی اسے دیکھتے ہی وہ واپس پلٹی اور گھر والوں سے بولی۔
"بڑھاپے کی وجہ سے میرے لیے چلنا پھرنا مشکل ہے لہٰذا ان صاحب کی بھی ابھی تعزیت کردیتی ہوں۔"

نفیسہ حبیب...... بستی ڈرب

اقوال زریں

+ انسان اپنی توہین معاف تو کرسکتا ہے مگر بھول نہیں سکتا۔
+ کسی کو اتنا دکھ مت دو کہ اسے جینے سے نفرت ہوجائے۔
+ جن لوگوں کو آپ کی موت غم دے سکتی ہیں انہیں زندگی میں خوشی ضرور دیں۔
+ کچھ خوابوں کو پانے کے لیے کچھ خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔
+ دوست وہ ہے جو تمہارے مزاج کے ہر موسم کو ہنس کر سہہ جائے۔
+ ہوا اور خوشبو جیسے بن جاؤ کہ جب اور جہاں جاؤ اپنا تعارف خود کراؤ۔
+ کچھ لوگ ہمیں اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ ان کے لیے سب کچھ چھوڑ دینا بھی کم لگتا ہے۔

نبیلہ ملک...... چوتالہ

مہکتی کلیاں

❁ میں اپنے حریفوں میں اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چار منٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں (نپولین)۔

❁ عقل منداور بے وقوف دونوں میں کچھ نہ کچھ عیب ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عقل منداپنے عیوب کو خود دیکھتا ہے دنیا نہیں دیکھتی اور بے وقوف اپنی عیوب کو خود نہیں دیکھتا دنیا دیکھتی ہے۔ (ڈاکٹر چارنر)۔

❁ اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں پتھریلے راستے لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔ (کیری بون)۔

❁ جس کے پاس مضبوط قوتِ ارادی ہے وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بناتا ہے۔ (گوئٹے)۔

❁ آدمی کی زندگی کا بہتر حصہ وہ ہے جس میں وہ اچھے کام کرکے بھول چکا ہوتا ہے۔ (ورڈز ورتھ)۔

❁ ایک کنجوس آدمی کی ذخیرہ اندوزی کا وہی حال ہوتا ہے جو شہد کی مکھیوں کے چھتے کا محنت مکھیاں کرتی ہیں جبکہ شہد آدمی حاصل کرتا ہے۔

❁ کردار کے بغیر علم برائی کی طاقت بن جاتا ہے۔ (گرونا نک)۔

❁ غصہ ہمیشہ حماقتوں سے شروع ہوتا ہے اور ندامتوں پر ختم۔ (ارسطو)۔

❁ خاموش رہنا اور بے وقوف شمار ہونا بول کر تمام شبہات کو دور کرنے سے بہتر ہے۔ (برناڈ شاہ)۔

❁ ماں کا دل ایک ایسا بینک ہے جہاں ہم اپنی تمام پریشانیاں اور دکھ جمع کرادیتے ہیں۔ (ڈی وٹ تانج)۔

مختار احمد...... لاہور

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

(انعام یافتہ کلام)

غزل

آنکھ سے روٹھے ہوئے خواب کا آزار سہوں
یعنی میں عشق کے آداب کا آزار سہوں
نقش درنقش کوئی مجھ میں نیا بنتا
اور میں خواہش بے تاب کا آزاد سہوں
کوئی گوہر تو مرے ہاتھ میں آلینے دو
اس سے پہلے کہ میں گرداب کا آزار سہوں
گفتگو چیرتی رہتی ہے مجھے اندر سے
کس لئے حلقہ احباب کا آزار سہوں
اشک دراشک ٹپکتا ہوا بے خوابی میں
یاد کہ خطہ بے آب کا آزار سہوں
کس لئے تشنگی دل کو ہوا دوں اسعد
کس لئے کوزہ زہر آب کا آزار سہوں

شاعر: بلال اسعد۔ سیالکوٹ

غزل

نہ دھرو ملال 'ملال' پرمرے دوستو
مجھے چھوڑدو مرے حال پر مرے دوستو
کسی روشنی سے دھلوں گا میں تو کھلوں گا میں
ابھی گرد ہے خدوخال پر مرے دوستو
یہ جو اڑرہی ہے یہاں وہاں میری دھجیاں
کوئی قرض ہے پر وبال پر مرے دوستو
میں عتاب وقت کی زد میں 'سولھد میں ہوں
کہ بوجھ تھا مہ وسال پر مرے دوستو
یہ امان دامن کا رنگ ہے' یہ جو زنگ ہے
مری تیغ پر مری ڈھال پر مرے دوستو
کوئی بوسہ گل نرم سے ابھی گرم ہے
یہ جو داغ ہے مرے گال پر مرے دوستو
یہ جو مجھ سے پوچھ رہے ہو یوں کہ میں کون ہوں
میں ہنسوں کہ روؤں سوال پر مرے دوستو

شاہد ذکی

غزل

عجب رشتہ ہے ہمارے درمیاں
قائم ہے برسوں سے
بنا ہے وہ نہ ٹوٹا ہے
نہ سچا ہے نہ جھوٹا ہے
نہ کوئی نام ہے اس کا
نہ کوئی کام ہے اس کا
کبھی اتنا قریب آتا ہے کہ کوئی
مہرباں ہو کر
کہ جیسے ساتھ برسوں کا
نبھانا چاہتا ہے وہ
مگر ایسا نہیں شاید
کبھی وہ دور ہو تو یوں
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ صدیوں کی مسافت ہے
ہمارے درمیاں حائل
مسافت ہی وہ ایسی ہے کبھی
جو کم نہیں ہوتی
مری آنکھیں برستی ہیں
یہ دھرتی نم نہیں ہوتی

شاعر: شعیب مظہر۔ اسلام آباد

غزل

کٹ گرے ہیں پھل مگر یہ ڈر ہٹا
پیڑ سے دیمک کا اک لشکر ہٹا
میں بھی دیکھوں آسماں کے پار تک
دھند کا یہ مستقل منظر ہٹا
یہ شہادت تو مرے شجرے میں ہے
میری آنکھوں سے پرے خنجر ہٹا
ٹوٹ جائیگا بدن سے رابطہ

میرے شانوں سے نہ اپنا سر ہٹا
میں بھی تیرے ساتھ چل سکتا نہیں
تو بھی اپنا مرکز و محور ہٹا
کاڑھتا ہے ایک ہی جیسے وجود
سامنے سے اب یہ کوزہ گر ہٹا
جھیل کی صورت مجھے شفاف رکھ
گرد جتنی ہے مرے اندر ہٹا
اور کس پاتال جانا ہے مجھے
دور اب مت خاک کا بستر ہٹا
کب تک فاخر اٹھانا ہے اسے
تھک گیا ہوں جسم کا پتھر ہٹا

شاعر: فاخر رضوی۔ جرمنی

غزل

زمانے بھر کو بتانے کی کیا ضرورت ہے
تو مل گیا ہے' زمانے کو بتانے کی کیا ضرورت ہے
میں ہنس پڑوں گا تو احباب جل اٹھیں گے مرے
مجھے چراغ جلانے کی کیا ضرورت ہے
ہمیں تو یوں بھی یہاں قتل ہو کے جانا ہے
تمہیں نگاہ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے
میں جانتا ہوں کہ رسماً ہی مجھ سے ملتے ہو
مگر یہ رسم نبھانے کی کیا ضرورت ہے
چراغ میرے تو ویسے بھی جل نہیں رہے ہیں
تمہیں یہ خونِ جلانے کی کیا ضرورت ہے

شاعر: زبیر قیصر

سنو!

اب قبر کھودی جا رہی ہے
میرے بے جان وجود کو
میرے ہی
بے وقعت آنسوؤں سے
غسل دیا جا چکا ہے
میرے لفظوں کے کفن سے
اب مجھے ڈھانپا جائیگا
جب مٹی ڈال کر سب چلے جائیں
تب
تم چلے آنا
گو اس بے دیپ قبرستان میں
بے نام قبر تلاشنا
ذرا مشکل ہوگا
سو تم
میرے مرقد پر نصب کتبے
کی تحریر ذہن میں رکھنا
شہید راہ الفت عاشق ناکام کا مرقد
تم اپنی جاندار نظروں کے پھول برسا کر
میری قبر کی گیلی مٹی پہ
محبت لفظ لکھ دینا
یہی میری آخری خواہش ہے

شاعرہ: عظمیٰ طور۔ لاہور

غزل

نہ سوال ہے نہ جواب ہے یہ عذاب ہے
یہ جو زندگی کی کتاب ہے یہ عذاب ہے
یہ جو بے لگام ہے رخش وقت' یہ وہم ہے
یہ جو رات دن کا حساب ہے' یہ عذاب ہے
وہ جو کچی عمر کا جوگ اٹھا کوئی روگ تھا
یہ عنوان شباب ہے' یہ عذاب ہے
وہ جو خشک ہونٹوں پہ ناچتی تھی وہ موت تھی
یہ جو کثرت مئے ناب ہے' یہ عذاب ہے
کوئی التجا بھی قبیل مینا پرست ہو
کہیں زہر ہے نہ شراب ہے' یہ عذاب ہے
کہیں ذاکر اب وہ سکون ہے' نہ جنون ہے
یہ جو اپنا حال خراب ہے' یہ عذاب ہے

انتخاب: روئے کائنات۔ کراچی

روتی آنکھیں

ہنستے لب اور روتی آنکھیں
کیسے اپنا درد چھپائیں

بول بتا
اس دنیا کے رنگین میلے سے جانے والے
تجھ کو کتنا یاد کریں اب
تیرے بنا قریہ جاں اپنا
کیونکر یہ آباد کریں اب
اندر تیری یاد کا برزخ
اور باہر یہ دنیاداری
جاں اور تن کو تو ہی بتا جا
اس دو رنگی شام و سحر سے
کب کیسے آزاد کریں ہم
ہنس کر تیری یاد مٹا لیں
یا رو کر فریاد کریں ہم
ہنستے لب روتی آنکھوں سے
پوچھ رہے ہیں
دنیا والے سمجھ رہے ہیں
ہنستے ہنستے آج بھی شاید
میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں

شاعرہ: فاخرہ گل۔ اٹلی

شعر

بیتے ہوئے لمحے یاد نہ کر
اے محبت ہمیں اور برباد نہ کر
آنکھوں کے سمندر سوکھ گئے ہیں اب
اب ان سے برسنے کی اور فریاد نہ کر

ثمن رحمان...... اکبر روڈ، کراچی

کیا لکھیں تم کو

بتاؤ کیا لکھیں تم کو
کہ لفظوں کا چناؤ بھی
بڑا دشوار ہوتا ہے
جو تم کو جان لکھتے ہیں
وفا میں خوب روتی ہیں
ہمیں آ کر یہ کہتی ہیں
کہ تم اپنے ہی قاتل کو
اپنی جان لکھتے ہو
یہ تم اچھا نہیں کرتے
تو پھر یہ سوچتے ہیں ہم
تمہیں اب سوگ لکھتے ہیں
کوئی مستقل سا روگ لکھتے ہیں
سوگ کو منانے میں
روگ کو بھلانے میں
عمر بیت جاتی ہے
روگ دینے والوں کو لوگ
بھول جاتے ہیں
بھول جانے والوں کا سوگ تو نہیں ہوتا
چلو تم ہی بتاؤ اب
بت لکھیں کہ تم کو یا کہ خدا لکھیں
اجنبی یا پھر آشنا لکھیں
اپنے ناکردہ گناہوں کی
کوئی سزا لکھیں
بتاؤ تم کو کیا لکھیں

انتخاب: وفا عباس۔ رحیم یار خان۔ شاعر نامعلوم

محبت

لباس تن سے اتار دینا
کسی کو بانہوں کے ہار دینا
پھر اسکے جذبوں کو مار دینا
اگر محبت یہی ہے جاناں
تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
گناہ کرنے کا سوچ لینا
حسین پریاں دبوچ لینا
پھر ان کی آنکھیں ہی نوچ لینا
اگر محبت یہی ہے جاناں
تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
کسی کو لفظوں کے جال دینا
کسی کو جذبوں کی ڈھال دینا
پھر اس کی عزت اچھال دینا

اگر محبت یہی ہے جاناں
تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
اندھیری نگری میں چلتے جانا
حسین کلیاں مسلتے جانا
اور اپنی فطرت پہ مسکرانا
اگر محبت یہی ہے جاناں
تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
سجا رہا ہے ہر اک دیوانہ
خیال حسن و جمال جاناں
خیال کیا ہیں ہوس کا تاناں
اگر محبت یہی ہے جاناں
تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے

شاعر: محمود سید۔ انتخاب: فہمیدہ انجم، کلر سیداں

غزل

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسن یزداں سے تجھے حسن بتاں تک دیکھوں
تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا
میں تو دل میں تیرے قدموں کے نشان تک دیکھوں
فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں
میرے ویرانہ جاں میں ترے غم کے دم سے
پھول کھلتے نظر آتے ہیں جہاں تک دیکھوں
وقت نے دھندلا دیئے تیرے خدوخال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں
دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں
اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسن انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

شاعر: احمد ندیم قاسمی۔ انتخاب: سعدیہ سعد، ساہیوال

نظم

تم گہری نیند میں بے سدھ
اپنے خوابوں کی وادی میں
بڑے آزار پھرتے ہو
تو میرے سخت ہاتھوں کا لمس
تمہارے چہرے کو چھوتا ہے
تمہاری آنکھیں
تمہارے لب
تمہاری پیشانی پر پڑے
وہ آوارہ سے بال
جنہیں میں سہلاتی تھی
وہ چہرے کے تین نقش
وہ دائیں جانب
نچلے ہونٹ سے ذرا نیچے کا تل
یا وہ ہاتھوں کے سفید نشان
میری وارڈروب کے سارے کپڑے
مجھے کفن محسوس ہوتے ہیں
میرے گلے میں پڑا پرل نیکلس
پھانسی کا پھندہ لگتا ہے
میرے ڈریسنگ ٹیبل کی پرفیومز
میرا مذاق اڑاتی ہیں
دراز میں پڑی ساری چوڑیاں
بے کار بجتی ہیں
میری حالت زار پر سب ہی
بڑے مایوس بیٹھے ہیں
تمہیں معلوم ہے جب بھی
تم گہری نیند میں بے سدھ
اپنے خوابوں کی وادی میں
بڑے آزار پھرتے ہو
مگر اے میرے ناصر!
تمہیں منانے کے سبھی گر
مجھے اب بھی نہیں آئے

نازش ذیشے، میرپور آزاد کشمیر

ضروری نوٹ: گزشتہ ماہ انعام یافتہ کلام میں غلطی سے شاعر کا نام رہ گیا یہ غزل حسن عباس کی تھی جبکہ انتخاب ذیشان ہاشمی صاحب کا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی اُسے ماحول میں حد سے بڑھی ہوئی خنکی کا احساس ہوا۔ جسم کو چیر نے والی یخ بستہ ہوا نے اسے آنِ واحد میں کپکپا کر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"اوہ میرے خدا! اب کیا ہوگا؟" اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور اسٹین لیس اسٹیل کے بمپر پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر بغلوں میں ہاتھ داب لیے تھے۔ تاحدِ نگاہ دبیز دھند جیسے بادل، طویل قامت درختوں کے سبز گیں ہیولے، چند گام تک دکھائی دینے والی تارکول کی روایتی سڑک اور پھر دور تک اس کا موہوم عکس ماحول میں رچی سنجیدگی آمیز سردی کا احساس دلا رہے تھے۔ نومبر کے وسط میں اس پہاڑی علاقے کا رخ محض وہی لوگ کرتے تھے جن کی زندگی یہاں گزرتی تھی۔ موسمِ گرما میں ہزاروں کی تعداد میں ادھر آنے والے سیاحوں میں سے اِکا دُکا برف باری کا نظارہ کرنے اس طرف آنکلتے تھے مگر وہ اس یخ بستگی سے نبٹنے کے لیے کیل کانٹوں سے لیس ہوا کرتے تھے۔

وہ بمشکل دو منٹ اسی حالت میں کھڑا موڑ اس کے بعد آنے والی اُترائی میں چھائے ہوئے اندھیرے کو گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر خود کو سنبھالا دینے کے لیے بلند آواز میں چیخا۔ "اے میرے خوب صورت جنگل! اے میرے سندر بن! میں سردی کے ڈر سے تم سے دور رہنے والا نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ بچپن سے ہی بہت ضدی واقع ہوا ہوں۔ یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے تمہاری سردی کچھ نہیں کہتی۔ مجھے ویلکم کہو۔ میں اپنے بابا سے ملنے کئی برسوں بعد تمہاری گود میں آرہا ہوں۔"

وہ پلٹ کر گاڑی میں آبیٹھا۔ پرانے ماڈل کی فور ویل جیپ کا انجن خراب ہوگیا تھا۔ ہیٹر بند ہو چکا تھا۔ چند منٹ قبل دھندلے شیشوں والی اس جیپ کا اندر گرم تھا۔ اب ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اس نے اتمامِ حجت کے طور پر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ انجن گھر گھرا کر خاموش ہوگیا۔ اس نے پھر ٹرائی کی۔ کامیابی نہیں ہوئی۔

گاڑی کے بعد موبائل فون نے بھی مایوس کر دیا۔ سگنلز کا انڈیکیٹر معدوم تھا۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی یہی حالات ہوا کرتے تھے۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا، بے پروائی سے سر جھٹکا اور عقبی حصے سے فر کا لانگ کوٹ کھینچ لیا۔ پچھلی نشست پر بے ترتیب پڑی جرابیں اور دستانے بھی اٹھا لیے۔ جب وہ شولڈر بیگ اٹھائے گاڑی سے نکلا تو کسی گیت کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ سیٹی کی آواز اسے سنائی نہیں دے رہی تھی مگر احساس کو فرحت بخش رہی تھی۔ اس نے جیپ کے بڈ پر ہاتھ پھیرا، بے سبب مسکرایا اور زیرِ لب بولا۔ "گڈ بائی جانی! اگر مجھے کوئی مستری مل گیا تو کل ملاقات ہوگی۔ یقیناً تم اداس نہیں ہوگی۔ ویسے بھی تمہیں خریدنے کا میرا فیصلہ ہی غلط تھا۔ تم بوڑھی ہوگئی ہو۔ تمہاری ٹوکن منی ہی حرام میں گئی۔"

اس نے یہ گاڑی آج ہی راولپنڈی کے ایک شوروم سے خریدی تھی۔ بیچنے والے اور شوروم کے ایجنٹ نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔ بیچنے والے کا تعلق بلتستان سے تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "دوست! میں کبھی فوکر پر سوار ہوکر اپنے وطن نہیں گیا۔ اسی جیپ پر جاتا ہوں۔ دو دنوں میں پہنچ جاتا ہوں۔ آج تک یہ راستے میں خراب ہوکر نہیں رکی۔"

شوروم پر ہونے والی گفتگو یاد آنے پر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ بھلا یہ گاڑی جو راولپنڈی سے اس کے آبائی گاؤں سندر بن تک پہنچ نہیں پائی تھی، وہ بلتستان اور گلگت کیسے پہنچتی ہوگی۔ اس کا انجن مسلسل چڑھائی کی وجہ سے گرم ہوگیا تھا۔ باوجود کہ اس نے چھرا پانی پر

نامعتبر

ناصر ملک

زندگی کے معتبر اور نامعتبر راستوں میں الجھی ہوئی زندگیاں بسا اوقات اپنی ہویت سے بھی انکار کر دیتی ہیں۔ جو کچھ کھلی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے، وہ بھی جھوٹ اور افسانوی منظر محسوس ہوتا ہے اور جو دکھائی نہیں دیتا، اس پر دل یقین کی تمام تر دولتیں لٹانے پر کمربستہ ہوتا ہے۔ یہ داستان بھی زندگی سے نبرد آزما شعلہ رو انسانوں کو درپیش آنے والے واقعات کے گرد دیوانہ وار رقص کرتی ہے اور کبھی اعتبار کے زینوں پر قدم رکھتی ہے تو کبھی بے یقینی کی دلدل میں سانسوں تک اتر جاتی ہے۔ وہ اپنی یادوں کی کھوج میں سندر بن آئی تھی اور بھیانک حالات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ سزا کے طور پر وہ جسے سونپی جا رہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل بننے جا رہا ہے۔ وہ ہاتھ سے نکل گیا تو اسے احساس ہوا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ صدیوں چلتا رہا، بے اعتباری کی آگ میں جلتا رہا مگر لب بستہ رہا۔

وہ دو مذاہب کے بیچ لٹکتے ہوئے زندگی گزار رہی تھی اور مایوس ہوئی تو روشنی کی کرن چمک اٹھی۔

اردو ادب کے معتبر قلم کار کے قلم سے ایک نامعتبر مخلص کا احوال۔

رک کر انجن میں پانی ڈالا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس نے تھرمو اسٹیٹ میٹر دیکھا تھا۔ جونہی اس نے کشمیر روڈ چھوڑا، گاڑی کا ہیٹ انڈیکیٹر خطرے کی گھنٹی بجانے لگا تھا۔ بانسرہ گلی میں اس نے تھوڑی دیر قیام کیا۔ سوئی نارمل کلر رینج میں آئی تو اس نے اپنا سفر شروع کیا۔ اس دوران اس نے قہوے کا ایک کپ بھی حلق میں اتارا تھا۔ کراچی میں پانچ سالہ قیام کے دوران اسے یہ ذائقہ نصیب نہیں ہوا تھا۔

گرم لباس پہننے سے سردی پہلی سی نہیں رہی تھی حالانکہ وہ پہلی سی ہی تھی۔ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ آہستہ روی سے سڑک کے وسط میں چلنے لگا۔ شکر تھا کہ اس کی جیپ پہاڑی کی چوٹی پر خراب ہوئی تھی اور وہ چڑھائی کے مشکل سفر سے بچ گیا تھا۔ اب اس کے سامنے اترائی کا سفر تھا جس پر قدم روک روک کر چلنا تھا۔ اس کا گھر یہاں سے دواڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر اترائی میں واقع سندر بن نامی قصبے میں تھا مگر اسے سڑک کے گھماؤ پھراؤ کے سبب سات آٹھ کلومیٹر چلنا تھا۔ اس موسم میں وہ پختہ سڑک چھوڑ کر شارٹ کٹ لینے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں تھا۔

زگ زیگ سڑک دو تین موڑ مڑنے کے بعد تقریباً نصف کلومیٹر تک ایک سیدھ میں چلی جاتی تھی۔ چونکہ اس وقت اس سڑک پر کسی بھی گاڑی کے آنے کا امکان نہیں تھا، اس لیے وہ بے پروائی سے گیارہ فٹ چوڑی سڑک کے بیچوں بیچ ٹہلنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ سڑک نے پھر زگ زیگ شکل اختیار کر لی تھی۔

سردی نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ اس نے بڑبڑا کر اپنی صفائی پیش کی۔ "کافی عرصے بعد ادھر آیا ہوں ناں...... اس لیے سردی لگ رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں عادی ہو جاؤں گا پھر سردی نہیں لگے گی۔"

دائیں ہاتھ وہی پہاڑی تھی جس پر سے وہ اتر رہا تھا جبکہ بائیں جانب سڑک کے کنارے کے ساتھ طویل قامت درختوں کے بالائی آدھے دھڑ جڑے ہوئے تھے۔ پائن کے یہ درخت سڑک سے کہیں نیچے ایستادہ تھے۔ اگر سردی اور رات کا عالم نہ ہوتا تو وہ اپنی عادت کے مطابق کسی درخت پر سے پھسل کر آن کی آن میں نیچے چلا جاتا اور ایک کلومیٹر کی مسافت بچا لیتا۔

اگلے چند منٹوں میں وہ مزید بوجھل ہو گیا۔ سانس پھول گئی۔ رک گیا۔ سڑک کے کنارے رکھے بنچ نما سفید پتھر پر بیٹھ گیا۔ لانگ کوٹ کے نیچے قمیص کی جیب سے سگرٹ کیس اور لائٹر نکالنے میں تھوڑی دقت پیش آئی۔ کیپ کے بچ بٹن کھول کر منہ اور ناک باہر نکالی اور سگرٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ گرم دھوئیں نے کسی حد تک حدت کا احساس بخشا مگر وہ جانتا تھا کہ یہ احساس نہایت عارضی ہے۔ قدرے بیزاری سے بڑبڑایا۔ "کم بخت جیپ کو بھی یہیں آ کر خراب ہونا تھا۔ اس وقت گھر جانے کے لیے مجھے کوئی سواری نہیں مل سکتی۔"

موبائل فون نکالا، کوئی بٹن پش کر کے سکرین روشن کی اور وقت دیکھا۔ ایک بجے کا عمل تھا۔ یہاں تو چھ بجے ہی رات ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بلاوجہ فون کی کنٹیکٹ لسٹ دیکھنے لگا۔ اس علاقے میں اکثر و بیشتر سیلولر نیٹ ورک کام کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ ٹورازم کے حوالے سے عالمی سطح پر شہرت رکھنے والے اس قصبے کا دنیا سے مواصلاتی رابطہ مستقلاً بحال نہیں رہتا تھا۔ سندر بن کے لوگ قریبی قصبے میں جا کر بانسرہ گلی کے کال آفس سے فون کیا کرتے تھے۔ اپنے گاؤں کی بہ یک وقت شہرت اور حد درجہ پسماندگی کے بارے سوچتے ہوئے سگرٹ کے کش پر کش لینے لگا۔ ایسے

ہی وقت میں وہ بری طرح چونک گیا۔

اسے سڑک کے کنارے بارشوں سے پیدا ہونے والے ایک قدیمی کٹاؤ میں حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے پتلیوں پر ٹھہری ہوئی نمی کو پونچھا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کٹاؤ کے اندر کوئی تھا جو سڑک پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا فوری طور پر خیال بندروں کی طرف گیا کیونکہ اس علاقے کے درختوں اور گنجان پھولدار جھاڑیوں سے ڈھکی گھاٹیوں پر عملی طور پر شریر بندروں کا راج تھا۔ پھر اس نے اپنا خیال آپ ہی رد کر دیا۔ اتنی سردی میں بندر اپنی گپھاؤں سے نکلنے کی جرات نہیں کیا کرتے تھے۔ اس نے کٹاؤ پر آنکھیں جمائے رکھیں اور سگریٹ کو اپنے کیل دار جاگرز تلے روند کر جلدی جلدی دستانہ پہننے لگا۔

اسے گہری دھند اور اندھیرے کی وجہ سے سڑک کنارے کٹاؤ میں ہونے والی حرکت نے مضطرب کر دیا تھا۔ وہ اگر بندر نہیں تھا تو یقینی طور پر بھیڑیا تھا۔ لومڑ، جنگلی سور یا گیدڑ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے علم تھا کہ بھیڑیے جوڑے کی صورت میں شکار پر نکلتے ہیں اور ویرانے میں انسان پر حملہ آور ہونے سے ذرہ بھر نہیں ہچکچاتے۔

ایسے ہی وقت میں کہر نما بادلوں کی تیز لہر اس کے اور ہیولے کے بیچ حائل ہو گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیا تو وہ ایک ذرا تھم گیا۔ دبیز دھند گویا وہیں ٹھہر گئی۔ نہ دکھائی دینے والی شئے ڈراتی ہے۔ وہ بھی ڈرنے لگا۔ اس کے اعصاب شکاری جانور کی طرح تن گئے۔ مبادا کسی لمحے کچھ ہو جائے۔ اس نے اپنے پیروں کے آس پاس دیکھا۔ فوری اسلحے کے طور پر کوئی پتھر نظر نہ آیا۔ پھر محتاط انداز میں دبے پاؤں چلتا ہوا سڑک کی دوسری سمت بڑھا۔ اس طرف چونکہ پہاڑی تھی، اس لیے کسی بھی ناگہانی صورت حال میں اس کا پستی میں گرنے کا خطرہ نہیں رہتا تھا۔ اس دھرتی کی بے محابا ناہمواریوں نے اس کی زندگی کو انہی احتیاطوں سے روشناس کرا رکھا تھا۔

اس نے ایک عمودی چٹان سے کمر ٹکائی۔ کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ تیز سرسراتی ہوا، سر بہ فلک درختوں کے پتوں کا شور اور اپنی متجاوز دھڑکنوں میں کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ خود کو نچنت رکھنے کے لیے بڑبڑایا۔ "نہیں یار! کیا ضروری ہے کہ وہ بھیڑیا ہی ہو۔ بندر بھی تو ہو سکتا ہے۔"

جنگلی بھیڑیوں کا جوڑا رات کے اس پہر اس کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، اسے اس کا بخوبی علم تھا۔ ایسے حالات میں اپنے آپ کو پرسکون رکھنا ضروری تھا۔ اس کوشش میں اس نے پھر سگریٹ نکالی۔ طلب کے بغیر سلگائی اور لائٹر ہاتھ میں تھامے رکھا۔ اس کے پیندے پر ننھا سا بلب نصب تھا جو بوقت ضرورت ٹارچ کا کام دیتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس ناکافی روشنی سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، اس نے لائٹر ٹارچ روشن کر دی۔ بیم کا رخ کٹاؤ کی طرف کیا۔ ایک طویل سانس لے کر ٹارچ بند کر دی کیونکہ اس کی روشنی محض دو اڑھائی فٹ تک فضا کو ناکافی حد تک روشن کر سکی تھی۔

گومگو کی کیفیت میں پانچ سات منٹ گزر گئے۔ نہ دھند کی دبیز تہہ چھٹی، نہ بھیڑیے کی طرف سے کوئی سرگرمی دکھائی دی تو وہ جھنجلا گیا۔ ہمیشہ جھنجلاہٹ میں اندھادھند اقدامات کیا کرتا تھا۔ اس لمحے بھی اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ چٹان کی ٹیک چھوڑی اور کٹاؤ کی طرف تیز قدموں سے چل پڑا۔ ذہن کو اندیشوں میں گھرا پا کر خود کو مزید کمزور کرنے سے بہتر تھا کہ وہ دیوانہ وار یلغار کر کے دشمن کے سر پر پہنچ جاتا۔ خودکلامی

کے سے انداز میں بولا۔ "اچھا یار! اللہ ہی وارث ہے۔ جورات قبر میں ہے وہ باہر نہیں گزاری جاسکتی۔"

اندازے کے تحت عین کٹاؤ والی جگہ پر پہنچ کر رک گیا۔ سڑک کے نیچے گہرے اندھیرے اور دھند کی سفید لہراتی لپٹوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے لائٹر ٹارچ روشن کی۔ روشنی کا ننھا سا ہالا کٹاؤ پر پھینکا۔ تربوز کے سائز کا سیاہ گولا دکھائی دیا۔ یہ بھیڑیا یا بندر نہیں ہوسکتا تھا البتہ ریچھ کا بچہ کٹاؤ میں پھنسا ہوسکتا تھا۔ ریچھ اس وادی میں نہیں تھے۔ پھر یہ کیا تھا؟ یہ دیکھنے کے لیے وہ پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ سیاہ گولے کے دونوں اطراف میں پتھر پر دو انسانی ہاتھ چپکے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ فوری طور پر سمجھ گیا کہ سیاہ گولا کسی انسان کا سر تھا۔ آنکھیں مزید پھیلائیں تو یہ بھی احساس ہو گیا کہ وہ کسی عورت کا سر اور ہاتھ تھے۔ وہ سڑک کے ٹوٹے ہوئے کنارے پر نصب پتھر پر ہاتھ جما کر سڑک پر چڑھنا چاہتی تھی مگر کسی وجہ سے تھم گئی۔ اس غیر معمولی سردی میں اس کا اکڑ جانا یا ٹھٹھر کر مر جانا زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ پھینکی اور جلدی سے اس عورت کے ایک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ شاید ماحول کی تمام تر خنکی اس ننھے سے خاک آلود ہاتھ میں سمٹ آئی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "اوہ میرے خدا! یہ تو مر گئی ہے۔"

اس نے اپنا دوسرا دستانہ اتارا، چشم زدن میں عورت کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ فی الفور یہ تعین نہ کر سکا کہ وہ بے جان تھی یا بے ہوش...... چند لمحوں بعد وہ سڑک کے کھردرے کنارے پر سیدھی تار پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن میں کوئی حرکت نہ دیکھ کر نبض ٹٹولی۔ محسوس نہ ہوئی تو سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ خوشی ہوئی کہ وہ ابھی تک زندہ تھی مگر زیادہ دیر زندہ رہتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی ڈالی تو آنکھیں ایک دم فرطِ حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ عورت نہیں، نہایت خوبصورت، جوان اور بھرپور لڑکی تھی جس کے جاندار نقوش کسی بھی دل کی دنیا کو آنِ واحد میں اتھل پتھل کر دینے کی طاقت رکھتے تھے۔ رنگت سرخی آمیز گوری رہی تھی جو اس وقت سردی کے سبب نیلگوں مائل ہو رہی تھی۔ چہرے اور گردن پر جا بجا خراشیں، مٹی سے لتھڑا مگر جدید وضع کا مختصر لباس، تراشیدہ مگر اس سے بے ہنگم نظر آتے مٹی سے اَٹے ہوئے بال...... وہ بے ساختہ بڑبڑایا۔ "نہیں یار! یہ ادھر کی نہیں ہے۔ کہیں اوپر سے اتری ہے۔ شاید جنت سے اتری ہے مگر بھٹک کر کیچڑ میں پھنس گئی ہے۔"

اپنی توجہ اس کے نیگوں ہونٹوں سے ہٹا کر اس کے تصویری وجود کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کرنے لگا۔ ایسے میں اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھی اور اس علاقے میں کیا کر رہی تھی؟ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ کوئی ٹورسٹ تھی۔ اپنی نیلگوں مائل گلابیں رنگت کی بدولت یورپین لگتی تھی۔ آسٹریلین بھی ہوسکتی تھی۔ عادتاً بڑبڑایا۔ "یہ یورپین لوگ بھی الو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ کوئی پوچھے تو بھلا کہ رات کی اس جان لیوا سردی میں یہ کیا اپنی ماں کا سر تلاش کرنے نکلی تھی؟"

اس نے لڑکی کے گال تھپتھپائے۔ دونوں ہتھیلیوں کو باری باری رگڑا۔ اپنی حدت اس کے سرد بدن میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ناکام رہا۔ وہ ہوش میں آئی نہ اس کے بدن میں موہوم سی حرکت ہی پیدا ہوئی۔ وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن ماپتے ہوئے بڑبڑایا۔ "گرم کپڑے تو پہن کر نکلتی۔ چلو گرم نہیں تھے تو کم سے کم پورے تو ہوتے...... بے حیا کہیں کی......

اب سردی کا مزہ آگیاناں؟"

اس کی بے ہوشی میں طوالت نے اسے قدرے پریشان کر دیا۔ اس کے گالوں پر قدرے زور سے چپتیں مارتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "اے لڑکی! اوئے...... ہوش میں آؤ...... اوئے!"

اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ خفت آمیز انداز میں ہنسا۔ پھر سنبھل کر اس کے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں یار! اب یہ یورپین لڑکی اُردو زبان کو کیا خاک سمجھے گی۔ انگریزی بولنا پڑے گی۔ ہیلو! آر یو لسننگ؟ کم آن ٹو دی لائف...... ہری اَپ!"

اس نے انگریزی بھی نہ سنی، نہ سمجھی۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کو فی الفور گرم جگہ پر لے جانا ضروری تھا۔ آن کی آن میں اس نے اگلا اور پچھلا سفر ماپا۔ اگر اسے اٹھا کر جیپ میں لے جاتا تو کسی حد تک سردی سے محفوظ کر سکتا تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ اتنی دیر میں تو گاڑی کا اندرونی اور بیرونی ماحول ایک جیسا ہو چکا ہو گا۔ گھر کا سفر زیادہ تھا۔ وہ لڑکی کو کندھے پر اُٹھائے آدھ یا پون گھنٹے سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنی دیر سردی میں رہنے کی وجہ سے اس لڑکی کا زندہ بچ جانا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ کیا کرے؟ سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک ایک راہ سجھائی دی۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے کنارے پوپلے منہ والے گل زیب کا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہوٹل اب بھی اسی جگہ پر ہو گا۔ وہ سیاحوں کو لوٹنے کے لیے بنایا گیا ایک موسمی ہوٹل تھا جو اپریل سے اوائل ستمبر تک چلتا تھا۔ یہاں چائے، پکوڑے اور سموسے مہنگے داموں بکا کرتے تھے۔ گل زیب موسم کے موسم کماتا اور سارا سال گھر بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ یقیناً اس وقت ہوٹل کو بند ملنا چاہئے تھا جس کی کھوکھا نما چوبی عمارت میں یا پتھروں کی بنی ہوئی ڈیوڑھی میں اس لڑکی کو لے جا کر آگ سینک سکتا تھا۔

اس نے زیادہ سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ فوراً جھک کر لڑکی کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور جھٹکے سے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ وہ اتنی وزنی نہیں تھی مگر اس وقت بھاری بھرکم محسوس ہوئی۔ چند قدم چلا، عادتاً بڑبڑایا۔ "نہیں یار! یہ تو پلی پلائی گائے ہے۔ بہت بھاری ہے۔ نجانے کیا کھاتی رہتی ہے۔"

چند لمحوں میں اس کی سانس پھول گئی۔ اس نے کندھا بدلا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ دل ہی دل میں شکر کیا کہ اسے اس حالت میں چڑھائی نہیں چڑھنا پڑی ورنہ معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں اسے پسینہ آ گیا۔ اپنے اندازے کے مطابق اس نے سڑک کا دائیں کنارہ لے لیا۔ گہری دھند کی وجہ سے چند فٹ کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے کے تحت ایک جگہ پر پہنچ کر آہستہ ہو گیا۔ یہیں کہیں اس کھوکھا ہوٹل کا کچا راستہ تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے وہ دو اڑھائی فٹ چوڑا راستہ سڑک کے کنارے سے نکل کر جھاڑیوں کے بیچ گم ہوتا دکھائی دے گیا۔ سیاحت کے موسم میں اس جگہ پر سبز رنگ کا چوبی بورڈ نصب کیا جاتا تھا جس پر سفید پینٹ سے "گل زیب ہوٹل" اور اس کی جملہ غائب و موجود تعریفیں درج ہوتی تھیں۔

کچے ڈھلانی راستے پر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے دوڑنے میں کیل دار جوگرز بھرپور مدد کر رہے تھے۔ وہ پھسلے بغیر چند ہی لمحوں میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کے عین سامنے مقفل چوبی کھوکھا، سیاہ پتھروں کا بنا ہوا دو تین فٹ بلند چبوترا اور بائیں ہاتھ پر کھولی نما احاطہ تھا جس میں بڑی مونچھوں والا گل زیب اپنے برتن رکھا کرتا تھا۔ اس نے لڑکی کو چبوترے

پر لٹایا اور کھوکھے کو لگے ہوئے تالے کا جائزہ لیا۔ تالا بہت سرد تھا۔ برف کے گولے کی طرح۔ اس نے چبوترے کی نکڑ سے پتھر اٹھایا اور دو چار کاری ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے کھوکھے کا اگلا حصہ اوپر اٹھا دیا۔ لائٹر ٹارچ کی مدد سے ایک آہنی سلاخ تلاش کرنے میں تھوڑی سی دقت پیش آئی جس کی مدد سے کھوکھے کے اگلے حصے کو چھجے کے مانند اوپر کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ چھجا پتھروں کے بنے ہوئے ٹیڑھے میڑھے چبوترے پر بھی سایہ فگن ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں لڑکی کھوکھے کے فرش پر پڑی تھی اور وہ کھوکھے میں موجود میلے چیکٹ کپڑوں کو اس کے اوپر ڈھیر کرنے میں مصروف تھا۔ تینوں دیواروں سے لٹکے ہوئے کئی برتن اور اوزار بھی اس کوشش میں لڑکی پر آن گرے۔ اسے لوہے کی موٹی چادر والا دیسی ساخت کا چولہا بھی مل گیا جس سے وہ فی الوقت انگیٹھی کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اس چولہے کو اس نے کھوکھے کے باہر سنگین چبوترے پر رکھ دیا۔

لڑکی کو قدرے محفوظ کرنے کے بعد وہ چابک دستی سے اس چھ ضرب چھ فٹ کے سالخوردہ کھوکھے سے باہر آیا۔ ادھر ادھر بھاگا۔ کھوکھے کے عقب کی اترائی میں اسے لکڑیوں کا بے ترتیب ڈھیر دکھائی دیا۔ وہ احتیاط سے نیچے اترا۔ لکڑیوں کا جائزہ لیا۔ گیلی تھیں مگر کلہاڑے کی مدد سے چیری گئی تھیں۔ ایسی لکڑیاں تھوڑی سی محنت سے آگ پکڑ لیتی ہیں۔ وہ کوئی پانچ دس کلو لکڑیاں اُٹھائے واپس آیا۔ چبوترے پر پڑے چولہے میں ترتیب سے رکھنے کے بعد لائٹر کی مدد سے آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ گیلی اور سرد لکڑیوں کو آگ نہیں لگی تو اس نے لڑکی پر پڑے ہوئے کپڑوں میں سے ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اسے شعلہ دکھا کر لکڑیوں میں گھسیڑ دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد لکڑیاں جل اٹھیں اور گہرے سیاہ رنگ کا دھواں لکیر کی صورت میں اوپر اٹھ کر دھند میں تحلیل ہونے لگا۔

اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے۔ پلو بنا کر پنکھے کی طرح آگ کو جھلا۔ چند ہی منٹوں میں لکڑیاں جل گئیں اور سرخ رنگ کے انگارے بن گئے۔ پھر اَدھ جلی لکڑیوں کو چبوترے پر رکھ کر اس نے چولہے کو کھوکھے کے اندر منتقل کیا اور لڑکی کے چہرے کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ قدرے تنگ جگہ پر بیٹھنا مشکل تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا جب اسے لڑکی کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ گندے مگر قدرے گرم کپڑوں کی حدت نے کام دکھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لڑکی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور نیلگوں عکس ختم ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ لڑکی کو پکارا۔ چپتیں رسید کیں۔ ہلایا جلایا۔ پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ نبض محسوس کی۔ یقین ہو گیا کہ وہ خطرے سے باہر آ گئی تھی اور کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتی تھی۔

اس نے مطمئن ہو کر لائٹر ٹارچ آف کر دی۔ اندھیرے نے لڑکی کا چہرہ چھپا دیا۔ چونکہ کھوکھے کی درزیں موٹے ردی کاغذوں سے بند کی گئی تھیں، اس لیے تیز سرد ہوا کھوکھے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے چوبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور لڑکی کے متوازاً ٹانگیں پھیلا دیں۔ سگریٹ سلگائی اور سوچ میں غلطاں ہو گیا۔ لڑکی پہیلی کی صورت اس کی زندگی کی اس رات میں آئی تھی۔ جب تک ہوش میں نہیں آتی تھی، پہیلی بوجھی نہیں جا سکتی تھی۔

پانچ سال پہلے جب وہ آخری بار اسی راستے پر پیدل چل رہا تھا تو دل ہی دل میں فیصلہ کر رہا تھا کہ بقیہ زندگی میں کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ اپنے بابا اور بڑے بھائی سے ناراض ہو کر گاؤں چھوڑ رہا

تھا۔ اسے ماں کے علاوہ گھر میں کسی فرد نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماں پر بھی اپنے خاوند کے درشت رویے کا دباؤ تھا ورنہ وہ روکنے پر آتی تو روک ہی لیتی۔ بابا نے اس کے پلو میں یہ الوداعی جملے باندھے تھے۔ "تم گھر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ تم سے پہلے بھی ان گنت بیٹوں نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑے ہیں۔ سبھی کو ایک نہ ایک دن لوٹنا پڑا۔ تم بھی لوٹو گے۔ مگر یاد رکھنا...... میرا خون بہت ضدی ہے۔ تمہاری رگوں میں اگر میرا خون دوڑتا ہے تو تمہاری دوڑ کا رخ زندگی بھر آگے کی طرف ہی رہنا چاہیے۔ کبھی تمہارا دھیان پیچھے کی طرف نہیں ہونا چاہیے۔"

اس نے ایک نگاہِ شکایت بابا پر ڈالی۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ دل میں تہیہ کیا۔ "بابا! تمہیں مایوسی نہیں ہو گی۔ میری رگوں میں تمہارا خون ہی دوڑ رہا ہے۔"

پھر وہ پانچ سال تک آگے کی طرف منہ کیے دوڑتا رہا۔ ماں کا چہرہ کسی پل بھولتا تو اسے یاد کرنے کی سعی کرتا۔ بہنیں یاد آتیں تو آنکھیں بھیگ جایا کرتیں مگر وہ خود کو سمجھایا کرتا کہ اسے اپنی رگوں کی کٹوریوں کا مال سچا اور حلال ثابت کرنا ہے۔ بڑھنا ہے، پلٹنا نہیں...... مگر پھر اس کی اکائی ٹوٹ گئی۔ اس کی رگوں میں فولادی خون انڈیلنے والا بابا ٹوٹ گیا۔ وہ جو کہا کرتا تھا کہ مرد کا ٹوٹنا اور جھکنا ایک ہی عمل کے دو نام ہیں۔ وہ جھک گیا تھا، یعنی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے نہ جانے کس طرح اس کے فون نمبر کا کھوج نکالا اور سلام دعا یا تمہید کے بغیر کہا۔ "تمہارے بابا کو تمہاری ضرورت ہے۔"

بس...... بابا نے خدا حافظ کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بابا کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کتنے قیمتی تھے اور انہیں ادا کرنے تک کتنا کٹھن سفر اس کے باپ نے طے کیا تھا۔ وہ پانچ سالوں سے ضد پر اڑا ہوا تھا مگر دل کے کان شاید اسی صدا کے منتظر تھے کہ اس نے کراچی چھوڑنے اور گاؤں کا قصد کرنے میں ایک دن بھی ضائع نہیں کیا۔ کراچی میں اس کے پاس سفید رنگ کی کلٹس کار تھی۔ اس پر اتنا طویل سفر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے بائی ائر اسلام آباد کا قصد کیا۔ راولپنڈی کے ایک شوروم سے پرانے ماڈل کی فور ویل جیپ خریدی۔ ایجنٹ کو ٹوکن منی دے کر اپنی تحویل میں لی اور فوری طور پر گاؤں کا رخ کیا۔ جیپ کی رگوں میں ڈیزل دوڑتا تھا، سردی میں جم گیا۔ اسے چلانے والے کی رگوں میں جذبات سے بھرپور خون دوڑتا تھا جو برف سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کی خرابی اور سیاح لڑکی سے مڈبھیڑ جیسی رکاوٹیں حائل ہو گئیں۔ پہلے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے رات کسی ہوٹل میں گزار لینا چاہیے تھی۔ اب سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کسی ہوٹل میں رک جاتا یا کسی پرانے شناسا کے گھر چلا جاتا تو اس لڑکی کے زندہ بچ جانے کے چانس زیرو ہو جاتے۔ اس نے رات نہ رکنے کا اچھا فیصلہ کیا تھا۔ شاید قسمت کو اس بدقسمت لڑکی کی یاوری مقصود تھی۔

وہ ابھی اپنے بابا کے بارے سوچ رہا تھا کہ بے ہوش لڑکی ہولے سے کسمسائی۔ وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے لائٹر ٹارچ روشن کی اور روشنی کا مدھم سا ہالا لڑکی کے چہرے پر پھینکا۔ وہ آنکھیں جھپک رہی تھی۔ وہ آگے جھکا۔ "ہے...... آر یو اوکے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آنکھیں پھاڑے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کے روشن نقطے کو گھورتی رہی۔ شاید اپنے ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہلایا جلایا۔ گال پر چپت رسید کی۔ لڑکی نے سر ادھر ادھر ہلایا اور دونوں ہاتھوں کو چوبی فرش پر ٹکا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اتنا قریب آ

گیا کہ اس کی بے ترتیب سانسیں اسے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔

وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔"آئی سے یوسم تھنگ؟"

اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ خمار بار آواز میں بولی۔"واٹ...... ہو آر یو؟"

اس نے ایک طویل سانس حلق میں اتاری۔ اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ یورپین تھی۔ رواں انگلش میں بول رہی تھی۔ مقامی ہوتی تو اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہ دیتا۔ وہ انگریزی میں بولا۔"میں کون ہوں، یہ اہم سوال نہیں ہے۔ تم کون ہو، یہ اہم بات ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم اتنی رات گئے اس ویرانے میں کیا کر رہی تھیں؟"

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ اپنی ایڑیاں تختوں میں اٹکا کر پیچھے کھسکی۔ اس کے چہرے پر خوف، سراسیمگی اور تشویش کے اثرات مدغم تھے۔ ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ ٹارچ کی روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور وہ اپنے مخاطب کا چہرہ نہیں دیکھ پارہی تھی۔ اس نے اپنے بدن سے چمٹے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں ان کے میلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ محض حدت کا احساس ہو رہا تھا۔ اردگرد دیکھا۔ جتنا ماحول ٹارچ کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا، اس کا بغور جائزہ لیا۔ ماحول سے...... یا اُس سے ڈر گئی۔ سراسیمگی چہرے پر ثبت ہو گئی۔ بولی۔"میں مرنا نہیں چاہتی...... میں بس یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو...... فار گاڈ سیک!"

اس نے اٹھنا چاہا۔ یہاں لانے والے نے بازو سے پکڑ کر آہستگی سے بٹھا دیا کہا۔"میں نے تمہیں مرنے سے بچالیا ہے۔ اگر تمہیں مارنا میرا مقصد ہوتا تو مجھے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس تمہیں سردی میں وہیں پڑا رہنے دیتا، جہاں تم پڑی تھیں۔ ڈرو مت۔ جہاں جانا چاہو گی، وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

اس کا ڈر قدرے کم ہوا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔"میں کہاں ہوں؟"

وہ مسکرایا۔"مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔ بے ہوشی سے ہوش میں لایا جانے والا ہر شخص یہی سوال کرتا ہے۔ خیر...... بتا دیتا ہوں۔ میں نے تمہیں سڑک کے کنارے نصب پتھر سے چھپکلی کی مانند چمٹے دیکھا تو اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہ چلغوزے کی لکڑی کا بنا ہوا کمرہ ہے۔ اسے ایک دکان کہہ سکتی ہو۔ گرمیوں کے موسم میں ہوٹل کا کام دیتا ہے۔ سردیوں میں بند پڑا رہتا ہے۔ شاید پہلی مرتبہ آف سیزن کھلا ہے۔ میں نے تالا توڑ کر تمہیں اس میں ڈالا ہے تاکہ تم سردی سے بچ جاؤ۔"

اس کے ہونٹ دائرے کی صورت میں پھیل گئے۔ 'اوہ' کی مدھم سی آواز ابھری۔ چند لمحے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی۔"آئی وانٹ ٹو سی یو...... پُش اسائیڈ اِٹ پلیز!"

اس کا اشارہ ٹارچ کی طرف تھا۔ اس نے ٹارچ ہٹا کر روشنی اپنے چہرے پر پھینکی۔ بولا۔"لو...... دیکھ لو......"

وہ چند لمحے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔"مگر میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم کون ہو؟"

"میرا نام احمد ہے۔ اِدھر، نیچے کی طرف، جدھر سے تم آئی ہو، ایک گاؤں ہے...... سندربن...... میں وہاں کا رہنے والا ہوں مگر اس وقت کراچی سے آ رہا ہوں۔ راستے میں میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ پیدل چلا آ رہا تھا کہ تم سڑک کے کنارے بندر کی طرح لٹکتی ہوئی نظر آ گئیں۔"

اس کی انگریزی رواں اور شستہ نہیں تھی۔ کبھی بے لاگ بولنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ چونکہ بچپن

سیاحوں سے ملنے جلنے میں گزرا تھا، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا ازخود سیکھ گیا تھا، اس لیے اپنا مدعا بیان کرنے اور اس لڑکی کی بات سمجھنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ بولا۔ ''اب تم بتاؤ، تم کون ہو؟''

وہ شاید ابھی مکمل حد تک ہوش مند نہیں تھی۔ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اپنے بدن کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بولی۔ ''کیا تم اُردو زبان بول سکتے ہو؟''

وہ چونکا۔ پوچھنے والی نے انگریزی کے بجائے اُردو میں سوال کیا تھا۔ اس کے لہجے سے یورپین تاثر یک لخت معدوم ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی ملک کی رہنے والی ہو۔ بولا۔ ''ہاں...... مگر تمہیں اُردو آتی ہے؟ حیرانی کی بات ہے۔''

''عموعی طور پر سیاح جب تین چار ماہ سے زیادہ عرصہ اس علاقے میں رہتے تھے تو انہیں ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنا آ جاتی تھی مگر اتنی روانی انہیں میسر نہیں آتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرا نام سنبل ہے۔''

احمد کے گویا ذہن میں کوئی برق بلا کوند گئی ہو۔ حیرانی سے بولا۔ ''تو کیا تم پاکستانی ہو؟''

''ہاں! مگر اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟'' لڑکی گھبرا سی گئی۔

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ ''تمہارا ٹمپریچر بڑھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بخار ہونے والا ہے۔''

سنبل نے آنکھیں بند کر لیں۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ احمد نے چولہے کی راکھ کو کریدا۔ چند ننھے انگارے دکھائی دیے جو اس غضب کی سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُٹھا اور لکڑیاں اُٹھا لایا۔ چولہے میں ڈال کر پھونکیں مارنے لگا۔ آگ بھڑک گئی تو بولا۔ ''تم لاہور سے آئی ہو؟''

''نہیں...... میں سنڈرلینڈ سے آئی ہوں۔ کیا تم نے یہ نام سن رکھا ہے؟'' احمد کے شستہ لہجے نے سنبل کے خوف کو خاصا کم کر دیا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا۔ ''انگلینڈ کا شہر ہے...... یا شاید علاقہ ہے...... کیا میں نے درست کہا ہے؟''

اس نے جواب نہیں دیا بلکہ کھوکھے کے باہر دیکھنے لگی۔ ''سنڈرلینڈ میں بہت سردی ہوتی ہے مگر نہیں...... یہاں اُس سے کہیں زیادہ سردی ہے۔ جب میں اترائی کے جنگل میں تھی تو یوں محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں خون جم گیا ہو...... آہ میرے خدا! میں زندہ ہوں...... مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ جب میں سڑک پر چڑھنے جا رہی تھی تو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل پتھر کا ہو گیا ہو اور پھر کیا ہوا؟ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ تم نے مجھ پر بہت احسان کیا کہ یہاں لے آئے ورنہ میں یقینی طور پر اب تک مر گئی ہوتی۔''

وہ مسکرایا۔ ''کیا تم عام حالات میں بھی اتنی ہی باتونی ہو؟''

وہ خاموش ہو گئی۔ احمد نے اس کے چہرے پر روشنی پھینکی۔ اسپاٹ چہرے پر کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی، ڈر رہی تھی یا نہیں، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک بٹر ٹافی نکالی اور ریپر اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ ''ٹافی منہ میں رکھ لو، کچھ توانائی مل جائے گی۔''

اس نے بلاتردد ٹافی منہ میں رکھ لی۔ شاید اس کے بازو دُکھ رہے تھے کہ اس نے دونوں ہاتھ اپنے بازوؤں پر رکھ چھوڑے تھے۔

احمد اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ تبھی

سگریٹ سلگا کر، سرکھوکھے کی دیوار سے ٹکا کر نیم دراز ہوگیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سنبل کے برعکس اس کے دل میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ یہ علاقہ اس کا اپنا تھا۔ یہاں کے ایک ایک پتھر سے اس کے بچپن کا یارانہ تھا۔
سگریٹ کا دھواں سنبل کو ناگوار لگا۔ بولی۔ ''تم یہ سگریٹ بجھا نہیں سکتے؟''
''یقیناً میں اسے بجھا سکتا ہوں مگر بجھانا نہیں چاہتا۔ تمہیں اگر اس کا دھواں اچھا نہیں لگتا تو تم کروٹ بدل کر اپنا منہ دوسری طرف کرلو۔''
''اوہ سوری...... تمہیں میری بات بری لگی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔
وہ زیرلب مسکرایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ ایسے ہی وقت میں چبوترے کی دوسری طرف اسے سیاہ ہیولا دکھائی دیا۔ اس نے ٹارچ کا رخ اس طرف کیا۔ ہیولا واضح ہونے کے بجائے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، چبوترے کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ ہیولا کسی انسان کا تھا، جانور کا نہیں تھا اور وہ یقینی طور پر چبوترے کے پیچھے ارادی طور پر چھپا تھا۔ وہ تحکمانہ انداز میں دہاڑا۔ ''اوئے! کون ہو تم؟ سامنے آؤ......''
چند ہی لمحوں بعد چبوترے کے پار ہیولا نمودار ہوا۔ ٹارچ کی دھندلی روشنی میں اس کا بالائی دھڑ دکھائی دیا۔ وہ کوئی جسیم مرد تھا اور وزنی کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے خال وخط دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاربین ٹارچ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ احمد کے دماغ میں سو والٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا، اچھے ارادے سے ادھر نہیں آیا تھا۔ چونکہ اس علاقے میں چوری ڈکیتی کی وارداتیں نہیں ہوا کرتی تھیں اور خاص طور پر رات کو اس طرف کسی کے آنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں تھا، اس لیے لامحالہ طور پر وہ لڑکی کو تلاش کرتا ہوا ادھر آیا تھا۔
احمد نے کھوکھے سے اترنے میں ثانیہ بھر کا وقت لیا مگر چبوترے کے پار کھڑے جسیم شخص نے نہ صرف اس پر کاربین تان لی بلکہ غرا کر دھمکی بھی دے دی۔ ''خبردار! جہاں ہو، وہیں رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔''
وہ رک گیا۔ اس کے عقب میں سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں زندگی میں کبھی بھی ادھر نہیں آؤں گی...... فار گاڈ سیک! مجھے جانے دو......''
احمد نے پلٹے بغیر ڈانٹا۔ ''خاموش رہو۔'' پھر مقابل شخص سے مخاطب ہوا۔ ''گن نیچے کرو۔ تم کون ہو اور وادی میں کیا کررہے ہو؟''
''بکومت...... ایک طرف ہٹ جاؤ، اگر زندگی چاہتے ہو تو...... میں اس لڑکی کو تلاش کرتا ہوا ادھر آیا ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس حرافہ نے اپنا کوئی یار بھی ادھر پال رکھا ہے۔''
احمد، سنبل اور حملہ آور کے درمیان تن کر کھڑا تھا۔ غرایا۔ ''اوئے الو کے پٹھے...... تم مجھے نہیں جانتے ہو۔ میں......''
''تم کون ہو، مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔'' اس نے خونخوار انداز میں اس کی بات کاٹی، کاربین کی نال سے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہری اپ......''
احمد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تولا۔ وہ اس سے زیادہ قدآور اور جان مند تھا۔ خوف ناک کاربین کا ایڈوانٹیج بھی اُسے حاصل تھا۔ ایسے میں اس پر غلبہ پانا مشکل تھا۔ اس کے تضحیک آمیز اشارے پر ایک طرف ہٹنا اور سنبل کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا بھی مردانگی کے خلاف تھا۔ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم اس علاقے کے

نہیں لگتے۔ کہاں سے آئے ہو؟"
"بکواس نہ کرو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ......"
اس نے اپنی دھمکی کو خطرناک بنانے کے لیے کاربین پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔
ایسے ہی وقت جب احمد گومگو کی کیفیت میں کھڑا تھا، سنبل کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔"احمد...... ایک طرف ہٹ جاؤ...... مجھے مرنے دو۔ میں ان لوگوں کے لیے مصیبت بن گئی ہوں۔ اچھا ہے، مر جاؤں۔"
اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس نے سرِدست پسپائی اختیار کرنے کی حکمت عملی اپنائی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ میدان صاف ہو گیا تو حملہ آور نے اپنی پوزیشن بدل لی۔ اس کے عین مقابل آ گیا۔ اب اسے ایک ہی وقت میں دونوں کو اپنے نشانے پر رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ بولا۔"اے حرام زادی! کھوکھے سے باہر نکل آ...... اِدھر...... اِس طرف!"
احمد نے جلدی سے کہا۔"وہ اٹھ نہیں سکتی۔ تیز بخار میں پڑی ہے۔"
حملہ آور نے ایک ہنکارا بھرا اور چبوترے کا چکر کاٹ کر کھوکھے کے شیڈ تلے آ گیا۔ احمد اس پر آنکھیں ثبت کیے اپنی حکمتِ عملی تیار کر رہا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو گیا تھا سنبل کے تعاقب میں آنے والا شخص اسے گولی مارنے کے حق میں نہیں تھا ورنہ اسے سنبل کو کھوکھے سے باہر بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے زندہ حالت میں لے جانے کے لیے آیا تھا۔
اچانک حملہ آور نے غیر متوقع حرکت کرتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور سنبل کا بازو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ جونہی وہ کھوکھے کے بڑھے ہوئے تختے سے پھسل کر زمین پر گری، احمد نے بجلی کی سی مستعدی سے چھلانگ لگائی اور کاربین بردار کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ڈھلان میں جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے لائٹر گر گیا۔ کاربین بردار کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ نیچے گرتے ہی اس نے احمد کو زوردار دھکا دے کر اپنے اوپر سے گرا دیا۔ وہ ڈھلان پر لڑھکا مگر چند قدموں کے فاصلے پر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران اس کا مقابل بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تنی ہوئی کاربین کا رخ احمد کی طرف تھا۔
"تیری تو......" اس نے دانت کچکچائے اور ٹرائیگر دبا دیا۔ احمد کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا مگر زوردار دھماکے کے ساتھ کاربین کی نال سے نکلنے والی گولی اس کے لانگ کوٹ کو چھوتی ہوئی عقب میں واقع گہری کھائی میں گم ہو گئی۔ احمد پر جنون طاری ہو گیا اور اس نے گن بردار کو بولٹ چڑھانے اور دوسری گولی داغنے کا موقع نہ دیتے ہوئے قدم بڑھایا۔ جھک کر اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑیں اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی جانب کھینچ لیں۔ اس کی پتھریلی زمین پر تشریف آوری خاصی تکلیف دہ تھی۔ ساتھ ہی احمد چھلانگ لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ اس نے پہلی ساعت میں ہی کاربین والی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ گولی چلی مگر اس کا رخ کہر بھرے آسمان کی طرف تھا۔ فائر کی دل دہلا دینے والی آواز وادی میں اپنی ڈراؤنی بازگشت چھوڑ گئی۔
گن بردار نے کلائی چھڑانا چاہی۔ منہ پر احمد کا زوردار مکا لگا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی آواز برآمد ہوئی۔ احمد کے نیچے سے نکلنے کی کوشش مہنگی پڑی کیونکہ احمد نے اپنی کہنی پوری قوت سے اس کی پسلیوں میں دے ماری تھی۔ اگر اس نے گرم کوٹ نہ پہن رکھا ہوتا تو ایک دو پسلیوں کا ٹوٹ جانا یقینی تھا۔ وہ نیچے سے غرایا۔"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......"
یوں لگتا تھا جیسے وہ انسان نہیں، گالیاں دینے کی مشین تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں

دے ڈالیں۔ ایسے ہی وقت میں اس کے سر پر زوردار آواز کے ساتھ پتھر لگا۔ وہ دردناک انداز میں چیخا۔ احمد نے اوپر دیکھا۔ سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے جسیم شخص کے سر پر سنبل کھڑی تھی۔ اسی نے پتھر مارا تھا۔ اب وہ دوسرے پتھر کی تلاش میں تھی۔ آنِ واحد میں اس کے ہاتھ میں دوسرا پتھر آ گیا۔ اس نے پوری قوت سے وہ بھی حملہ آور کے سر پر دے مارا جس کے نتیجے میں اس نے ایک ڈراؤنی آواز نکال کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ احمد نے اس کی کلائی کو مروڑا۔ کاربین ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ یقینی طور پر بے ہوش ہو گیا۔

احمد نے سنبل کو کاربین اٹھانے کا اشارہ کیا۔ وہ کاربین کی طرف بڑھی مگر بہت کم جگہ ہونے کی وجہ سے کاربین کی طرف نہ بڑھ پائی اور لاچارگی کے عالم میں رک گئی۔ احمد نے اس کی مجبوری بھانپ لی۔ ایک زوردار گھٹنا اپنے تلے دبے ہوئے گیم شیم شخص کی ٹانگوں کے بیچ مارا اور کوئی ردعمل نہ دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دایاں پاؤں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر ٹکا کر کھڑا ہوا اور جسم کو جھکا کر کاربین اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی بے احتیاطی کے سبب وہ اپنا توازن کھو سکتا تھا۔ کاربین ہاتھ سے لگی تو کھسک گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈھلان میں لڑھک کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس نے سنبل سے کہا۔ ”وہ...... لائٹر اٹھا لاؤ۔“

وہ پلٹی اور چبوترے کے پاس پڑے ہوئے لائٹر کو اٹھا لائی۔ بے ہوش پڑے جغادری پر روشنی ڈالتے ہی چلا اٹھی۔ ”اوہ...... یہ تو پربت شاہ کا کتا ہے...... اسے مار ڈالو۔ اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ نہیں...... تم نہیں...... میں خود اس کا سر کچلوں گی......“

اس پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور احمد کے روکنے اور ڈانٹنے کے باوجود اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور ہذیانی کیفیت میں چیختے ہوئے اس کے سر پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیے۔ دو چار ضربوں کے بعد چاروں شانے چت پڑے سورما کا بدن ایک ذرا دیر تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ سنبل پوری قوت سے ڈیڑھ دو کلو بھاری نوکیلا پتھر اس کی کھوپڑی میں مار رہی تھی۔ جونہی احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ جان کی بازی ہار چکا ہے، اس نے کہا۔ ”نہیں سنبل...... اب اور نہ مارو اسے۔ یہ مر چکا ہے۔“

سنبل کے مشین کی طرح چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ احمد نے دونوں پیروں کے بیچ پڑے ہوئے شخص کا بدن ٹٹولا، نبض دیکھی اور ہاتھ جھاڑ کر سنبل کی طرف بڑھ گیا۔ ایسے ہی وقت میں اس کے کانوں میں دوڑتے قدموں کی دھمک پڑی۔ وہ سنبل کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ کان لگائے۔ اترائی کی جانب سے کوئی سڑک پر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ نہ کر سکا کہ آنے والا ایک تھا یا ایک سے زیادہ افراد ادھر آ رہے تھے۔ بڑبڑایا۔ ”فائرنگ کی آواز سن کر شاید اس کتے کے ساتھی آ رہے ہیں۔“

سنبل کی جذباتی کیفیت تھم گئی تھی۔ سہمے سہمے انداز میں احمد کو دیکھنے لگی۔ احمد نے اس کے ہاتھ سے لائٹر لیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھوکھے کی عقبی سمت دھکیلتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں اس طرف جانا ہو گا۔ یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی۔“

وہ بمشکل گرنے سے بچی۔ سنبھل کر کھوکھے کے پہلو سے اترائی کی جانب بڑھی۔ احمد اس کے عقب میں تھا۔ اسے سنبل کی برہنہ پائی کا احساس ہوا، بولا۔ ”کیا تم نے جوتے نہیں پہنے ہوئے؟“

وہ رک کر بولی۔ ”نہیں......“

اسے کمر پر ہاتھ رکھ کر دھکیلتے ہوئے نہایت مدھم آواز میں بولا۔ ”نہیں یار...... رکنا نہیں......“

وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ احمد کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ ان راستوں پر تیز چلنے کی عادی نہیں تھی۔ گر سکتی تھی۔ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا اور پہلو سے نکل کر آگے آ گیا۔ بولا۔ ”تم میرے پیچھے پیچھے چلو۔ گرو گی تو میں سنبھال لوں گا۔ ہری اپ!“

قدموں کی چاپ قریب آ گئی تھی اور اب عین سر کے اوپر سنائی دے رہی تھی۔ وہ سڑک سے دس پندرہ فٹ نیچے چلتے ہوئے مسلسل سڑک سے دور ہو رہے تھے۔ ایک باہر کو نکلی ہوئی نوکیلی چٹان کے تقریباً نیچے سے جھک کر گزرتے ہوئے احمد نے رک کر سڑک کی طرف کان لگائے۔ اب ان کے بولنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں اور وہ یقیناً دو یا دو سے زیادہ لوگ تھے جو کھوکھے والے راستے پر اترے بغیر چڑھائی کی جانب عازم سفر تھے۔ انہیں فائرنگ سنائی دی تھی مگر وہ فائرنگ کی لوکیشن کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے اس لیے آگے بڑھ گئے تھے۔

اترائی میں جانے کے لیے باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ درختوں کے تنے یا شاخیں تھام کر نیچے اترنا پڑ رہا تھا جو بہت کٹھن کام تھا۔ پائن کے صدیوں پرانے درختوں کی زمین سے نکلی ہوئی جڑوں نے راستے کو بے حد دشوار گزار کر دیا تھا۔ احمد کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگ رہی تھیں اور اسے نہ صرف خود کو سنبھالنا پڑ رہا تھا بلکہ گاہے بگاہے سنبل کو بھی تھامنا پڑتا تھا۔

انتہائی گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ایک کھائی میں پہنچ کر احمد رک گیا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”یہ جگہ محفوظ ہے۔ یہاں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر اس اندھیرے اور سردی میں......“

سنبل کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ایک لمبی جڑ کا سہارا لے کر گیلی زمین پر بیٹھ گئی بولی۔ ”یہاں سردی بھی نسبتاً کم ہے۔“

احمد نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو معتدل کیا۔ ٹارچ لائٹر کی مدد سے بیٹھنے کی جگہ تلاش کی۔ بیٹھ گیا اور لائٹر آف کر کے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس اُلو کے پٹھے نے ہماری آوازیں سن لی تھیں ورنہ ہم تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔“

”یعنی ہم وہی غلطی دوبارہ کر رہے ہیں؟“ سنبل نے دانستہ اپنی آواز بہت دھیمی رکھی۔

احمد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ سنبل کی بات دل کو لگی تھی۔ کافی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے سرسراتی ہوا کے شور سے قدموں کی آہٹ یا انسانی آوازیں کھوجتے رہے مگر ناکام رہے۔

دس منٹ ایسے ہی گزر گئے۔ سنبل نے چہرہ نزدیک کیا۔ ”احمد...... مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

”اس موسم میں کسی کو بھی گرمی نہیں لگ سکتی۔“

”اُفوہ...... میرا مطلب ہے کہ مجھے پہلے سے زیادہ سردی لگ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے واقعی بخار ہو رہا ہے۔“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

”ایک جرسی دے سکتا ہوں۔ ابھی لو۔“ احمد نے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شولڈر بیگ کو جھولی میں کھینچنا چاہا مگر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا بیگ کھوکھے میں رہ گیا تھا۔

مایوسی سے بولا۔ ”میرے شولڈر بیگ میں ایک اونی جرسی تھی۔ وہ کھوکھے میں رہ گیا ہے۔ تم ادھر رکو، میں اپنا بیگ اٹھا لاؤں۔“

اس نے اٹھنا چاہا مگر سنبل نے لپک کر دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ”نہیں پلیز...... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”ڈرتی ہو؟“ اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''ہاں...... یہاں تو بہت گہرا اندھیرا ہے۔''

''اندھیرا انسان کو پناہ میں لیتا ہے۔روشنی سامنے لاتی ہے۔''اس نے دلاسا دیا۔

''نہیں ناں...... میں نے سنا ہے کہ ان جنگلوں میں لیوپرڈز بھی ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔''وہ روہانسی ہوگئی۔

''کیا ان چیتوں سے ملنے کے لیے رات کو باہر نکلی تھیں؟''

''طنز نہ کرو پلیز...... میں بہت برے حالات میں ہوں۔ان لوگوں نے مجھے قید میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے مارا بھی تھا اور......''

''کن لوگوں نے؟''وہ یکبارگی چونکا۔اس لڑکی کی کہانی تو ابھی اس نے سنی ہی نہیں تھی۔ بولا۔''تم نے کہا تھا کہ تمہیں واپس لے جانے والا پربت شاہ کا آدمی تھا۔ پربت شاہ نے تمہیں قید میں رکھا ہوا تھا؟''

''ہاں...... وہ بہت کمینہ شخص ہے۔اس کے ساتھ ایک اور بھی کمینہ رہتا ہے۔ سردار خان۔ مجھے پربت شاہ نے ایک چھوٹے سے مکان میں قید کیا تھا۔ایک گندی شکل والا بھیڑیا وہاں پہرے دار تھا۔ مجھے روٹی پانی دیتا تھا۔اس نے پربت شاہ کے حکم پر مجھے مارا بھی تھا۔ یہ چھوٹی بندوق والا ایک مرتبہ وہاں آیا تھا، مجھے روٹی دینے۔''سنبل کی آواز بھرا گئی۔اسے بہر حال خود پر اتنا اختیار تھا کہ اس نے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا تھا۔

''تمہیں ان لوگوں نے کہاں سے اغوا کیا تھا؟''احمد نے استفسار کیا۔

''نہیں...... اغوا نہیں کیا تھا۔ میں خود چل کر پربت شاہ کی حویلی میں گئی تھی۔''

''حیران کن...... اب یہ بھی بتا دو کہ تم ان کے پاس کیا لینے گئی تھیں؟''احمد کی حیرانی دیدنی تھی۔

''اوہ...... تم نہیں جانتے ناں...... اس لیے حیران ہو رہے ہو۔ کیا اب میں تمہیں پوری اسٹوری سناؤں؟''وہ ایک دم سنبھل کر بولی۔

''سٹوری تو میں سنوں گا ہی...... مگر یہ وقت موزوں نہیں ہے۔اس وقت تمہیں سردی سے بچانا ہے۔ کیا کروں؟ کھوکھے کی طرف تم نہیں جانے دیتیں اور ادھر ایسی کوئی شئے ہے نہیں جو میں تم پر اوڑھا دوں۔ کھوکھے میں کباڑ کپڑا کافی تعداد میں تھا جو میں نے تم پر ڈال دیا تھا۔اب کیا ڈالوں؟''

احمد کی آدھی سے زیادہ بات نے خود کلامی کا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ کچھ نہ سوجھا تو اپنا لانگ کوٹ اتارنے لگا۔ بٹن کھولے۔ زپ کھولی تو اس کے کھلنے کی آواز سن کر سنبل چونکی۔''کیا تم اپنا کوٹ اتار رہے ہو؟ نہیں احمد...... اب میں اتنی بھی خود غرض نہیں ہوں۔ تمہیں سردی لگ گئی تو میری رہی سہی امید دم توڑ جائے گی۔''

''کیا مطلب؟ تم نے مجھ سے کیا امید وابستہ کرلی ہے؟''وہ استعجاب سے بولا۔

''یہی کہ تم مجھے اس موت کی وادی سے زندہ سلامت نکال کر مہذب دنیا میں پہنچا دو گے۔ یہ وادی درندوں کی ہے۔ یہاں کوئی انسان نہیں رہتا اور سوائے تمہارے مجھے یہاں سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ پتہ ہے...... میں تین چار گھنٹوں سے ادھر ادھر چکرا رہی ہوں۔ کس طرف جانا ہے، کس طرف نہیں جانا ہے، مجھے پتہ نہیں چلا۔''

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہی تھی مگر کوئی نہ کوئی جملہ مقامی یا انگریزی زبان میں بول جاتی تھی۔ احمد نے کہا۔''خدا کرے کہ میں تمہاری توقع پر پورا اتروں۔ ابھی رات ہے۔ بہت پرابلم ہے۔ دن چڑھنے پر کچھ اچھا ہوجانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔''

ایسے ہی وقت میں اوپر سے ملی جلی آوازیں سنائی

دیں۔ دونوں چونک گئے۔ احمد نے سانس روک لی اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ شاید انہیں تلاش کرنے والے کھوکھے تک آن پہنچے تھے۔ احمد نے اوپر دیکھا۔ درختوں کے اوپر کہیں چکراتی ہوئی روشنی کا گماں ہو رہا تھا۔ گویا انہیں تلاش کرنے کا عمل تیزی پکڑ رہا تھا۔ احمد بزدل نہیں تھا مگر صورت حال اسے پریشان کر رہی تھی۔ اگر موبائل فون کام کر رہا ہوتا تو وہ اپنے بابا کو فون کر کے مدد لے سکتا تھا۔ ایک متلاشی قتل ہو چکا تھا۔ دوسرے تلاش کار اس کی لاش تک پہنچ چکے تھے۔ اب ان کا زخمی سانپ کی طرح پھنکارنا اور وادی کا چپا چپا چھان مارنا یقینی تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی طرح یقیناً اسلحے سے لیس ہوں گے اور اس وادی کی لاقانونیت انہیں بے دریغ ٹرائیگر دبانے کی اجازت دیتی تھی۔

ایسے ہی وقت اسے سنبل کے بدن میں کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہ سردی یا خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”سردی لگ رہی ہے یا ڈر رہی ہو؟“

”دونوں ہی...... کیا میں تم سے چمٹ کر بیٹھ جاؤں؟“

احمد جواب دینے کے بجائے اس کے قریب کھسک گیا۔ وہ خاموش اجازت کو بھانپ کر اس سے چپک گئی۔ اس کے کوٹ کی حدت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

”شیورنگ زیادہ ہو رہی ہے۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“

وہ اور قریب ہوگئی۔ ”یہی تو کر رہی ہوں۔“

احمد نے ٹٹول کر اس کی کلائی تھامی۔ ٹمپریچر زیادہ تھا۔ یہی حالت رہتی تو بہت جلد اس کا بدن تپنے والا تھا۔ احمد کا ذہن بڑی تیزی سے اس صورتِ حال سے نمٹنے کی راہ تلاش کر رہا تھا مگر کوئی ترکیب سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں کھوکھے کی جانب سے ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اے...... تم جہاں بھی ہو، سامنے آ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔“

وہ سہم گئی۔ سردی نے اسے احمد کے نزدیک کیا تھا۔ خوف نے اور قریب کر دیا۔

احمد نے اس کا ہاتھ دبایا، سرگوشی کی۔ ”ڈرو مت۔ وہ دیکھے بغیر دھمکی دے رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس طرف نہیں آئے گا۔“

سنبل نے ہولے سے سر ہلایا۔ اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو اس کے کوٹ کی بڑی جیب میں ڈال دیا۔ ایسا کرنے سے اس کا آدھا بدن احمد کی گود میں بھر گیا۔ احمد کو اس سے بے پناہ ہمدردی کا احساس ہوا۔ وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کی گود میں اپنا چہرہ چھپا رہی تھی۔ گویا خطرے سے نجات حاصل کر رہی تھی۔

احمد کا یقین دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ کوئی اس طرف اتر رہا تھا جس طرف وہ دونوں چھپے ہوئے تھے۔ اس نے سنبل کے کان سے منہ لگایا۔ ”بولنا مت، وہ اس طرف آ رہا ہے۔“

دو تین منٹ میں قدموں کی دھمک عین سر کے اوپر محسوس ہوئی۔ ایسے ہی وقت میں درختوں کے بیچ روشنی کا گولا تھرکا۔ آنے والا ان کے تعاقب میں آنے کے بجائے اوپر جا نکلا تھا۔

احمد اور سنبل نے سانسیں روک رکھی تھیں۔ دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔ انہیں دیکھ لیے جانے پر اپنے انجام کی خبر تھی۔ احمد نے خود پر چلائی جانے والی گولی کو پوری سنگینی سے محسوس کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ معمولی سی غلطی انہیں زندگی سے دور کر سکتی ہے۔ سنبل نے بتایا تھا کہ یہ پربت شاہ کے کارندے تھے۔ وہ ان کو نہیں جانتا تھا۔ لامحالہ

بات ہے کہ وہ بھی احمد سے ناشناسا ہوں گے۔ پانچ سال پہلے وادی کے حالات ایسے بالکل نہیں تھے اور یہاں کوئی بھی اجنبی رہائش پذیر نہیں تھا۔ سنبل کے پتھروں سے مرنے والا شخص احمد کے لیے اجنبی تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا، پربت شاہ نے اسے کیوں رکھا تھا، اسے اندازہ نہیں تھا۔

درختوں کے بیچ چکراتا ہوا بیم لائٹ کا ہالہ ان کے اطراف کی زمین تک پہنچا۔ چونکہ لائٹ کے پیچھے دیکھنے والا اوپر کھڑا تھا، اس لیے گہری دھند میں جھاڑیوں تلے چھپے ہوؤں کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ ایسے میں اس نے چیخ کر کہا۔ "اے لڑکی! میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ فوراً باہر نکل آؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

سنبل کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ احمد نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کان میں کہا۔ "احمق ہو گیا؟ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے تمہیں دیکھ لیا ہوتا تو دھمکانے کے بجائے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔"

سنبل ساکت ہو گئی۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ ایسے میں فضا فائر کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔ گولی جس جھاڑی کو لگی تھی، وہ ان سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں۔ تینوں گولیوں کا ٹارگٹ مختلف تھا۔ وہ اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا۔ ایسا کوئی اندھا تیر ان میں سے کسی کا سینہ بھی چاک کر سکتا تھا۔

گولیاں چلانے والے نے گالیوں کے جلو میں پھر سنبل کو پکارا۔ کوئی مصلحت آڑے تھی یا اس کے دل میں گھنی جھاڑیوں میں اترنے کا حوصلہ نہیں تھا کہ اوپر ہی کھڑا رہا تھا۔ کھوکھے کی جانب سے ایک آواز بلند ہوئی۔ "نوری...... کچھ نظر آیا؟"

نوری کو کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ بولا۔ "نہیں...... وہ ہتے کی بچی اس طرف نہیں آئی۔ کسی اور طرف نکل گئی ہے۔ میں واپس آ رہا ہوں۔"

اس کے ساتھی نے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر وہ دکھائی نہیں دی تھی تو فائرنگ کی آواز کیوں سنائی دی تھی۔

قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ واپسی کی راہ پر چل دیا تھا۔ ایسے میں ایک گڑبڑ ہو گئی۔ اس کا پیر کسی پتھر یا گیلے پتوں پر سے پھسل گیا تھا اور احمد کے عین سر کے اوپر عجیب سا شور برپا ہو گیا۔ چند پتھر ڈھلان میں لڑھک آئے۔ وہ بھی اترائی میں لڑھک آیا تھا جو سنبل کو تلاش کر رہا تھا۔ دل کو ڈراتی ہوئی آوازوں کا جلوس اسی درخت کے موٹے تنے کی طرف آ رہا تھا جس کی جڑوں میں اُگی ہوئی گھنی جھاڑی میں احمد اور سنبل دبکے ہوئے تھے۔

احمد نے خطرے کو فی الفور بھانپ لیا اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ سنبل کے ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں دھنسے تھے۔ وہ گرتے گرتے بمشکل سنبھل پائی۔ عین اسی وقت ایک زوردار آواز گھاٹی میں گونجی۔ کسی ٹھوس آہنی شے کے پتھر سے ٹکرانے کی آواز......

یوں لگا کہ نوری کے ہاتھ سے اس کی گن چھوٹ کر گر گئی تھی۔ یہی پرہیبت آواز دو تین مرتبہ سنائی دی اور نوری سے پہلے ہی اترائی میں لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ چونکہ اندھیرے میں اسے دیکھ لینا ممکن نہیں تھا، اس لیے احمد نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

احمد کے کھڑا ہوتے ہی سنبل بھی کھڑی ہو گئی۔ پہلو بدل کر اس کی پشت پر آ کر چپک گئی۔ احمد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایسے میں اچانک پائن کے موٹے تنے والے درخت کے ساتھ کوئی شے آن ٹکرائی۔ احمد نے جھاڑی کی شاخوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ نظر نہ آیا۔ چند لمحوں بعد کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ نوری تھا جو لڑھکتا ہوا عین اسی درخت کے تنے سے

آن ٹکرایا تھا۔ احمد نے برقی مستعدی سے شاخیں ہٹائیں اور چیتے کی طرح نوری کی طرف لپکا۔ شاخیں یا درخت کی برہنہ جڑ پیروں میں الجھ گئی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے جھاڑی میں گر گیا۔ اگر نشیب میں ہوتا تو کئی گز تک لڑھکتا چلا جاتا۔ جونہی اس نے سر اٹھایا، دائیں بائیں دیکھا، نوری کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ گٹھڑی بنا جھاڑی تلے پڑا تھا۔

احمد کی پیشانی پر چوٹ آئی تھی مگر یہ وقت اس کی پروا کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے اٹھنے اور نوری پر چھلانگ لگانے میں ثانیے بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔ نوری اس کے جسم تلے دب کر کراہنے لگا اور حواس باختہ ہو کر اس کے نیچے سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ کراہوں کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے گالیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ اس کا لب ولہجہ مقامی تھا۔

احمد نے دایاں گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مارا۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے احمد کو ایک طرف دھکیل دے مگر احمد نے اس کا ارادہ بھانپ کر اپنی ٹانگیں درخت کی ایک جڑ میں الجھالیں اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ کاربین بردار کی طرح لحیم شحیم نہیں تھا مگر گیا گزرا ہوا بھی نہیں تھا۔ اس نے لانگ کوٹ میں چھپے ہوئے احمد پر مکے برسانا شروع کر دیے لیکن اس کا کوئی وار کارگر نہیں تھا۔ زوردار مکا مارنے کے لیے بازو کو جتنی کھلی جگہ کی ضرورت تھی، اتنی جگہ اسے میسر نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے حلق سے خرخراہٹ نکلنے لگی۔ احمد نے اپنے بدن کی پوری قوت اپنے ہاتھوں میں سمودی تھی۔

احمد چاہتا تھا کہ اسے اسی حالت میں جہانِ فانی سے رخصت کر دے مگر نوری کا جسم آخری جنگ سمجھ کر اس بری طرح تڑپا کہ نہ صرف اس کے دونوں ہاتھ گردن پر سے چھوٹ گئے بلکہ وہ خود بھی ایک طرف جا گرا۔ جڑوں میں پھنسے ہوئے پاؤں میں موچ آ گئی۔ درد کی شدت سے اس کے حلق سے کراہ خارج ہوگئی۔ ایسے ہی وقت سنبل سے غلطی سرزد ہوگئی۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "احمد! کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہوناں؟"

اس نے بے دھیانی میں اپنی آواز کو قدرے بلند رکھا تھا۔ نوری کے گرنے اور چیخنے کی آوازوں اور سنبل کے استفسار نے نوری کے ساتھی کو خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ وہ 'نوری نوری' پکارتا ہوا اس طرف چل پڑا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تو احمد کے بدن میں نئی جان پڑ گئی۔ اس نے پھنسا ہوا پاؤں نکالا اور غیر معمولی پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ باوجود زخمی ہونے کے نوری اس سے پہلے اٹھ چکا تھا۔ اس نے چلاتے ہوئے پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ کولہے میں پڑنے والی دوسری ٹھوکر نے اسے پستی میں لڑھکنے پر مجبور کر دیا۔ اگر وہ دفعتاً جھاڑی کی شاخیں نہ تھام لیتا تو اب تک کئی گز نیچے کھسک گیا ہوتا۔

نوری اس پر جھکا۔ اس کا مکا احمد کی پیشانی پر لگا۔ اسی جگہ پر کچھ دیر قبل چوٹ لگی تھی۔ گومڑ بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ سر کو دائیں بائیں پٹخ کر حواس بحال کرنے کی کوشش کی مگر اس دوران نوری نے جیسے مکوں کی مشین چلا دی تھی۔ یکے بعد دیگرے سر میں پڑنے والی خطرناک ضربوں نے احمد کے اوسان خطا کر دیے۔ اپنی پوری قوت بروئے کار لاتے ہوئے وہ چیخا۔ "سنبل! بھاگ جاؤ......"

نوری کے ساتھی کے قدموں کی چاپ قریب آ گئی تھی۔ احمد کی چیخ سن کر نوری ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس نے پلٹ کر جھاڑی کے پار دیکھنے کی

کوشش کی۔ سنبل دکھائی نہیں دی مگر پتہ چل گیا کہ وہ جھاڑی کے اندر ہی کہیں دبکی ہوئی تھی۔ نوری اور اس کے ساتھیوں کو وہی مطلوب تھی۔ اس نے احمد پر سے نگاہ ہٹانے کی غلطی کر لی تھی اور اسے یہ غلطی بہت مہنگی پڑی۔ دو تین سیکنڈز کی مہلت پا کر احمد نہ صرف کسی حد تک سنبھلنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ شاخوں کا سہارا لے کر چابک دستی سے نوری کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پوری قوت سے نوری کی ناک پر مکا رسید کیا۔ نوری نے غیر ارادی طور پر سر کو گھمایا۔ ناک بچ گئی مگر کنپٹی مکے کی زد میں آ گئی۔ ضرب بہت زوردار تھی۔ احمد کا ہاتھ جھنجنا کر رہ گیا تھا۔ نوری کٹے ہوئے شہتیر کی مانند لہرایا۔ درخت کے تنے کو تھام کر گرنے سے بچا مگر دونوں ٹانگوں کے بیچ پڑنے والے احمد کے گھٹنے نے رہی سہی کسر نکال دی۔ نوری 'اوغ' کی کریہہ آواز برآمد کرنے کے بعد جونہی دونوں ہاتھ ٹانگوں میں دبا کر جھکا، احمد کی کہنی گرز کی طرح اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لگی۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ احمد سے ٹکرایا اور پہلو کی جانب گر گیا۔

اس طرف اترائی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود نہ پاؤں زمین پر ٹکا سکا اور نہ کوئی شاخ یا جڑ ہی پکڑ سکا اور لحظہ بھر میں احمد کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ گہرائی میں جاتے والے نوری کے ساتھ ان گنت چھوٹے بڑے پتھر بھی لڑھک رہے تھے جن کی مہیب صدائیں وادی میں گونج رہی تھیں۔ وہ جس طرف گرا تھا، اس طرف تقریباً ڈیڑھ سو میٹر نیچے ایک ننھی سی ندی واقع تھی۔ اگر نوری زندہ بچ بھی جاتا تو اس کا چار چھ گھنٹوں سے قبل ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے اس جگہ پر واپس آنے میں کم و بیش چھ کلومیٹر کا چکر کاٹنا پڑتا کیونکہ وہ خطرناک عمودی چڑھائی کی وجہ سے براہ راست اوپر نہیں آ سکتا تھا۔

ایک خطرہ ٹل گیا تھا۔ دوسرا سر پر آن پہنچا تھا۔ نوری کا ساتھی بہت قریب آ گیا تھا۔ احمد کے کان اس کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً نوری کو پکارتا ہوا تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ نوری کی جانب سے جواب نہ پا کر سخت بھنایا ہوا تھا اور ناقابلِ اشاعت گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔

سنبل کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔ ''احمد! اس کا ساتھی نزدیک آ گیا ہے۔ تم ادھر آ جاؤ۔''

قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ احمد اور سنبل کے نقشِ پا پر چلتا آ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں جھاڑی سے پانچ سات قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ بلند آواز میں بولا۔ ''اوئے نوری کے بچے! کہاں ہو تم؟''

اس کی آواز خاصی بھاری اور کرخت تھی۔ اس نے پھر نوری کو آواز دی۔ پھر گن کا بولٹ چڑھنے کی آواز ابھری۔ احمد اور سنبل نے سانسیں روک لیں۔ وہ کم بخت اندھیرے میں گولیاں چلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گولی اندھی ہوتی ہے۔ اس غضب کے اندھیارے میں گولی چلانے والا بھی اندھا تھا۔ احمد نے زیرلب کہا۔ ''خدا خیر کرے......''

وہ دونوں درخت کے دونوں اطراف میں کھڑے تھے۔ احمد دبے پاؤں تنے کی اوٹ میں پہنچا۔ ہاتھ بڑھا کر سنبل کو لباس سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ اب وہ اندھی گولیوں سے وقتی طور پر محفوظ تھے۔ نوری کا ساتھی چند منٹ تک جھاڑی کے باہر ایک تکونے پتھر پر کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور نوری کو آوازیں دیتا رہا۔ اس کے پاس بیم لائٹ نہیں تھی یا اس وقت اس کا دھیان لائٹ آن کرنے کی طرف نہیں گیا تھا۔ مایوس ہو کر حلق کے بل چیخا۔ ''اوئے نوری کے بچے...... اوئے نوری...... تم کہاں ہو؟''

نوری بے ہوش تھا یا وہاں تھا، جہاں اس کے ساتھی کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ مایوس ہو کر وہ پتھر سے اترا۔ واپس جانے کے بجائے پیش قدمی پر آمادہ نظر آیا۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شاید جھاڑیوں کے اندر اترنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ ایسے میں ایک کھٹکا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے اسے ٹھوکر لگی ہو۔ پھر اس کی خود کلامی ابھری۔ "یہ تو نوری کی رائفل ہے...... وہ خود کدھر گیا؟"

احمد کی حالت دِگرگوں تھی۔ سر کی چوٹیں اور پاؤں کی موچ تکلیف دے رہی تھی۔ تلاش کار کی اتنی قریب موجودگی پر جان الگ خطا ہو رہی تھی۔ نجانے کس وقت کیا ہو جائے، یہ ڈر اسے بھی لاحق تھا اور سنبل کے رگ و پے میں بھی سرایت کر چکا تھا۔

نوری کی بندوق کے ملتے ہی شاید اس نے واپسی کا ارادہ موقوف کر دیا تھا۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ نوری یہیں کہیں گرا تھا۔ جواب نہیں دے رہا تھا تو یقیناً بے ہوش تھا یا قفسِ عنصری سے آزاد ہو چکا تھا۔ دونوں صورتوں میں اسے تلاش کرنا ضروری تھا۔

احمد کی تمام تر احتیاط اکارت چلی گئی۔ سر سراتی ہوا اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ سنبل کے حلق سے نکلنے والی تیز سسکی نے نوری کے ساتھی کو چونکا دیا۔ اس نے گن سیدھی کی غرایا۔ "ادھر کون ہے؟"

احمد نے جلدی سے سنبل کو تھاما۔ اس پر برسنے کا فائدہ نہیں تھا۔ سرگوشی میں مستفسر ہوا۔ "کیا ہوا؟"

وہ تھام نہ لی جاتی تو یقیناً پشت کے بل گر جاتی۔ اب سنبھل گئی تھی۔ اپنے پاؤں پر جھک گئی۔ ہکلا کر بولی۔ "وہ...... وہ کسی کیڑے...... نن...... کاٹ لیا ہے......"

"اوہ......!" احمد گھبرا سا گیا۔ اس وادی میں گہرے نیلے رنگ کے فربہ اندام زہریلے بچھوؤں کی بہتات تھی۔ ان کا زہر سانپ سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتا تھا۔

ایسے میں نوری کے ساتھی نے سوال دہرایا۔ جواب نہ پا کر کرخت لہجے میں بولا۔ "اے! تم فوراً جھاڑی سے نکل آؤ نہیں تو میں پوری جھاڑی کو اُڑا کر رکھ دوں گا۔"

وہ سہم کر احمد سے چمٹ گئی بولی۔ "اب کیا ہوگا؟"

احمد نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرایا اور اپنی توجہ نووارد کی طرف مرکوز رکھی۔ اس نے مزید سخت انداز میں دھمکی دی۔ کوئی ردعمل نہ پا کر اس نے اندھیرے میں یکے بعد دیگرے چار فائر داغ دیے۔ ایک گولی درخت کے تنے میں لگی۔ دوسری چنگاریاں جھاڑی کی شاخیں چھیل کر گیلی مٹی میں دھنس گئیں۔ احمد درخت کے تنے کی آڑ میں رہ کر نیچے جھکا۔ خوش قسمتی سے ایک ننھا سا پتھر ہاتھ لگ گیا۔ اس نے ہاتھ نکالا اور اندازے کے مطابق گن بردار کو دے مارا۔ نشانہ خطا گیا۔ جواب میں وہ غرایا۔ "اوئے...... بھتنی کی اولاد...... میں سمجھ گیا ہوں تم سنبل ہو۔ آخری بار کہہ رہا ہوں کہ باہر نکل آؤ نہیں تو......"

اس نے ایک غلیظ گالی دی اور پھر اوپر تلے دو فائر داغ دیے۔ وہ مختلف زاویوں پر فائر کر رہا تھا۔ نہ دکھائی دینے والی کو چھلنی کرنا چاہتا تھا۔ احمد نے دوسرا پتھر اٹھانے کی کوشش کی۔ پتھر نہ ملا۔ اپنے ساتھ چمٹی ہوئی سنبل کے کان میں بولا۔ "تم یہیں کھڑی رہو۔ میں اس طرف سے نکلتا ہوں اور اس بے غیرت کے عقب میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

سنبل نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ "نہیں احمد...... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ وہ تھم گیا۔ گاہے بگاہے سنبل کے منہ سے برآمد ہونے والی 'سوں سوں' کی

آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کیڑے کے کاٹنے کے سبب تکلیف میں تھی مگر غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ احمد کا ذہن بیک وقت حملہ آور سے نبرد آزمائی اور سنبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حملہ آور سے فی الفور چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دیر ہوجانے کی صورت میں سنبل کے پورے جسم میں زہر سرایت کر جائے گا۔ اس صورت میں وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہے گی۔

اس نے ایک دم اپنی حکمت عملی بدلی اور سنبل کو خود سے علیحدہ کر کے درخت پر چڑھنے لگا۔ پائن کے سیدھے تنے پر چڑھنا عام آدمی کا کام نہیں، مگر وہ عام نہیں تھا۔ اسی وادی کا پروردہ تھا۔ اس کے ایک ایک راز کا امین تھا۔ بندر کی سی مستعدی سے دس فٹ کے لگ بھگ اونچا اٹھ گیا اور ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی سوکھی اساس پر پیر ٹکا کر کھڑا ہوگیا۔ اندھیرے میں حملہ آور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ناکام رہا۔ سوچنے لگا کہ اسے فائر کرنے پر کیسے اکسائے۔ اگر وہ کوئی شاخ توڑتا تھا تو اس کی لوکیشن عیاں ہوتی تھی۔ ایسے میں قسمت نے اس کی مدد کردی کہ اسے از خود فائر کرنے کا خیال آگیا تھا۔

اس نے برسٹ لیور کھینچا اور ٹرائیگر دبا کر گن کو دائیں بائیں گھما دیا۔ ریٹ...... ریٹ...... کی کان پھاڑ آواز نے وادی کو دہلا کر رکھ دیا۔ گولیوں نے جھاڑی کا چپا چپا چھیل کر رکھ دیا تھا۔ درخت کی مخصوص لرزش سے احمد کو پتہ چلا کہ چار پانچ گولیاں تنے میں پیوست ہوئی تھیں۔ گن بردار نے ٹرائیگر پر سے انگلی اس وقت ہٹائی جب 'ٹرچ' کی مخصوص آواز سنائی دی۔ گن کی میگزین یا بیلٹ خالی ہوگئی تھی۔ احمد نے فائر فلیمنگ کی وجہ سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھاڑی کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر نوری کی گن اٹھائی۔ اپنی گن کو کندھے پر لٹکایا۔ اس تبادلے کے درمیان کی مختصر مہلت سے احمد فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے تاخیر نہیں کی اور تنے پر پاؤں ٹکا کر پوری احتیاط کے ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس کا ارادہ گن بردار پر گرنے کا تھا مگر اندازے کی تھوڑی سی چوک کے سبب وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن پر گرا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ غالباً ہاتھ پر چوٹ لگی تھی کیونکہ اس کے حلق سے کراہ کے ساتھ 'کون ہے۔ تیری تو......' کی خرخراتی مگر تحیر آمیز آواز برآمد ہوئی۔ احمد پہلو کے بل اس کے قدموں میں گرا۔ موچ والے پاؤں میں ٹیس اٹھی مگر اس کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے وہ برقِ بلا کی طرح اچھلا اور گن بردار پر چڑھ دوڑا۔ اس نے کندھے پر لٹکتی ہوئی بندوق سمیت اسے بانہوں میں جکڑ لیا اور رگیدنے لگا۔ جگہ کم تھی۔ دونوں اوپر نیچے پتھروں پر گرے۔ وہ پہل کر گیا۔ اس نے احمد کے پیٹ میں زوردار مکا جڑا اور بے پناہ تیزی سے اسے دونوں ہاتھوں پر اچھال دیا۔ وہ اس کے پہلو میں منہ کے بل گرا۔ کوئی پتھر گال میں چبھ گیا۔ درد کی کٹیلی ٹیس پورے بدن میں پھیل گئی۔

وہ ناگ کی طرح پھنکارا۔ پھیلے ہوئے ہاتھ کو دائیں بائیں گھمایا۔ ایک پتھر ہاتھ لگ گیا۔ اٹھتے ہوئے گن بردار کو دیکھے بغیر دے مارا۔ اس کے گھٹنے پر لگا۔ وہ 'ہائے' کی آواز نکال کر جھکا۔ ساتھ ہی اس نے کھڑی ہتھیلی کا خطرناک وار کیا۔ احمد کی گردن بچ گئی۔ کندھا جیسے ٹوٹ گیا۔ بازو آنِ واحد میں شل ہوگیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا پتھر پھر گھمایا۔ گن بردار کے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے بدن کے کسی نہایت حساس حصے پر چوٹ لگی تھی۔ احمد نے اس کے بعد اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور پے در پے پتھر مار

مار کر چاروں شانے چت کر دیا۔ اسے قطعی طور پر دھیان نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا پتھر گن بردار کو کہاں لگ رہا تھا۔ وہ جونہی لہرا کر گرا، احمد اس کی چھاتی پر چڑھ گیا۔ اس نے پتھر والا ہاتھ اٹھایا اور پوری قوت سے اس کی پیشانی پر دے مارا۔ اس کا بدن گویا آخری مرتبہ پھڑکا پھر ساکت ہو گیا۔ احمد نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ دھڑکن محسوس کی۔ وہ زندہ تھا مگر اب تب میں رخصت ہونے والا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نہیں روکا اور اس کی کھوپڑی پر پتھر مار مار کر اس کا آخری سفر آسان کر دیا۔

احمد تھک گیا تھا۔ پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لاش کے کندھے اور گردن کی وادی میں ٹک گیا تھا جبکہ وہ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے نڈھال انداز میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔ آنکھیں نم تھیں۔ سر اور موچ زدہ پیر کے بعد کندھے سے بھی درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ کئی لمبی لمبی سانسیں لے کر اٹھا۔ دانت کچکچائے اور پاؤں کی زوردار ٹھوکر چت پڑے سورمے کی پسلیوں میں رسید کی۔ وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو چکا تھا، اُسے کیا ہونا تھا، احمد کے اپنے حلق سے سسکاری نکلی۔ وہ جوش میں اسی پاؤں کو حرکت دے بیٹھا تھا جس میں موچ آئی تھی۔

اس نے چھوٹی نال والی گن مردہ کندھے سے کھینچی، اس کی میگزین نکال کر دیکھی۔ خالی تھی۔ اس نے جھک کر منہ سے آخری خرخراہٹ نکالنے والے کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس فالتو میگزین یا گولیاں نہیں تھی۔ چھوٹے سائز کا پسٹل برآمد ہوا۔ اس کے میگزین میں چار گولیاں تھیں۔ یہی بہت تھیں۔ اس نے پسٹل کو اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا اور گن کو پھینک کر جھاڑی کی طرف بڑھا۔ ایسے میں سنبل نے پکارا۔ ”احمد...... احمد......

تم ٹھیک تو ہونا ں؟“

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”ہاں! میں ٹھیک ہوں اور اب تمہاری طرف آ رہا ہوں۔“

چند لمحوں بعد وہ سنبل کے پاس تھا۔ ”کم بخت خاصا سخت جان تھا۔“

سنبل بولی۔ ”تم نے اسے مار دیا؟“

”ہاں! جس کے ہاتھ میں گن آ جاتی ہے، وہ زورِ بازو پر لڑنا بھول جاتا ہے۔“

جواب میں سنبل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ تکلیف میں تھی۔ احمد نے پوچھا۔ ”درد کم ہوا؟“

وہ بولی۔ ”ہاں! کم ہو گیا مگر ابھی ختم نہیں ہے۔“

اس نے لائٹر نکالا۔ ٹارچ روشن کی۔ سنبل کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ ”کیڑے نے کہاں کاٹا تھا؟“

وہ بھی بیٹھ گئی۔ بائیں پاؤں کے ٹخنے کی طرف اشارہ کیا۔ احمد نے ٹارچ کی روشنی میں ٹخنہ دیکھا۔ ننھا سا سرخ دائرہ دکھائی دیا۔ زمین پر روشنی ڈالی۔ سنہرے رنگ کے چند چیونٹے دکھائی دیے۔ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”فکر کی بات نہیں۔ چیونٹے نے کاٹا ہے۔ تھوڑی دیر میں رہا سہا درد بھی ختم ہو جائے گا۔“

احمد نے اسی حالت میں بیٹھے رہ کر اپنے موچ والے پاؤں کو دبایا۔ درد میں کچھ افاقہ ہوا۔ پھر ٹانگیں پسار کر، درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ایک لمبا کش سینے میں اتارا۔ ہلکی کھانسی آئی۔ سنبل اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ہمدردی آمیز لہجے میں بولی۔ ”سگریٹ نہ پیا کرو۔ کینسر ہو جاتا ہے۔“

”آئی ڈونٹ کیئر......“ اس نے بے پروائی سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ اس

کے ہاتھوں دو یا تین افراد قتل ہو گئے تھے۔ وہ زندگی میں کبھی عام نوع کے بھی کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ کجا، ایک رات میں تین قتل...... سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ ابھی رات کا بڑا حصہ باقی تھا۔ کیا ساری رات ایسے ہی مارا ماری میں گزرنے والی تھی؟ ان جانکاہ حالات سے بچنے کی کیا ترکیب کی جا سکتی تھی؟ دفعتاً اس نے سوچا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے اور وہ سنبل کو لے کر اپنے گھر چلا جائے مگر ساتھ ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ سنبل کے تین تلاش کاروں کا تیا پانچہ ہو چکا تھا۔ اس کی تلاش میں کتنے افراد وادی میں گھوم رہے تھے، اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے از روئے احتیاط سنبل سے دریافت کیا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے تعاقب میں کتنے افراد نکلے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں...... مجھے تو ان کے بارے میں بھی علم نہیں تھا۔''

''کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟''

سوال غیر ضروری تھا۔ سنبل نے جواب دیا۔

''پربت شاہ کے پاس ایسے بندوں کی کمی نہیں ہو گی۔''

پربت شاہ کا نام ایک بار پھر اس کی زبان پر آیا تھا۔ حیرانی سے بولا۔ ''پربت شاہ کو تم سے کیا پرخاش ہے؟''

''کوئی نہیں۔''

''پھر یہ ڈنڈا ڈولی کیوں ہو رہی ہے؟'' اس کا لہجہ قدرے طنزیہ تھا۔

''میرا یہاں سے جانا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ہر صورت پر مجھے پکڑنا چاہے گا۔''

اس نے احمد کے طنز کو اہمیت نہیں دی تھی۔

''میں پانچ سال پہلے والے پربت شاہ کو جانتا ہوں۔ اس وقت وہ ایسا نہیں تھا۔'' احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں نے گزشتہ چند دنوں میں اسے جتنا دیکھا ہے، کافی ہے۔ وہ اس دنیا کا سب سے بڑا شیطان ہے۔ کیا تم میری بات پر یقین کرو گے؟'' سنبل کے لہجے میں زہر بھر گیا۔

اس نے آہستگی سے کہا۔ ''میرے پاس تمہاری بات کو رد کرنے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے۔''

باتوں کے دوران وہ احمد کے بہت قریب کھسک آئی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کوٹ کی جیبوں میں ڈال دیے تھے۔ احمد کو اپنے چہرے پر اس کی سانسیں محسوس ہوئیں۔ عجیب سی کیفیت بیدار ہوئی۔ بولا۔ ''بہتر ہو گا کہ تم مجھ سے تھوڑا فاصلہ کر لو۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں پلیز! بہت سردی ہے اور میرا جسم دکھ رہا ہے۔ تمہارا کوٹ بہت گرم ہے۔ مجھے سکون دیتا ہے۔''

وہ سردی کو بھولے بیٹھا تھا حالانکہ وہ مسلسل اپنا آپ دکھائے جا رہی تھی۔ اس نے سگریٹ پی لی تھی، بجھائی، اپنے جاگرز کے تسمے کھولے اور جرابیں اتار کر سنبل کو دے دیں۔ ''انہیں پہن لو۔ کیڑے مکوڑوں اور سردی سے بچ جاؤ گی۔''

اس نے بلا تردد اس کی بات مان لی۔ اسے جرابیں خاصی ڈھیلی تھیں۔ احمد نے مشورہ دیا۔ ''پینٹ کے اوپر سے پہنو......''

اس نے پینٹ کے پائنچے جرابوں کے اندر گھسیڑ دیے۔ احمد نے اپنے دستانے بھی اس کے حوالے کر دیے۔ وہ بولی۔ ''اس طرح تو تمہیں سردی لگ جائے گی۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ بولا۔ ''اب کیا کریں؟''

وہ بھی گویا دل ہی دل میں اس سوال سے پریشان تھی۔ ''مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا ہم اس وادی

سے باہر نہیں نکل سکتے؟"

اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "دو راستے ہیں۔ ایک وہ جس پر سے گزر کر ہم یہاں پہنچے ہیں۔ ادھر بلندی ہے۔ سردی زیادہ ہوگی۔ دوسرا راستہ اسی طرف اترائی میں واقع ہے۔ اترائی بہت خطرناک ہے۔ نیچے ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے چلتے چلتے ہم اس پہاڑی کی دوسری طرف جا سکتے ہیں۔ یہ سڑک ہمیں چند کلومیٹر کے فاصلے پر مل سکتی ہے۔ یا ندی کو چھوڑ کر ہم کالکوٹ کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔ وہ راستہ زیادہ دشوار ہے۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"سندر بن میں...... جہاں سے تم آئی ہو۔ کیا میرے گھر چلوگی؟"

"اوہ نہیں...... ادھر تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ فار گاڈ سیک...... مجھے اس موت کی وادی سے باہر نکالو ورنہ میں خوف اور دہشت سے ہی مر جاؤں گی۔"

"مجھے احساس ہے کہ سندر بن کی طرف جانا اب بہت خطرناک ہوگا۔ راہ میں کہیں بھی تمہارے دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں، یہاں قدرے نگھ (حدت) ہے۔ اوپر بہت سردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ندی کی طرف اترنا چاہیے۔" احمد نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم کسی محفوظ جگہ پر رات کا بقیہ حصہ گزار لیں اور دن چڑھتے یہاں سے نکل جائیں؟" سنبل نے امید بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کھوکھے اور اس جھاڑی سے زیادہ محفوظ مورچہ کیا ہوگا؟ ویسے بھی دن کی روشنی میں ہمارا یہاں سے نکلنا مزید مشکل ہو جائے گا۔"

احمد نے درست کہا تھا۔ سنبل سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "تو پھر ہم بیٹھے کیوں ہیں، چل پڑیں ناں!"

"چلو!" احمد نے اٹھنا چاہا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر سنبل بھی کھڑی ہوگئی۔ احمد نے ہاتھ بڑھایا، سنبل نے تھام لیا۔ زندگی کی ڈگر پر ایسے ہی کسی کا ہاتھ تھاما جاتا ہے، کسی کا چھوڑ دیا جاتا ہے مگر سفر جاری رکھا جاتا ہے۔ احمد نے درست کہا تھا۔ راستہ دم بہ دم بہت مشکل ہو رہا تھا۔ جونہی ایک گگر پر احمد نے ہاتھ رکھے، وادی فائرنگ کی ہولناک آوازوں سے گونج اٹھی۔ اس نے رک کر فائرنگ کی سمت کا اندازہ کیا۔ سندر بن کی جانب واقع گھنے جنگل سے آواز آ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ بولا۔ "ایک سے زیادہ گنیں گولیاں اگل رہی ہیں۔"

سنبل کا حلق سوکھ گیا۔ کراہی۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

احمد نے کندھے اچکائے۔ "اس صورتِ حال میں تمہیں ڈر لگنا بھی چاہیے۔"

فائرنگ کی آواز نے اس طلسم کو توڑ دیا جو احمد اور سنبل، کے ذہنوں پر احساسِ تحفظ نے طاری کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔ پہاڑی کے دامن میں بغیر راستے کے پیر جما جما کر چلنا خاصا تکلیف دہ تھا۔ قدم قدم پر سنبل کو سہارا دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے سفر کی رفتار خاصی سست تھی۔

ایک بڑی چٹان کے عقب میں پہنچ کر سنبل نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔ "دو منٹ پلیز...... مجھ سے اب چلا نہیں جا رہا۔"

"اوہ نہیں ناں...... ابھی تو فرلانگ بھر سفر بھی نہیں کیا ہم نے...... خیر! ادھر ہی بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گئی۔ احمد چٹان کے ساتھ کمر ٹکا کر بولا۔ "فائرنگ رک گئی ہے۔ لگتا ہے پربت شاہ کے

فائرنگ اسکواڈ کو کسی جانور نے امتحان میں ڈالا تھا۔"
وہ بولی۔ "شاید ایسا ہی ہو۔" اس کی آواز کپکپا بھی رہی تھی"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے؟"
وہ بولا۔ "ہاں! مگر میرا یہی یقین دو مرتبہ ہار چکا ہے۔"
وہ کچھ نہیں بولی۔ چند منٹ گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں سے نبرد آزما رہے۔ خاموشی کا گلا احمد نے گھونٹا۔ "اٹھو...... اب ہمیں چلنا ہوگا۔"
سنبل کچھ کہے بغیر کھڑی ہوگئی اور احمد کے پہلو سے جڑ کر چلنے لگی۔ قدرے شرمندہ انداز میں بولی۔ "اگر تم نہ ہوتے میں یقیناً اب تک مر چکی ہوتی۔"
"جسے زندہ رہنا ہے، اسے زندہ رہنا ہے اور جسے مرنا ہے، اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں اس وقت گرم لحاف کے مزے لوٹ رہا ہوتا۔"
"میں نے تم پر اپنی مصیبت لا دی۔ میں بہت بری ہوں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔
"ایسی ناکارہ گفتگو کر کے میرا مورال ڈاؤن نہ کرو۔ تمہیں جنگ لڑنے کے آداب زندگی نے شاید نہیں سکھائے۔" احمد کا لہجہ سخت ہرگز نہیں تھا۔
وہ شرمسار ہوگئی۔ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ توقف کے بعد بولی۔ "تم نے میرے لیے اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگائی، مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی۔"
جھاڑیوں کے بیچ راستہ بناتے ہوئے بولا۔ "آسان سی بات ہے کہ تم لڑکی ہو...... خوب صورت بھی ہو...... تمہیں دیکھتے ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ تمہیں مرنا نہیں چاہیے۔"
صاف عیاں تھا کہ وہ شگفتہ گفتگو کر کے اسے سنبھالا دینے کا خواہاں تھا۔ اگر وہ پست حوصلہ ہو جاتی تو احمد ہی کے لیے وبالِ جان بن جاتی۔ اس نے پوچھا۔ "تمہیں ابھی تک بخار نہیں ہوا...... کیا تمہارا ارادہ بدل گیا ہے؟"
وہ چونک کر رک گئی۔ بولی۔ "آئی سیلوٹ یو احمد...... یو آر ویری بریو مین...... میرا ان حالات میں دم گھٹ رہا ہے جبکہ تم پوری طرح اپنے حواس میں دکھائی دے رہے ہو حالانکہ تم بھی اتنے ہی پریشان ہو جتنی میں ہوں۔" اس کے لہجے میں ستائش بھری ہوئی تھی۔ "بائی داوے! میرا جسم دکھ رہا ہے اور پہلے سے زیادہ سردی لگنے لگی ہے۔ بخار ہوگیا ہے۔"
وہ زیرِ لب مسکرایا۔ سنبل کے لہجے نے چغلی کر دی تھی کہ وہ خوف کی خطرناک ٹرانس سے نکل آئی تھی۔
"باہر نکلنے سے پہلے لباس تو ڈھنگ کا پہن لیتیں۔"
"تو کیا یہ ڈھنگ کا نہیں ہے؟" وہ چونکی۔
"میرا گرم لباس سے مطلب تھا۔" وہ ہنسا۔
"کہاں سے لیتی؟" اس کی سانسیں سفر کی تاب پر پھولنے لگی تھیں۔ "جہاں مجھے رکھا گیا تھا، وہاں سوائے ایک گندے لحاف اور گدے کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے پاس تو جوتے بھی نہیں تھے۔ کیا میں گرم کپڑوں اور جوتوں کے انتظار میں وہیں بیٹھی رہتی یا ان کتوں کو ایک لسٹ تھما دیتی کہ میں یہاں سے بھاگنا چاہتی ہوں، اس لیے مجھے یہ سامان فراہم کیا جائے......"
سنبل کے لہجے کی تندی نے احمد کو باور کرایا کہ اس نے احمد کی بات کا برا مانا تھا۔ بولا۔ "ڈونٹ بی ہاٹ...... ہمارے درمیان نرم گرم ڈائیلاگز تو چلتے ہی رہیں گے۔"
"اوہ ساری...... میں...... میں......"
احمد نے اس کا دستانے میں چھپا ہوا ہاتھ تھام رکھا تھا، ہولے سے دبایا، گویا سمجھایا کہ کوئی بات نہیں۔

اب وہ اتنی اترائی میں آ گئے تھے کہ سندر بن بہت اوپر رہ گیا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں باہر کو نکلی ہوئی ایک بڑی چٹان کو دیکھ کر احمد نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اندھیرے کے باوجود بھٹکا نہیں تھا بلکہ اندازے کی بنا پر منزل کی طرف کامیابی سے گامزن تھا۔ چٹان اور پہاڑی کے درمیان نہایت تنگ جگہ تھی جہاں سے دونوں کو گزرنا تھا۔ احمد کو بخوبی یاد تھا کہ چٹان کے عین وسط میں ایک گڑھا نما گہری کھائی واقع تھی۔ اس میں گرنے کا مطلب ہڈی پسلیوں کا سرمہ بنوانا تھا۔ اس نے سنبل کو اپنے پیچھے احتیاط سے چلنے کا کہا۔ اندازے کے مطابق وسط چٹان سے کچھ پہلے رک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرے کا کامل راج تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر لائٹر ٹارچ روشن کرتا تو اپنی نشاندہی کر بیٹھتا۔ اگر یہ خطرہ مول نہ لیتا تو گہرے گڑھے میں گر جاتا۔ رکا تو سنبل نے پوچھا۔ ”رک کیوں گئے؟“

”یہاں ایک گڑھا ہے۔ اس میں گرنے والا پاتال میں پہنچ جاتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ روشنی کروں یا نہ کروں۔“

”یہ علاقہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تم مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔“ سنبل نے کہا۔

اس نے دل ہی دل میں اللہ کا نام لیا اور لائٹر کو زمین کے قریب کر کے آن کر دیا۔ گڑھا ابھی دور تھا۔ وہ جھکی ہوئی حالت میں قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ ایسی کیفیت میں چلنا بہت تھکن آور ہوتا ہے۔ سنبل اس کے عقب میں چل رہی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر گڑھا دکھائی دے گیا۔ اس میں اندھیرا ابھرا ہوا تھا...... بسیط اندھیرا...... ماحول پر چھائے ہوئے اندھیرے سے بھی زیادہ ڈراؤنا...... سنبل کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”اوہ مائی گاڈ! کتنی خوف ناک جگہ ہے یہ۔“

احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چھپکلی کی مانند بہ آسانی چٹان کے ساتھ چپک کر وہ گڑھا عبور کر سکتا تھا۔ بچپن میں کئی مرتبہ یہ تجربہ کر چکا تھا۔ بس سنبل کی فکر تھی کہ وہ دو اڑھائی گز چوڑائی کا حامل موت کا کنواں عبور نہیں کر سکے گی۔ اس نے لائٹر سنبل کو تھمایا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارا اور گڑھے کے پار پھینک دیا۔ سرد ہوا نے یکا یک بدن چیر کر رکھ دیا۔ دل کو دکھ سا ہوا کہ سنبل نے رات کی اس جان لیوا سرد ہوا کو ایک عام سی ٹی شرٹ کے سہارے جھیل رکھا تھا۔ اس نے کوٹ کے بعد جاگرز اتار کر کوٹ پر پھینک دیے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر نم زدہ چٹان پر رکھ دیے اور دونوں پاؤں چٹان کے نچلے حصے میں کہیں گھسا دیے۔

سنبل کو گڑھے کی انتہائی حد پر کھڑا ہونے کا اشارہ کیا اور خود چٹان سے چمٹ کر نہایت سست رفتاری سے دوسری طرف جانے لگا۔ ایسے میں وہ انسان کم اور چھپکلی زیادہ نظر آ رہا تھا۔ اڑھائی گز کی طوالت پر محیط وہ مختصر سا سفر کوئی پانچ منٹ میں طے ہوا۔ اس دوران سنبل سانس روکے، ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ ہر لحظہ دل سے دعا نکل رہی تھی کہ گیلی چٹان پر اس کے ہاتھ نہ پھسلیں۔ اسے اس موت کے کنویں کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ کبھی بھی احمد کو پار نہ جانے دیتی۔ ایسے میں ایک اور پریشانی نے دل میں گھر کر لیا۔ احمد کے بعد اسے اسی تجربے سے دوچار ہونا تھا۔ کیا وہ اس انداز سے گڑھا عبور کر پائے گی؟

جونہی احمد نے گڑھے کے پار زمین پر قدم رکھا، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے۔

سنبل گھبرا گئی۔ ”کیا ہوا احمد...... تم ٹھیک تو ہو ناں؟“

اس نے ایک طویل سانس حلق میں اتاری۔ تھکی سی آواز میں بولا۔ ”ہاں! سمجھو کہ سولی پر سے نیچے اترا

ہوں۔ دماغ ایک دم ماؤف ہو گیا ہے۔ ڈونٹ بی وری...... آئی ایم او کے......"

وہ کئی ساعتیں ایسے ہی سر تھام کر بیٹھا رہا۔ وہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کا ہیولا اس کی حرکات کی خبر رسانی کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنی توانائیاں بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے لائٹر ٹارچ اپنے پیروں میں روشن کر کے رکھ دی۔ بولا۔ "سنبل! اس گڑھے کی چوڑائی اڑھائی گز ہے۔ تمہیں چھلانگ لگا کر اس طرف آنا ہے۔ کیا ایسا کر لوگی؟"

وہ قدرے سہم گئی۔ مستفسر ہوئی۔ "مجھے گز کی سمجھ نہیں آتی۔ تم یہ فاصلہ فٹوں میں بتاؤ۔"

احمد نے بتایا۔ "یہی کوئی آٹھ فٹ بنے گا۔"

وہ مزید ڈر گئی۔ بولی۔ "نہیں نہیں...... اتنا جمپ تو کھڑے پیروں نہیں لیا جا سکتا ناں...... پیچھے سے دوڑ کر آؤں تو ممکن ہے مگر پھر یہ کنارہ دکھائی نہیں دے گا۔"

احمد نے سر ہلایا۔ وہ اس سچویشن کو پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔"

اس نے پاؤں چٹان کے نیچے بنی ہوئی ننھی سی کھوہ میں پھنسائے، کوٹ کی ایک آستین کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر کلائی پر لپیٹ لیا اور دایاں ہاتھ چٹان پر جماتے ہوئے کہا۔ "تم اس کوٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر چھلانگ لگا دو۔ دھیان رکھنا کہ تمہارے دونوں پیر لائٹر تک پہنچیں ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ اگر تم گڑھے میں لٹک بھی جاؤ تو کوٹ کو نہ چھوڑنا۔ لو پکڑ لو، دونوں ہاتھوں سے......"

اس نے کوٹ جھلایا۔ پہلی بار سنبل اسے تھام نہیں پائی۔ دوسرے جھلارے میں کامیاب رہی۔ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "دیکھ لو، میں گر تو نہیں جاؤں گی۔"

"اگر تم ہوش میں رہوگی تو نہیں گروگی۔ ڈروگی تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر پاؤں گا۔"

وہ کوٹ کو پکڑے دم بخود کھڑی تھی۔ احمد کوٹ کو ننھے ننھے جھٹکے دے کر چھلانگ لگانے پر اکسا رہا تھا۔ ایسے میں اوپر سندر بن کے جنگل کی طرف دو فائر گونجے۔ اسے تلاش کرنے والے دور تھے مگر اپنے ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ تیز آواز میں بولی۔ "احمد...... میں آ رہی ہوں۔"

اس نے لائٹر ٹارچ کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ یہ اس کے اندرونی خوف کا غماز عمل تھا ورنہ کھلی آنکھوں سے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں گڑھے کی نکڑ پر لگے۔ بدن کو تیز جھٹکا لگا۔ ایک بار تو احمد کو بھی ایسا لگا کہ وہ گڑھے میں گرنے والا ہے۔ مضبوط اعصاب کا مرد تھا۔ سنبھل کر کھڑا تھا۔ جلدی سے بولا۔ "کوٹ نہ چھوڑنا......"

یہ کہنا اضافی تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی سختی سے کوٹ پر جمے ہوئے تھے اور وہ نکڑ پر ٹکے ہوئے دونوں پیروں کے بل اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ احمد کا تنا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے جھٹکا نہ لگے کیونکہ ایسی حالت میں اسے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی محنت رنگ لائی اور سنبل اس کے پہلو سے گھسٹتی ہوئی آگے نکلی اور چٹان اور پہاڑی کے بیچ کی تنگ سی جگہ پر اوندھے منہ جا گری۔ اس نے کوٹ ابھی تک نہیں چھوڑا تھا جس کی وجہ سے احمد بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھپ سے اس پر جا گرا۔ اس نے اٹھنے میں لحظہ بھر کا وقت لیا۔ کھڑا ہوا۔ بے ساختہ لبوں سے نکلا۔ "مالک! تیرا شکر ہے...... یہ گندم کی بوری تو بہت بھاری بھرکم ہے۔"

اس کی بات سنبل نے سنی۔ جلدی سے اٹھی اور

اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس سے چمٹ گئی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ پہلے کوٹ کی موجودگی میں اسے بانہوں میں نہیں بھر سکتی تھی۔ اب کوٹ پیروں تلے پڑا تھا اور وہ سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ایسی کیفیت میں چند گھڑیاں گزریں۔ اس کا بدن تہلکہ خیز تھا۔ آن کی آن میں تہس نہس کر گیا۔ جب تک وہ سنبھلتا، اپنی سانسوں پر اختیار کھو بیٹھا تھا۔ وہ اس کے سینے پر اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی، کانپ رہی تھی اور لرزش بار آواز میں ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ ''یو آر بریو مین...... آئی لو یو...... آئی لو یو...... مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میں زندہ رہوں گی۔ تم میرے ساتھ ہو تو میں مر نہیں سکتی۔ تھینک یو احمد!''

وہ بے ربط بول رہی تھی۔ اس کا بخار زدہ گرم بدن کوئی اجنبی زبان بول رہا تھا۔ احمد سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمجھنے پر آیا تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اسے کندھوں سے پکڑ کر خود سے بدقت علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی بڑا کشٹ باقی ہے۔ یہ تھینکنگ وینکنگ اس وقت کے لیے بچا رکھو جب تجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔''

وہ ممنونانہ انداز میں بولی۔ ''نہیں احمد...... میں نے اپنے خوف سے چھٹکارا پالیا ہے۔''

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زمین پر بیٹھ کر جاگرز پہننے لگا۔ ایسے میں سنبل نے کوٹ جھاڑ کر اس کے کندھوں پر رکھ دیا اور لائٹر ٹارچ اٹھا کر آف کر دی۔ پھر کسی خیال کے تحت دوبارہ روشن کی۔ گڑھے میں روشنی پھینکی۔ محض دو تین فٹ تک خلا دکھائی دیا پھر سیاہی...... اس نے جھرجھری لے کر ٹارچ بند کر دی۔ چند ہی لمحوں میں احمد نے اسے چلنے کا کہا اور چٹان کے ساتھ گھسٹ کر چلنے لگا۔ وہ اس کی تقلید کرنے لگی۔ راستہ پہلے سے کہیں زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔ مستفسر ہوئی۔ ''کیا تم پہلے بھی اس طرف آئے تھے؟''

''ہاں! پانچ سال سے پیشتر کی میری تمام عمر یہیں گزری تھی۔ میں نے اس وادی کا چپا چپا چھان رکھا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بھٹکنے والا نہیں ہوں۔''

''کیا میں بہت بھاری ہوں؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' احمد چونک کر رک گیا۔

''تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے گندم کی بوری کہا تھا...... وہ بہت بھاری ہوتی ہے۔ شاید سو کلوگرام کی ہوتی ہے جبکہ میرا ویٹ پچپن کلوگرام ہے۔''

''میں نے درست کہا تھا۔ یا شاید کافی دیر سے بھوکے پیٹ لڑ رہا ہوں، اس لیے تمہارا وزن بہت زیادہ محسوس ہوا۔''

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ میں نے کل صبح ناشتے میں ایک سوکھی روٹی کھائی تھی۔''

احمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو بٹر ٹافیاں نکالیں۔ ایک اپنے منہ میں جبکہ دوسری سنبل کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ بولا۔ ''میرے شولڈر بیگ میں بسکٹ بھی تھے۔ اگر میں نے واپس جا کر بیگ اٹھا لیا ہوتا تو ہمارا سفر بہتر انداز میں جاری رہ سکتا تھا۔ اگر تم اپنے اندر حوصلہ پاؤ تو یہیں رک جاؤ، میں بیگ اٹھا لاتا ہوں۔''

اس کی توقع کے عین مطابق سنبل نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ مسکرایا، بولا۔ ''چند منٹ رک جاتے ہیں۔ تھکن کم ہو جائے تو آگے چلیں گے۔ کافی دیر سے ڈائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی۔ تمہارے طلب گار مایوس ہو کر واپس جانے والے تو ہیں نہیں، یقیناً جنگل کے کونے کھدرے چھان رہے ہوں گے۔ اب اگر وہ کھوکھے تک پہنچ بھی گئے تو ہمیں ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔''

''ہمیں اور کتنا چلنا ہے؟'' سنبل نے ٹافی چوستے

ہوئے پوچھا۔

"ابھی نصف سفر طے نہیں ہوا۔ موت کے گڑھے کی طرح ایک اور خطرناک مقام آنے والا ہے۔ اس کے بعد راستہ مزید دشوار تو ہو جائے گا مگر خطرناک نہیں رہے گا۔"

"مجھے دن میں یہاں سیکڑوں بندر دکھائی دیے تھے۔ رات میں کوئی ایک بھی نظر نہیں آرہا۔ پربت شاہ نے کہا تھا کہ یہاں لیوپرڈز بھی رہتے ہیں۔ انسانوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔"

"اوہ نہیں یار...... اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یہاں بھیڑیے ہوتے ہیں جو انسانوں سے دور بھاگتے ہیں۔ اگر میاں بیوی شکار پر اکٹھے نکلیں اور بہت بھوکے ہوں تو بچوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اگر بچے کے ہاتھ میں کوئی شاخ یا چھڑی ہو تو پھر بھی نزدیک نہیں آتے۔ چیتے اور شیر یہاں کبھی دکھائی نہیں دیے۔" احمد نے کہا۔

اچانک اسے بے تحاشا سردی اور سنبل کے ناکافی لباس کا خیال آیا۔ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میرا کوٹ پہن لو۔ سردی نہیں لگے گی۔"

اس نے انکار کر دیا۔ بولی۔ "تمہیں گرم رہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں سردی کی خاصی حد تک عادی ہو گئی ہوں۔ بیمار پڑ گئی تو تم مجھے اٹھا کر وادی سے نکل سکتے ہو۔ اگر تم بیمار پڑ گئے تو میں یہاں سے زندہ نکل نہیں پاؤں گی۔"

احمد زیرلب مسکرایا۔ بولا۔ "بہت مطلبی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ توقف کے بعد بولی۔ "یہاں کوئی پھل دار پودے نہیں ہوتے؟"

اسے بھوک لگی تھی۔ احمد نے کہا۔ "اس طرف کچھ نہیں ہے۔ البتہ جب ہم ندی پر پہنچیں گے تو چیری مل سکتی ہیں۔ بلکہ نہیں...... اس کا بھی موسم نہیں ہے۔"

"ندی میں پانی ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں ہوگا۔" احمد نے پر تیقن لہجہ اختیار کیا۔ "البتہ ایک جگہ پر پینے کا پانی میسر آجائے گا۔ کیا تم اتنی سردی میں بھی پیاس محسوس کر رہی ہو؟"

اس نے کہا۔ "ہاں! پانی سے پیٹ تو بھرا جا سکتا ہے۔"

احمد نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اسے جی ہی جی میں پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کھوکھے میں سے اپنا شولڈر بیگ کیوں نہیں اٹھایا تھا؟ جب اسے یاد آیا تھا تو پلٹ کر اٹھا لیتا تو سنبل کو سردی سے خاصی حد تک بچا سکتا تھا۔ ایسے میں ایک پچھتاوا اور لاحق ہو گیا۔ اس نے نوری کے ساتھی کے کندھے سے رائفل اتاری تھی۔ اگر ذہن حاضر ناظر ہوتا تو اس کا کوٹ اور شوز بھی اتار سکتا تھا۔ اس سے دونوں مرتبہ جلد بازی میں بڑی غلطیاں سرزد ہو گئی تھیں۔ سر جھٹک کر عادتاً بڑبڑایا۔ "نہیں یار! دو کے بعد تیسری غلطی پچھتانے کی کر رہا ہوں۔ پلٹ کر نہیں دیکھنا۔ آگے نظر رکھنا ہے۔"

سنبل چونکی۔ "مجھ سے کچھ کہا؟"

وہ سنبھل گیا۔ "نہیں...... میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ جب غصے، جوش یا مایوسی میں ہوتا ہوں تو خود سے مخاطب ہو جاتا ہوں۔"

"یہ تو مہلک نفسیاتی مرض ہے۔" سنبل نے کہا۔

"مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے میری زندگی بھر کی تنہائی کا عمل دخل ہے۔ جب دور ہوگی، یہ مرض بھی جاتا رہے گا۔"

"کیا مطلب؟ کیا تمہارے بہن بھائی اور ماں باپ نہیں ہیں؟" سنبل کے لہجے میں ہمدردی اتر آئی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں ایک مکمل اور بھرپور گھرانے کا فرد ہوں۔ بہن، بھائی اور والدین کے

علاوہ کئی رشتہ دار اور دوست ہیں۔ مگر میں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہوئے الگ کر لیا تھا۔ یعنی تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میری قیدِ تنہائی خود ساختہ ہے۔" احمد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

چلتے چلتے رک گیا۔ "سنبل! اب ہم ندی کے عین اوپر کم و بیش چالیس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ آگے راستہ نہیں ہے۔ عمودی چٹان سر اٹھائے کھڑی ہے۔ بائیں پہلو میں بھی ایک ایسی ہی چٹان واقع ہے جس کے اوپر ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہمیں یہاں سے پھسل کر نیچے اترنا ہے۔"

سنبل نہ سمجھ پائی۔ "پھسل کر...... کیا مطلب؟"

اس نے اپنی باڈی لینگویج سے اسے پھسلنے کے عمل کی وضاحت کی۔ وہ سمجھ گئی اور بولی۔ "تو اس میں مشکل کیا ہے؟"

"نیچے ندی کا پیٹ ہے۔ کہیں ریت ہے تو کہیں پتھر...... اگر ہم کسی نوکیلے پتھر پر گرے تو اٹھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ فاصلہ اتنا ہے کہ لائٹر ٹارچ کی روشنی میں ندی دکھائی نہیں دے گی۔"

سنبل نے کچھ نہیں کہا۔ اسے سوچنے کا موقع دیا۔ وہ بڑبڑایا۔ "کاش! اس چٹان پر کہیں نشان لگا دیا ہوتا......"

"کیسا نشان؟" سنبل استعجاب آمیز لہجے میں بولی۔

"اوہ...... میرا مطلب ہے کہ جب ہم یہاں سے پھسلا کرتے تھے، تب ہمیں چاہیے تھا کہ اس چٹان پر کوئی نشان لگا دیتے جہاں سے پھسل کر ہم ریت پر گر سکیں...... مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے......" احمد نے کہا۔ پھر سنبل کی طرف منہ کیا اور پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ پشت پر خلا دونوں پاؤں چٹان کی آخری سطح پر اور ہاتھ چٹان پر جھکے ہوئے...... وہ یہ عمل بڑی آہستگی سے کر رہا تھا اور سنبل کو دکھا رہا تھا کیونکہ اسے احمد کے بعد عین اسی انداز میں نیچے گرنا تھا۔ "یہیں سے کودنا، میں تمہارے استقبال کے لیے نیچے کھڑا ہوں گا۔ ڈرنا نہیں...... میں ہوں ناں......"

"احمد...... اچھی طرح دیکھ لو، کہیں تم پتھروں پر ہی نہ جا گرو۔" سنبل پر تشویش کا گہرا تاثر غالب تھا۔

احمد مسکرایا پھر سیٹی بجا کر نیچے پھسل گیا۔ سرر...... سرر...... کی نامانوس سی آواز فضا کے اندھیرے میں ابھری پھر معدوم ہو گئی۔ سنبل نے لامحدود خلا میں جھانک کر احمد کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔ دبے دبے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "احمد...... تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ اس کی آواز احمد تک پہنچی نہیں ہو گی۔ بلند آواز میں پوچھنا چاہتی تھی مگر احتیاط مانع ہوئی کہ احمد کے علاوہ بھی کوئی سن سکتا تھا۔ چند لمحے پریشانی میں گزرے۔ پھر احمد کی مدھم سی آواز کانوں میں اتری۔ اس نے کیا کہا تھا، سمجھ نہ پائی مگر جو دل سننا چاہ رہا تھا، وہ سن چکا تھا۔ وہ خیریت سے تھا۔ اس نے احمد کی سی پوزیشن لی۔ چٹان پر سینے کے بل لیٹ گئی اور ہاتھوں کی گرفت پتھر سے اٹھا لی۔ ایسے میں پتہ چلا کہ احمد کتنے بڑے عذاب سے گزر کر نیچے پہنچا تھا۔ چٹان کی سطح گیلی تھی اور وہ برف کی مانند سرد تھی۔ بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ وہ پھسلتی ہوئی غیر معمولی تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔ کہیں کہیں پتھر کی سطح کھردری تھی جس نے ٹی شرٹ پھاڑ دی تھی۔ ایک ہی وقت میں جسم میں چٹان کی خنکی اور رگڑ کی آگ بھر گئی۔ خوف کی پھریری نے اوسان خطا کر دیے مگر ان کیفیات کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ زمین سے پہلے احمد کی باہوں کے لمس سے آشنا ہوئی۔ وہ اسے سنبھالنے کے لیے کھڑا تھا مگر اس نے سنبھال نہ پاتے ہوئے بھی سنبل کو زمین پر گرنے

نہیں دیا۔ دونوں اوپر نیچے ریت پر گرے۔ خوف کے مارے سنبل کی سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ سانس بحال نہ ہوئی۔ ایسے میں سمجھ آئی کہ سانس رکنے کا سبب اور تھا۔ احمد کی بانہوں کا شکنجہ بہت سخت تھا۔

وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ ''احمد...... ہاتھ نرم کرو۔''

احمد بری طرح چونکا۔ شرمسار ہوا اور بانہیں کھولتے ہوئے بولا۔ ''نہیں یار! پھر غلط ہو گیا ناں...... سوری سنبل! مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔''

وہ ریت پر ہاتھ ٹکا کر کھڑی ہوئی۔ جب اس پر لیٹی تھی تو دور تھی۔ جب دور ہوئی تو زیادہ قریب آنے لگی۔ زندگی ایسے ہی کھیل کھلنے کی رسیا ہوتی ہے۔ احمد چاروں شانے چت لیٹا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ وہ اس کے پہلو میں گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کے دھندلے نقوش کو گھورتی رہی۔ ایسے میں سردی کا احساس بیدار ہوا۔ سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ٹی شرٹ میں کئی چھوٹے بڑے سوراخ ہو گئے تھے جہاں سے گزر کر یخ بستہ ہوا بدن پر ضربیں لگا رہی تھی۔ اس نے سینہ بازوؤں سے ڈھانپ لیا۔

ناگاہ اس طرف دیکھا جہاں چند لمحے پہلے وہ کھڑی تھی۔ گردن گھمائی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ احمد نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ رہا تھا یا بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ پوچھنے لگی۔ ''احمد! کیا بات ہے؟ کیا تمہیں کوئی چوٹ لگی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں! مگر بری نہیں۔''

''بری نہیں...... کیا مطلب؟'' وہ بری طرح چونک گئی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ بولا۔ ''ہر بات ایسی نہیں ہوتی کہ اس سے کوئی مطلب بھی نکلتا ہو۔ اٹھو! ابھی ہمیں اور چلنا ہے۔''

دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کا رخ جنوب کی جانب تھا۔ ندی کا پانی اسی رخ چلتا تھا۔ احمد کا اندازہ ٹھیک تھا۔ ندی میں پانی نہیں تھا۔ سنبل نے پوچھا۔ ''اس ندی میں پانی کیوں نہیں ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ برساتی نالہ ہے۔ سندر بن میں بارش ہوتی ہے تو اس کا پیٹ بھر جاتا ہے ورنہ راستہ سا بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ اب تب میں، کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ بارش کے نصف گھنٹہ بعد یہ ندی پانی سے بھر جائے گی اور جہاں ہم چل رہے ہیں، یہاں شور کرنے والا پانی بھاگنے لگے گا۔''

سنبل گھبرا گئی۔ بدقت سردی کا سامنا کر رہی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے سردی بڑھ جاتی تو وہ دو قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہتی۔ بولی۔ ''اف میرے خدا! یہ سردی جھیلی نہیں جاتی، وہ کیسے جھیل پاؤں گی۔''

احمد رک گیا۔ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ سنبل روکتی رہی مگر اس نے چند سیکنڈز میں اسے کوٹ اوڑھا دیا۔ کوٹ کا اندرونی ماحول بہت گرم تھا۔ احمد کے بدن کی گرمی نے چند لمحوں میں سنبل کو گرما دیا۔ احمد بولا۔ ''کیسا رہا؟''

سنبل کچھ نہ بول پائی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کوٹ اترتے ہی احمد کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ چند منٹوں میں کانپنے لگا۔ چونکہ سنبل رات بھر میں سردی جھیلنے کی عادی ہو گئی تھی، اس لیے احمد سے بہتر انداز میں جھیل رہی تھی۔ وہ کوٹ میں تھا۔ گرم تھا۔ اب اچانک سرد ہو کر ناکارہ ہونے لگا تھا مگر پتھروں میں پیدا ہونے والے کی ضد بھی پتھریلی تھی۔ مزاج بھی سنگین تھا۔ اس نے خود کو گرم کرنے کے لیے اپنی رفتار تیز کر لی۔ سنبل کے لیے بھاری بھر کم کوٹ میں چلنا دوبھر ہو گیا۔ ایسے تیسے ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے ہو گیا۔

اس دوران دونوں کے درمیان اندھیرے سے بھی کہیں گہری خاموشی حائل رہی۔

ندی کا راستہ بتاتا تھا کہ وہ جب چلتی تھی تو گام گام لہرا کر چلتی تھی۔ وہ بھی زگ زیگ چلتے ہوئے ایک تنگ سے درے میں آ کر رک گئے۔ ایسے میں ننھی ننھی پھوار گرنے لگی تھی۔ سنبل بولی۔ "مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جا رہا۔"

یہی حالت احمد کی تھی مگر وہ اپنی کمزوری کا اظہار کرنے والا نہیں تھا۔ بولا۔ "اب ہم ایک عارضی پڑاؤ پر پہنچ چکے ہیں۔ یہاں ایک کھوہ ہے جس میں ہم رات کا بقیہ وقت محفوظ رہتے ہوئے گزار سکتے ہیں۔ کیا ہمیں ایسا کرنا چاہیے؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "ضرور...... میں بہت تھک گئی ہوں۔ پانی مل جائے گا کیا؟"

احمد کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "ہاں...... نہیں...... یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر فکر نہ کرو۔ ابھی بارش ہونے والی ہے۔ پانی کی ریل پیل ہو جائے گی۔ جی بھر کر پی لینا۔"

اسے پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ سنبل کا حلق کیوں سوکھ رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی حالت احمد سے کہیں دگرگوں تھی۔ وہ لڑکی تھی اور رات بھر سے دوڑ بھاگ کر رہی تھی۔ سردی کے مارے بے ہوش ہوتے تک نہ جانے سفر کے کن مراحل سے گزری تھی۔

احمد نے ندی کے بائیں کنارے کا قصد کیا۔ ایک تنگ جگہ پر پہنچ کر اونچے نیچے پتھروں پر چڑھ گیا۔ سہارا دے کر سنبل کو بھی چڑھایا۔ دس بارہ گز کی بلندی تک پہنچنا نہایت مشکل کام تھا۔ وہ پتھروں کا مزاج آشنا تھا۔ سنبل ناشناسا تھی۔ اسے سہارا دینے کے نام پر اسے اٹھانا پڑتا تھا۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی بری طرح ہانپنے لگا۔

کہنے لگا۔ "نہیں یار! ابھی تو یہ بھوکی ہے، او کھے سوکھے اٹھا لیتے ہو۔ پیٹ بھر کر کھائے گی تو کرین منگوانا پڑے گی۔"

وہ جھینپ گئی مگر اس کی خود کلامی میں حائل نہیں ہوئی۔ چند لمحوں بعد ایک کھوہ کے سامنے پہنچ گئے۔ دو اڑھائی فٹ قطر دہانے والی یہ کھوہ علاقے سے ناواقف شخص کو ہرگز دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے عین سامنے، دو تین فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا پتھر جبکہ دائیں ہاتھ پر پائن کا قد آور درخت ایستادہ تھا۔ احمد درخت کی جڑ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہاتھ کھوہ میں ڈال کر لائٹر ٹارچ روشن کی۔ کافی دور تک منظر کھل گیا۔ وہ ڈیڑھ دو فٹ کے بعد تنگ سے کمرے کا روپ دھارتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔ سنبل کی پینٹ کا پائنچہ پکڑ کر نیچے کھینچا۔ یہ بیٹھ جانے کا حکم تھا۔ وہ بولا۔ "میں اندر جا رہا ہوں۔ آواز دوں گا تو گھٹنوں کے بل چل کر اندر آ جانا۔ شاہِ عالم کا دربار سجا ہوگا۔"

اسے احمد پر حیرانی ہوئی۔ اتنے سخت اعصاب کا مالک اسی دنیا میں رہ رہا تھا۔ 'اوکے' کہہ کر پتھر اور درخت کے درمیان پھنس کر بیٹھ گئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے احمد گھٹنوں کے بل چلتا ہوا کھوہ میں غائب ہو گیا۔ وہ آنکھیں جھپکائے بغیر کھوہ کے اندر دیکھتی رہی۔ احمد کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے غار کی کمرہ نما جگہ کا معائنہ کیا۔ اس دوران دائیں ہاتھ جا کر سنبل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد قدرے گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "سنبل! آ جاؤ...... اندر آ جاؤ۔"

وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگی۔ کوٹ کی وجہ سے خاصی مشکل پیش آئی۔ گھٹنے پتھر کی وجہ سے دکھنے

لگے۔ منٹ بھر بعد وہ اندھیرے سے نکل کر لائٹر ٹارچ کی روشنی سے منور غار میں تھی جہاں وہ جھک کر کھڑی ہو سکتی تھی مگر وہ کھڑی نہیں ہوئی تھی بلکہ غار کی شمالی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے احمد کے پاس گھٹنوں کے بل چل کر پہنچی۔ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ سانسیں ہموار کر کے بولی۔ "یہ تو ہینڈ میڈ کمرہ لگتا ہے۔"

احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں...... یہ قدرتی کھوہ ہے۔ ایسی ان گنت بڑی چھوٹی غاریں اس وادی میں موجود ہیں۔ اس غار کے بارے چند ایک لوگ ہی جانتے ہوں گے۔"

وہ بولی۔ "مجھے زور کی پیاس لگی ہے۔"

اس نے کندھے اچکائے۔ "میں دم لے لوں، پھر کچھ کرتا ہوں۔"

اس نے اپنی جیب ٹٹولی، پھر سنبل کے بدن پر موجود اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ مایوسی چہرے پر ثبت ہوگئی۔ سنبل نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

"موبائل فون گر گیا ہے کہیں...... نوری سے مارا ماری کے دوران جھاڑی میں گر گیا یا اس کے ساتھی سے میل ملاقات کے دوران...... خیر، وہ اس وادی میں محض گھڑی کا کام ہی تو دے رہا تھا۔ میں وقت دیکھنا چاہتا تھا۔"

"تین یا چار بجے ہوں گے۔"

"اگر موبائل ہوتا تو 'یا' نہ کہنا پڑتا۔" احمد نے کہا۔ ایسے میں سنبل نے اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ اپنی خود غرضی پر دل نے ملامت کیا۔ بولی۔ "تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہیں اتنی سردی لگ رہی ہے۔"

وہ اپنا سر عقبی دیوار سے ٹکا کر، آنکھیں موند کر، سستی آمیز لہجے میں بولا۔ "تم میری فکر نہ کرو۔ یہ جگہ نسبتاً گرم ہے۔ کچھ ہی دیر میں سردی کا احساس بہت کم ہو جائے گا۔ میں خاصا تھک گیا ہوں۔ تم اگر مجھ پر کرم کرو تو مجھے آرام کرنے دو کیونکہ ہمیں دو چار گھنٹے یہیں گزارنے پڑیں گے۔"

سنبل کو اس کی بات ناگوار گزری مگر وہ اس کا اظہار کرنے کی حیثیت میں نہیں تھی۔ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے سر اٹھایا۔ احمد کی طرف دیکھا۔ وہ یقینی طور پر سو گیا تھا۔ اس کے ننھے ننھے خراٹے اور ڈھیلا ڈھالا بدن اس کی گہری خوابیدگی کی دلیل تھے۔

اس کے چہرے پر اس کے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کے خطوط نظر آ رہے تھے۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ وہ جواں سال تھا۔ رنگت قدرے سنولائی ہوئی، خمدار گھنی مونچھیں، دراز اور چست قامت، سیاہ گھنگھریالے بال جو خاصے لمبے تھے اور بڑھی ہوئی شیو...... وہ جاذبِ نظر مرد تھا۔ کسی بھی چشمِ اغنا کو گرہ دے سکتا تھا۔ سانس کے بل پر اٹھتا بیٹھتا چوڑا سینہ، مضبوط بازو...... اور اس کے چہرے پر پاس بھری معصومیت کے عکس...... بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے سے دگنی جسامت والے تین ہٹے کٹے گن برداروں کو ٹھکانے لگا کر لیٹا تھا۔ مگر سنبل یہ کارگزاری اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔

اس نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لی۔ غار کا بہ نظرِ غور جائزہ لیا۔ وہ کشادہ نہیں تھی مگر ان دونوں کو پناہ دینے والی وسعت رکھتی تھی۔ فرش، دیواریں اور چھت مختلف سیاہ پتھروں کی تھیں۔ ایک دیوار کی جڑ میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہاں یقیناً مٹی تھی۔ نچلی اور اوپر والی چٹانوں میں ساڑھے چار پانچ فٹ کا فاصلہ حائل تھا اور یہی کمرے کی بلندی تھی۔ چند مختلف سائزوں کے ننھے پتھروں کے سوا ناہموار فرش پر کچھ

نہیں تھا۔ اسے احمد کے انتخاب پر اطمینان تھا کہ اس خفیہ غار تک کوئی پہنچ نہیں پائے گا۔

سنبل کو وہاں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ گیلی جرابیں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ پاؤں گیلے تھے مگر یخ نہیں تھے۔ ایسے میں باہر نا شناسا سا شور برپا ہو گیا۔ وہ سہم گئی۔ مبادا اسے تلاش کرنے والے غار تک پہنچ گئے ہیں۔ شور آن کی آن میں بڑھ تو اس نے احمد کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ "کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

"وہ...... ادھر شور سن رہے ہو؟" اس کی آواز مرتعش تھی۔

احمد نے کان لگائے۔ شور سنا۔ منہ بنا کر بولا۔ "بارش ہو رہی ہے۔ اتنا بھی پتہ نہیں چلتا تمہیں...... میں سنڈر لینڈ سے آئی ہوں!"

اس نے نقل اتارتے ہوئے سنبل کا جملہ دہرایا اور ایک غصہ بھری نگاہ ڈال کر پھر سو گیا۔ سنبل کو خفت ہوئی۔ سوچنے لگی کہ اس نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ اسے چاہیے تھا کہ دہانے کے باہر جھانک کر دیکھ لیتی۔ اس شور کے ساتھ ہی سردی کا تاثر بھی کمزور ہو گیا۔

بارش گھنٹہ بھر جاری رہی۔ اس دوران احمد سویا رہا جبکہ سنبل جاگتی رہی۔ کبھی ٹارچ آن کر کے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتی تو کبھی آنکھیں بند کر کے اپنی سوچوں میں غلطاں ہو جاتی۔ پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا مگر کھوہ سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پربت شاہ کے آدمیوں کا خوف ذہن پر غالب تھا۔ یہ اندازہ بھی تھا کہ جن پتھروں پر چڑھ کر یہاں پہنچی تھی، احمد کے سہارے کے بغیر ان پر سے اتر نہیں سکے گی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی۔

خاموشی نے بارش تھمنے کی خبر دی مگر تاریکی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ احمد بیدار ہو جائے اور اس کے ساتھ باتیں کرے مگر اس کی ناراضی کے ڈر سے جگا نہیں رہی تھی۔ ایسے میں اس کے دل کی آواز گویا احمد نے سن لی۔ بیدار ہو گیا۔ بولا۔ "سنبل! کیا تم بھی سو گئی ہو؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "نہیں...... مجھے نیند نہیں آئی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ جلا کر اس کے چہرے کے رخ کر دی۔ خوابیدہ اور بیدار چہرے میں آنکھوں نے فرق حائل کر دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ٹارچ کی ننھی سی بیم پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر پھیلا کر، انگڑائی کے انداز میں اکڑاتے ہوئے بولا۔ "تم مجھ سے زیادہ سخت جان ہو۔ تمہیں بخار ہوتے ہوتے نہیں ہوا جبکہ مجھے بخار ہو گیا ہے۔"

وہ چونکی۔ گھبرا کر اس کے قریب کھسکی۔ کلائی تھام کر بخار کی شدت کا اندازہ کرنا چاہا مگر ہاتھ میں پہنا ہوا دستانہ رکاوٹ بن گیا۔ جھینپ کر دستانہ اتارا۔ کلائی تھامی۔ ٹمپریچر زیادہ تھا بولی۔ "اب کیا ہو گا؟ یہاں تو کوئی میڈیسن ہی نہیں ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "ٹارچ ہٹاؤ۔ میں باہر جھانک آؤں۔"

سنبل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے روکا۔ جلدی سے کوٹ اتارا۔ اسے پہننے کے لیے دیا۔ "تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔"

وہ ہتھیلیوں کے بل تھوڑا آگے کی طرف کھسکا اور بغیر کچھ کہے کوٹ پہن لیا۔ بٹن بند کرنے کے بعد اس نے ٹارچ سنبل کے ہاتھ سے لی۔ ایسے میں ٹارچ کا رخ سنبل کی طرف ہو گیا۔ روشنی کے عقب میں سنبل کی طرف پیش قدمی کرنے والی آنکھوں کو ایک جھٹکا لگا۔ سنبل نے احمد کی نظروں کے تعاقب میں اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ پورے بدن کا لہو آن واحد میں چہرے پر اکٹھا ہو گیا۔ اسے کوٹ اتارتے ہوئے پھسلنے

سے کئی جگہوں پر سے گھس جانے والی ٹی شرٹ بھول گئی تھی۔ اب سن سی بیٹھی اپنا آپ دیکھنے لگی۔ احمد کو خود پر قابو پانے میں چند ساعتیں لگیں۔ ٹارچ کا رخ پھیر کر بولا۔ ''کوٹ اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔''

وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

احمد گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے دہانے کی طرف بڑھا۔ دہانے کی طرف مڑنے کے بجائے رک گیا۔ بولا۔ ''ادھر آؤ...... تمہارے لیے قدرت نے تھوڑا سا پانی جمع کر دیا ہے۔ پی لو۔''

بارش کا پانی کھوہ میں بھی داخل ہوا تھا۔ دہانے کے سامنے والی ٹکڑ میں کوئی سوراخ تھا جس کی وجہ سے کھوہ میں مجتمع ہونے کے بجائے کہیں اور چلا گیا تھا۔ فرش پر ایک پیالہ نما گڑھا موجود تھا جو پانی سے لبالب تھا۔ احمد نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ پہلو کو چھوتی ہوئی سنبل سے مخاطب ہوا۔ ''اگر چاہو تو براہِ راست منہ لگا لو اور اگر ایسے پانی پینا برا لگے تو ایک ہاتھ کا چلو بنا کر پی لو۔ بہرحال! یہ تمہارا دسترخوان ہے۔''

اس نے روشنی گڑھے پر مرکوز رکھی۔ سنبل نے خاک آلود پانی کا چلو بھرا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ پہلے ہاتھ برف ہوئے پھر منہ، پھر یخ بستہ پانی معدے تک جاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے تین چار چلو پانی معدے میں اتارا۔ سیر ہو کر بولی۔ ''شکریہ احمد! اگر مجھے اس گڑھے کا علم ہوتا تو اب تک پیاس کا عذاب نہ بھگتتی۔''

احمد دہانے کی طرف بڑھتے ہوئے تھم گیا۔ گیلری نما حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے میں سرد ہوا کا ایک جھونکا دہانے میں داخل ہوا۔ اس پر یک آن کپکپی طاری ہو گئی۔ پلٹ کر ننھے سے پانی کے گڑھے کی طرف بڑھا۔ آدھا پانی سنبل نے پیا تھا۔ بقیہ آدھے پانی سے اس نے وضو کیا اور چوپاؤں کی طرح چلتا ہوا شمالی دیوار تک چلا آیا۔ سنبل نے اس کی تقلید کی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

احمد روشن ٹارچ کو پہلو میں رکھ کر دو زانو بیٹھ گیا۔ وہ خدا کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ اگر غار میں کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی تو کھڑا ہو کر نماز ادا کرتا۔ اب مجبوری تھی۔ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے ٹارچ آف کر دی۔ اندھیرے میں پہلی سی سنجیدگی نہیں رہی تھی۔ شاید صبح ہونے والی تھی یا ہو چکی تھی۔

سنبل نے پوچھا۔ ''احمد! تم نماز کیوں پڑھتے ہو؟''

وہ چونکا، بولا۔ ''کیا تم مسلمان نہیں ہو؟''

''آں...... ہاں...... تم میرے سوال کا جواب دو۔''

''نماز برائی سے روکتی ہے۔ برے خیالوں سے دور رکھتی ہے۔''

''ایسا کیا برا خیال تمہارے ذہن میں آیا تھا کہ تم نماز پڑھنے لگے۔''

احمد نے غور کیا۔ وہ طنز نہیں کر رہی تھی۔ بڑبڑایا۔ ''اوہ یار! یہ بے چاری انگلینڈ میں پلی بڑھی ہے۔ اسے اسلام اور نماز کے بارے میں کیا علم ہوگا۔''

بولا۔ ''میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ چھوڑو اس موضوع کو، یہ تمہاری سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟...... ابھی تک مجھے تم سے پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ تم کن حالات سے گزر کر مجھ تک پہنچی ہو۔ اگر مناسب سمجھو تو بتا دو۔''

سنبل نے دریافت کیا۔ ''اگر میں تمہارے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہوں تو؟''

وہ چونکا۔ سنبل کی طرف دیکھا، کوئی نتیجہ اخذ کر کے بولا۔ ''تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیوں؟'' سنبل کی آواز میں حیرانی کا عنصر گھل گیا۔ ''تم میرے لیے جان خطرے میں ڈال چکے ہو، پھر بھی تمہیں اس پر اعتراض نہیں ہوگا کہ میں تم پر اعتبار

نہیں کرتی۔"

اس نے کندھے اچکائے، بے نیازی سے بولا۔ "میں نے ایک انسان کو، خاص طور پر ایک بے دست و پا، مرتی ہوئی لڑکی کو زندگی کی ڈگر پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ابھی میرا کام باقی ہے۔ تمہیں اس علاقے سے نکال کر اسلام آباد پہنچاؤں گا...... پھر تجھے گڈ بائی کہہ کر اپنے گاؤں سندر بن لوٹ آؤں گا۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ مجھے تمہارے حالات سے کیا لینا دینا...... تم مجھے کچھ بتاؤ، بھلے کچھ بھی نہ بتاؤ، میرے نزدیک کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہے۔"

وہ عجیب نہیں، عجیب تر تھا۔ کئی ساعتیں عکس کی طرح نظر آنے والے اس سانولے مرد کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ اس کی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں آیا تھا۔ بولی۔ "تم طبعاً اتنے بے پروا ہو یا کسی مقصد کے تحت خود کو بے لوث ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟"

بات چبھتی ہوئی تھی تبھی چبھ گئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تعجب سے بولا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں جو کہنا چاہتی تھی، کہہ چکی ہوں۔ اگر تم اس کا جواب دینا چاہو تو تمہاری مرضی...... تم میرے پابند نہیں ہو۔"

"دلیعنی مجھے تم سے کوئی لالچ ہو سکتا ہے؟" اس کی حیرانی ابھی تک گئی نہیں تھی۔ تبھی پوچھ رہا تھا۔ "تم خوب صورت ہو۔ جوان ہو۔ یقینی طور پر غیر شادی شدہ بھی ہو۔ کچھ ایسی ہی حالت میری بھی ہے۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تم سے...... آ...... تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔"

ایک ہی وقت میں اس کے لہجے میں تعجب بھی تھا اور خفگی بھی...... سنبل پر گویا اس کے جملوں کا طنز نہیں پہنچا بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ اس سے بھی زیادہ گمبھیر ہو......"

وہ کئی ثانیے اسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ پھر مایوسی سے بولا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری وہ دولت جو ابھی تک دکھائی نہیں دی، مجھے اس مارا ماری پر اکسا رہی ہو اور میں تمہیں اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے تمہیں وادی سے نکالنے جا رہا ہوں۔ ہیں؟"

اس نے کچھ سوچا، احمد کو دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ شبہ ہوا کہ اندھیرے کی وجہ سے سر کی اثباتی حرکت احمد نے نہ دیکھی ہو تبھی بولی۔ "ہاں! یہ بھی بعید از امکان نہیں۔"

احمد بھونچکا رہ گیا۔ ایک ٹک خاموشی سے اسے دیکھے گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ سنبل نے ترغیب دی۔ "تم خاموش ہو گئے ہو۔"

وہ بولا۔ "مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔"

سنبل نے اسے بہتیرے کچوکے دیے مگر وہ خاموش رہا۔ دل میں ابھرتے ہوئے طوفانوں کو دبائے بیٹھا رہا۔

وہ بولی۔ "یہ تو طے ہو گیا ہے کہ تم میری سٹوری سننے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے مگر میں سوچتی ہوں کہ تم میرے حالات کو بخوبی جاننے کے بعد ہی بہتر انداز میں میری مدد کر سکتے ہو۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ سنبل کو اس کی آزردگی کا احساس ہوا۔ قریب ہوئی۔ اس کی پنڈلی تھام کر بولی۔ "سوری احمد! میں نے جو کہا، غلط کہا، تم یقیناً ایسے ہرگز نہیں ہو۔"

وہ خفا نہیں تھا۔ دل گرفتہ تھا۔ اس کی ذات پر اس مظلوم لڑکی نے شک کا دائرہ کھینچا تھا جسے اس نے بڑی تگ و دو کے بعد بولنے کے قابل کیا تھا۔ اس نے سنبل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ سرد اور بے جان سا ہاتھ...... بولا۔ "سنبل! میں کون ہوں، کیا ہوں اور کیا

چاہتا ہوں...... یہ بتانے کی مجھے ضرورت نہیں اور نہ ہی مجھے تمہارے بارے میں جاننے کا شوق ہے۔ صبح ہو رہی ہے۔ تمہیں اس کھوہ سے نکال کر سڑک تک کی طرف جاؤں گا۔ کسی گاڑی کا بندوبست کر کے اسلام آباد روانہ کر دوں گا اور بس...... تم اپنے گھر پہنچ کر میرے بارے میں انہی شکوک کی خود کلامیاں کرنا۔ اب خاموش ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی بات اچھی نہیں لگے گی اور تمہیں خواہ مخواہ مایوسی ہوگی۔"

اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ لجاجت سے بولی۔ "پلیز احمد! تم کچھ دیر پہلے ایسے تو نہیں تھے۔"

"لیں...... پہلے میں نے تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ اب سوچ رہا ہوں اور اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔"

"تم نے ایسا کچھ کیا تو نہیں۔"

"ہاں! مگر تم نے بہت کچھ سوچ لیا۔"

"مجھے معاف کر دو احمد...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ڈرومت۔ تمہاری مدد تو میں کر ہی رہا ہوں۔"

"مگر تمہیں ابھی بہت دور تک میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میرے سفری کاغذات پربت شاہ کے پاس ہیں۔ پاسپورٹ، ریٹرن ٹکٹ، آئی ڈی...... سب کچھ...... اور میرے پاس ایک پونڈ بھی نہیں ہے۔ تم مجھے اسلام آباد بھیج دو گے تو میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔ میرا کوئی واقف کار وہاں نہیں بلکہ اس ملک میں سرے سے میں کسی کو جانتی تک نہیں ہوں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ ابھی چیخ کر بول رہی تھی۔ ابھی گلوگیر ہو رہی تھی۔

اس نے احمد کی پنڈلی چھوڑ دی۔ ہاتھ پکڑ لیے۔ یہی نہیں، دونوں ہاتھ اپنے گالوں سے لگا لیے۔ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔ "تمہارا خیال ہے کہ اس کھوہ سے نکلتے ہی میں آزاد ہو جاؤں گی اور مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا مگر سچ یہ ہے کہ میں ہوائی جہاز میں بیٹھنے تک ڈرتی رہوں گی۔ کسی بھی وقت پربت شاہ کے غنڈے مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ وہ مجھے ویٹنگ لاؤنج سے بھی نکال لائیں گے۔ میں اس ملک پر مسلط لاقانونیت دیکھ چکی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ پلیز......"

اس نے ہچکیاں لینا شروع کر دیں۔ احمد بولا۔ "تم احمق لڑکی ہو۔ ایک طرف مجھ پر شک کرتی ہو، بے اعتباری کا اظہار بھی کرتی ہو جبکہ دوسری طرف میری خاموشی پر رونے دھونے لگتی ہو۔ کیا ہو تم؟ میں تمہیں کیوں سمجھ نہیں پا رہا۔ اوکے...... تم یہ ڈرامہ بازی بند کرو اور اپنے بارے میں بتاؤ۔ یہ بھی واضح کرو کہ میں تمہارے لیے مزید کیا کر سکتا ہوں۔"

سنبل نے کھلونا گڑیا کی طرح اچانک رونا بند کر دیا۔ اس کے ہاتھ چھوڑ کر، آنکھیں پونچھ کر سیدھی ہو بیٹھی، بولی۔ "دیٹس گڈ...... میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں یہاں کیا لینے آئی تھی۔"

❀❀❀

اس کی کہانی کئی سال پیشتر سندربن سے شروع ہوتی تھی۔

وہ پربت شاہ کے چھوٹے بھائی نورنگ شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نورنگ شاہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور گھر میں تعلیم حاصل کرنے والا اکلوتا فرد تھا۔ جب وہ ہاؤس جاب مکمل کر کے پنڈی کے ایک اسپتال میں ڈاکٹر تعینات ہوا، گاؤں میں جشن منایا گیا اور فراخ دلی سے مٹھائی بانٹی گئی۔

کچھ عرصہ گزرنے پر ڈاکٹر نورنگ شاہ کو بیرون ملک جانے کا خبط سوار ہو گیا۔ باپ مان گیا مگر بڑا

بھائی پربت شاہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ ملک سے باہر جائے۔ اس نے باپ کے سامنے سرکشی اختیار کرتے ہوئے ٹھونک بجا کر کہہ دیا۔ ”نہیں بابا! نورنگ کو ملک سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ درختوں بھری وادیوں کا مالک باہر جا کر گوروں کی نوکری کرے، یہ پربت شاہ کو گوارا نہیں ہے۔ اسے جو چاہیے، میں حاضر کرتا ہوں۔ اگر یہ اسپتال بنانا چاہتا ہے تو جگہ دیکھے اور اسپتال کا نقشہ بنوائے۔ میں روپیہ دوں گا۔ اتنا، جتنا یہ منہ سے نکالے گا۔“

نورنگ شاہ نے کہا۔ ”نہیں بھائی! میں وہاں نوکری کرنے نہیں، بلکہ کچھ سیکھنے جا رہا ہوں۔ وہ لوگ میڈیکل سائنس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔“

پھر چند ہی دنوں میں دونوں بھائیوں کے درمیان یہ اختلاف کھلم کھلا ضد کی صورت اختیار کر گیا۔ بابا کو پربت شاہ کی سرکش خو کا اندازہ تھا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کے شوق کا خیال بھی تھا۔ اس نے فوری طور پر پربت شاہ کے موقف کی حمایت کا اعلان کر دیا اور نورنگ شاہ کو سختی سے باہر جانے سے روک دیا مگر اس کے دل میں کچھ اور تھا جو دو ماہ بعد کی ایک رات کے نصف حصے میں نورنگ شاہ کے سامنے آیا۔ بابا اس کے کمرے میں آ گیا۔ اس کی حیرانی کو پسِ پشت ڈال کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اسے رازدارانہ انداز میں قریب کر کے بولا۔ ”نوری شاہ! تم مجھے ساری دنیا سے پیارے ہو۔ تمہارا اُترا ہوا چہرہ مہینہ بھر سے دیکھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں کڑھ رہا ہوں۔ تمہیں بڑے بھائی کی ضد کا علم ہے۔ وہ جس بات پر اڑ جاتا ہے، پھر سر جائے تو بھلے چلا جائے، اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔ میں نے اس لیے اس کی بات مان کر تمہارا دل توڑا تھا۔ آج جوڑنے آیا ہوں۔ پربت شاہ گول پہاڑ کے چند درختوں کا سودا کرنے خانس پور گیا ہوا ہے۔ دو دن سے پہلے نہیں لوٹے گا۔“

نورنگ شاہ کے پلے بابا کی باتیں نہیں پڑ رہی تھیں مگر براہِ تکریم خاموشی سے سن رہا تھا۔ بابا کہہ رہا تھا۔ ”میں نے پربت شاہ سے چوری تمہارے لیے انگلستان کے ویزے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔ آج تمام بندوبست ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک کارڈ دیتا ہوں۔ وزیٹنگ کارڈ۔ تم علی الصباح اسلام آباد چلے جاؤ۔ اس کارڈ والے آدمی سے ملو۔ وہ تمہیں پانچ سات دنوں کے اندر پاکستان سے نکال دے گا۔ میں نے ساری پےمنٹ کر دی ہے۔“

نورنگ شاہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بابا اس کے لیے ایسے سوچتا ہے؟ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بابا کے پہلو میں بیٹھنا ممکن نہ رہا اور بے ساختہ اٹھ کر پیروں میں بیٹھ گیا، بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بابا! یہ سب کیا ہے؟“

”یہ میری محبت ہے۔ اس بارے میں زیادہ نہ سوچو۔ انگلستان کی سوچو۔ ہاں! جلد واپس آ جانا۔ تمہارے بغیر ایک دن نہیں گزرتا، مہینے اور سال کیسے گزاروں گا۔“ بابا کا لہجہ بھی نم ہو گیا۔

بابا کی ہدایات کے پیشِ نظر وہ لاہور کا بتا کر گھر سے نکلا۔ اسلام آباد سے ہوتا ہوا پانچویں دن انگلینڈ پہنچ گیا۔ یہاں سے اس کے لیے ایک نئی جدوجہد کا باب کھل گیا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس ملک میں ڈاکٹرز کی قدر و منزلت کہیں زیادہ تھی مگر اسی تناسب سے بڑے چیلنجز کا سامنا بھی تھا۔

جونہی ماں کو...... ماں کے بعد پربت شاہ کو نورنگ شاہ کے انگلینڈ پہنچنے کا علم ہوا، انہوں نے طوفان سر پر اٹھا لیا۔ بابا کو معاملات سنبھالنے کی کوئی ترکیب نہ سوجھی تو اس نے لب بستگی اختیار کر لی۔ نورنگ سے

چھوٹا ایک بیٹا اور تھا۔ اس کی جیپ مری جاتے ہوئے ایک کھائی میں گر گئی۔ دو دن بعد بیٹے کی لاش گھر میں پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ بابا کی کمر ٹوٹ گئی۔ جواں سال کنوارا بیٹا آن واحد میں ہاتھوں سے نکل گیا تھا......

ایسے میں پربت شاہ نے سنبھالا دیا۔ چند دن بعد ہی نورنگ شاہ کو واپس بلوانے کے لیے بابا پر زور دینے لگا۔ آس پاس کے لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا مگر بابا نے مان کر نہ دیا۔ اس نے نورنگ شاہ کو اس کے بھائی کی فوتگی کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے ہی واپس آئے۔

دو سال میں ہی نورنگ شاہ کی جدائی، فیض شاہ کی موت اور پربت شاہ کی سرد مہری نے بابا کو چارپائی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے اپنی زندگی کا رہتا ہوا ایک سال چارپائی پر پڑے پڑے گزار دیا۔ دنیا سے عملی طور پر کٹ کر رہ گیا۔ چونکہ نورنگ شاہ سے رابطے کی واحد سبیل خط و کتابت تھی اور خط کا پتہ محض بابا کے پاس تھا، بابا نے زبانی یاد کر رکھا تھا، کہیں لکھا ہوا نہیں تھا، اس لیے پربت شاہ خواہش کے باوجود نورنگ شاہ کو بلا نہ سکا۔ بابا نے فیض شاہ کی موت کے بعد اپنی بیماری کی خبر بھی انگلینڈ نہ بھیجی۔ جب بابا کا انتقال ہوا تو اس کے دو سال بعد تک نورنگ شاہ خط کا انتظار کرتا رہا، خط لکھتا رہا مگر جواب سے محروم رہا۔ اس کے تمام تر خطوط بابا کے بعد پربت شاہ کو ملے جنہیں وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ پڑھائے بغیر پھاڑ کر پھینک دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک طرح سے نورنگ شاہ کو اپنی زندگی سے کاٹ پھینکا تھا۔

جب ماں نے اگلا سفر اختیار کیا تو پربت شاہ نے نورنگ شاہ کے نام خط لکھوایا۔ چند سطروں پر مشتمل اس خط میں لکھوایا۔ ''ڈاکٹر نورنگ شاہ! چار سال پہلے فیض شاہ، تین سال پہلے تمہارا بابا اور اب، یعنی پچھلے بدھ کو تمہاری ماں مر گئی۔ تمہارا اب یہاں کوئی نہیں۔ وہیں بیٹھ کر رو دھو لینا۔ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رونے کے لیے وطن واپس نہ آنا ورنہ میں ایک اور جنازہ اٹھا لوں گا۔ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!''

نورنگ شاہ پر یہ خط قیامت بن کر گرا۔ وہ کئی ماہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنے اپارٹمنٹ میں پڑا رہا۔ دوستوں نے حوصلہ دیا۔ اسے سمجھایا کہ مرنے والوں کی قربانیوں کو رائیگاں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم ٹکٹ لے کر گھر کا چکر لگا آؤ۔ قبریں دیکھ آؤ۔ ایسا کرنے سے دل کو کچھ قرار آ جائے گا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بڑے بھائی کا چہرہ لہرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ پربت شاہ نے جو لکھوا بھیجا ہے، وہی سچ ہے۔ پربت شاہ کی ظالمانہ خوئے خون میں نہلا دے گی۔ اس نے پربت شاہ کی دھمکی کو دل پر لیا اور ہمیشہ کے لیے پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔

ڈاکٹر الیگرٹ سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ وہ بہت وضعدار عورت تھی۔ اس کی کئی سال پیشتر اپنے خاوند سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ بچوں کے جھنجٹ سے آزاد تھی۔ وہ نورنگ شاہ سے شادی کی خواہاں تھی جبکہ نورنگ شاہ نے اسے دوستی کی لکیر سے آگے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جب اسے اس سانحے کا علم ہوا تو وہ دل جوئی کے بہانے دل کی سلطنت فتح کرنے میدان میں کود پڑی جس میں اسے کامرانی حاصل ہوئی۔ چند ماہ بعد دونوں نے شادی کر لی۔ اس نے شادی کے بعد کی زندگی نورنگ شاہ کی خواہش کے مطابق گزاری اور اسے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ جب سنبل پیدا ہوئی تو دونوں نے اپنے دوستوں کو بلا کر بہت بڑی پارٹی کی۔ خوشی منائی۔ رات گئے جب بھیڑ چھٹی اور میاں بیوی کمرے میں اکیلے رہ گئے تو

نورنگ نے کہا۔ "الیگ...... میں تم سے ایک اجازت چاہتا ہوں۔"

وہ الیگزرٹ کو پیار سے 'الیگ' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی تو نورنگ نے کہا۔ "ہم دونوں نے اپنے مذاہب چھوڑے بغیر اپنی اپنی وش کے تحت شادی کی تھی۔ شادی کے بعد میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ تم عیسائیت کو چھوڑ کر میرا مذہب اختیار کرلو۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟"

"میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" الیگ نے مسکرا کر کہا۔ "تم اپنی بیٹی کے مذہب کے بارے میں پریشان ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرے پاس اس کا ایک موزوں حل ہے۔ کیا میں پیش کروں؟"

نورنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "اسے مسلمان بننا چاہیے یا کرسچن؟ یہ فیصلہ ہمارے درمیان علیحدگی کا سبب بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں یہی پریشانی لاحق ہے۔ میں تب سے اس بارے سوچ رہی ہوں جب سے میں نے اسے پہلی بار اپنے پیٹ میں محسوس کیا تھا۔ ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ اسے دونوں مذاہب سے روشناس کرادیا جائے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک اسے دونوں ٹیوٹرز دیے جائیں۔ اس کے سامنے کبھی تم اپنی خواہش کا اظہار کرو گے نہ میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کروں گی۔ جب یہ بڑی ہو جائے تو اس پر ہی فیصلہ چھوڑ دیا جائے۔ اگر مسلمان ہونا چاہے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ عیسائیت کو گلے لگائے تو تم دل برا نہیں کرو گے۔ بولو! منظور ہے؟"

نورنگ شاہ نے چند منٹ سوچنے کا وقت لیا۔ اسے الیگزرٹ کی ترکیب اچھی لگی۔ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "آئی ایگریڈ وِد یو الیگ...... اگلی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ہم میں سے کوئی بھی بے ایمانی نہیں کرے گا۔"

الیگ نے مسکرا کر وعدہ کرلیا۔

اس معاملے میں دونوں نے عمر بھر بے ایمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ وہ ایک لگے بندھے معمول کے تحت روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے اسلامک سنٹر جایا کرتی تھی جبکہ اتنا ہی وقت چرچ میں صرف کرتی تھی۔ لڑکپن کی سرحد عبور کرنے تک اس نے کئی مرتبہ عیسائیت سے وابستگی کا اعلان کیا اور کئی مرتبہ خود کو مسلمان کہا۔ اس کے ماما پاپا نے اس کے ہر اعلان سے لاتعلقی ظاہر کی اور کہا کہ ابھی اس اعلان کا موزوں وقت نہیں آیا۔

وہ غیر محسوس طور پر پاپا کے بہت قریب رہا کرتی تھی۔ اسے پاپا کا مشفقانہ رویہ اچھا لگتا تھا۔ وہ ہر کام میں احتیاط پسند تھا۔ توازن پسند تھا۔ گھر کی ہر چیز کو اس کے حقیقی مقام پر رکھنے پر مصر رہا کرتا تھا۔ وہ جب بھی ترتیب میں گڑبڑ کرتی، نورنگ شاہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی آرائش از سرِ نو کر دیا کرتا تھا۔ ایسے میں بڑبڑاتے ہوئے اسے ڈانٹتا بھی رہتا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔

ماما کے پاس وقت کم ہوا کرتا تھا۔ سنڈر لینڈ میں لیڈی ڈاکٹرز کی غیر معمولی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے برعکس پاپا کے پاس فارغ وقت ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑے شوق سے سنبل کو اُردو پڑھایا کرتا تھا۔ تدریسی وقت میں اس کے ساتھ اردو بولا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ "میرے چاند! تمہیں ایک نہ ایک دن، زندگی میں کبھی نہ کبھی پاکستان جانا پڑے گا۔ میں تمہیں اُردو اس لیے سکھا رہا ہوں کہ تم پاکستان جا کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرو اور لوگ تمہیں انگریز سمجھ کر تماشا نہ بنا دیں۔"

وہ سنبل کو پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتایا

کرتا تھا۔ سنبل ان کی پاکستان میں گزری ہوئی زندگی کے بارے دلچسپی لیتی تو وہ جواب دینے سے گریز کر جاتا۔ کہتا۔ "پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے۔ میرا آبائی گاؤں جنت کا ٹکڑا ہے۔ تم کبھی جاؤ گی تو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔"

"پاپا! کیا سنڈر لینڈ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے؟" سنبل حیرانی سے پوچھتی۔

سنڈر لینڈ الیگ کا آبائی شہر تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس دھرتی سے جڑی ہوئی تھی۔ جواب دینے میں نورنگ شاہ تامل کرتا، کہتا۔ "سنڈر لینڈ کا حسن الگ، سندر بن کی خوب صورتی الگ...... دیکھنے والے کی آنکھ کا انجذاب اور قلبی وابستگی کا عنصر اور الگ...... میں اس بارے میں کچھ طے نہیں کر سکتا۔ کبھی دیکھو گی تو خود ہی محسوس کرنے کی کوشش کرنا، شاید تمہیں وہ جواب مل جائے جو تمہیں مجھ سے نہیں ملا۔"

ساحل کی ریت پر سن باتھ لیتے ہوئے اس نے الیگ کی موجودگی میں پاپا سے پوچھا تھا۔ "مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے سندر بن کیوں چھوڑا تھا؟"

نورنگ شاہ چونک گیا بولا۔ "کیا پکنک کا مزہ کرکرا کرنا چاہتی ہو؟"

وہ ٹلنے کے بجائے مصر ہو گئی۔ نورنگ شاہ نے کہا۔ "میں نے آدھی زندگی وہاں گزار دی تھی۔ آدھی کہیں اور گزارنا چاہتا تھا کیونکہ زندگی دوسری مرتبہ نہیں ملتی۔"

"پھر تو آپ نے یقینی طور پر سندر بن اور سنڈر لینڈ میں موازنہ بھی کیا ہوگا۔ کسے بہتر پایا پاپا؟"

سنبل کے ذہانت آمیز سوال پر الیگ بھی چونکی۔

نورنگ نے ایک آہ بھری۔ الیگ کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں عجیب یاس اور چاشنی کا امتزاج رچ بس گیا۔ بولا۔ "تمہاری ماما اور تمہارے علاوہ سندر بن کو بہتر پایا۔"

"تو پھر ہمیں لے کر سندر بن چلے کیوں نہیں گئے؟ کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ ہم آپ کے ساتھ پاکستان نہیں جائیں گی؟" سنبل راکھ کرید رہی تھی۔

وہ الیگ کی خود پر مرتکز آنکھوں سے بچ کر آہستگی سے بولا "نہیں میری جان! وہ سنڈر لینڈ سے زیادہ خوب صورت تو ہے مگر محفوظ نہیں۔"

الیگ نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا مگر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یہ بات سنبل نے محسوس کر لی اور موضوع بدل دیا۔

غیر محسوس طور پر نورنگ اور الیگرٹ اس موزوں وقت کا انتظار کر رہے تھے جب سنبل اپنی تعلیم مکمل کر کے، اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنے مذہب کا اعلان کرتی مگر اس وقت کے آنے سے دو سال قبل ہی نورنگ شاہ دماغی شریان پھٹنے سے انتقال کر گیا۔ اس کی وفات الیگ کے لیے سانحے سے کم نہیں تھی۔ وہ چند ماہ میں ذیابطیس کا شکار ہو گئی۔ ایک سال میں ہی ہاسپٹلائز ہو کر رہ گئی۔ سنبل نے اپنے باپ کی تربیت کے پیشِ نظر بڑی دل جمعی سے ماما کی خدمت کی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ الیگ نے بھی نورنگ سے کیے گئے معاہدے کا آخری سانس تک پاس رکھا۔ جب بھی سنبل نے اس سے مذہب سے متعلقہ کوئی مشورہ طلب کیا، اس نے جواب دیا۔ "قطعاً نہیں سنبل...... چونکہ میں اس معاہدے کی فریق ہوں، اس لیے تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔ تم اپنے دوستوں سے مشاورت کرو۔ اگر تین عیسائیوں سے مشورہ مانگو تو تین مسلمانوں سے بھی ضرور پوچھ لینا...... پھر جو دل کو لگے، اسے ذہن میں ڈال دینا۔ میں نورنگ شاہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔"

جب وہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو اس کے فیصلے پر خوش یا ناخوش ہونے کے لیے معاہدے کا کوئی فریق

بھی زندہ نہیں تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے رات بھر جاگتی رہی مگر ناکام رہی۔ رت جگوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ پھر کئی دنوں کی الجھن سے اس نے یہ سوچ کر چھٹکارا حاصل کیا، ’’نہیں سنبل! تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ نماز پڑھا کرو، چرچ جایا کرو۔ ابھی زندگی کو سوچنے کے لیے مزید مہلت دے دو۔‘‘

اس نے اس اہم ترین معاملے کو التوا میں ڈال دیا۔

وہ بہت خوب صورت تھی، صحت مند تھی اور خوب قد کاٹھ نکال چکی تھی۔ اس کے حسن میں ابھرنے والا مشرقیت اور مغربیت کا قدرتی امتزاج دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا دیتا تھا۔ وہ ایک طرف الیگ کا حسن چرانے میں کامیاب رہی تھی تو دوسری طرف نورنگ شاہ سے ذہانت وصول کر چکی تھی۔ بچپن سے ہی اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ نے متاثر کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تعلیم مکمل کرتے ہی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، تربیت حاصل کی اور پولیس کا شعبہ جائن کر لیا۔ چونکہ وہ جذباتی میلانات نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی بہت جلد کسی سے متاثر ہوتی تھی، اس لیے اس کے مزاج کی پختگی نے اسے دو سالوں میں ہی اسسٹنٹ سارجنٹ کے عہدے پر فائز کر دیا۔

الیگ اور نورنگ نے اس کے لیے نہ صرف سنڈر لینڈ کے پوش ایریا میں ایک چھوٹا مگر نہایت دلکش بنگلہ چھوڑا تھا بلکہ ایک اچھی خاصی رقم بھی اسے ترکہ میں ملی تھی۔ دونوں کامیاب ڈاکٹر تھے۔ عمر بھر انسانیت کا احترام کرتے رہے تھے۔ اس لیے ان کے بعد ان کا نام کمیونٹی میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ سنبل کے حصے میں بھی یہ احترام آیا تھا۔ چونکہ اس کے ہاں پونڈز کی کمی نہیں تھی، ہر ماہ معقول سیلری بھی ہاتھ لگ جاتی تھی، اس لیے وہ منفی رویوں سے ہمیشہ دور رہی۔ ڈیپارٹمنٹ میں اسے ’نائس لیڈی‘ کا خطاب ملا۔ اسے کئی کنوارے کولیگز نے شادی کی دعوت دی مگر اس نے برا منائے بغیر ٹال دیا۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ ہر ویک اینڈ پر مختلف لینڈ اسکیپ وزٹ کیا کرتی تھی۔ تعطیلات میں اس نے یورپ کے کئی اہم ملکوں کی سیر بھی کر لی تھی۔ یوں وہ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھی۔ جب اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا تھا، یا اپنی پیشہ ورانہ امور سے اُکتا جاتی تھی تو ماما اور پاپا کے اسٹڈی روم میں گھس جایا کرتی تھی۔ اس کیوبک روم میں طبی لائبریری کے علاوہ مطالعے کے لیے بہت کچھ رکھا ہوا تھا۔ ماما شارٹ نوٹس لکھنے کی عادی تھی، پاپا ڈائری اور خطوط لکھنے کے شائق تھا...... موصول ہونے والے خطوط اور یجنل حالت میں ائر وائز فائل ہوئے تھے جبکہ بھیجے گئے خطوط کی فوٹو کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر فائل کے اوپر سال کے ہندسے درج تھے۔ اسے پاپا پر بہت پیار آتا تھا جب وہ دیکھتی تھی کہ دونوں قسم کے خطوط کو مکالے کی صورت میں ترتیب دیا گیا تھا۔ سوال، پھر اس کا جواب...... در جواب...... ان خطوط اور ڈائریوں کے طویل مطالعے کے بعد وہ پاپا کی زندگی کے ہر پہلو سے روشناس ہو گئی تھی۔ وہ دور ہونے کے بجائے پاپا کے اور قریب ہو گئی۔ اسے ایک طرح سے اپنے پاپا کے حالات سے ہمدردی ہو گئی۔

پاپا نے اپنے بابا کے نام ان گنت خط لکھے تھے۔ ان گنت خط وصول کیے تھے۔ ان کا مطالعہ ہمیشہ سنبل کی آنکھیں نم کر دیا کرتا تھا۔ وہ اپنے دادا کے دکھ کو اپنے پہلو میں محسوس کرتی تو بکھر سی جاتی۔ اسے انہی مکالموں سے پتہ چلا تھا کہ اس کا باپ نورنگ شاہ غریبوں کا ہمدرد تھا۔ وہ کسی پر ظلم برداشت نہیں کرتا تھا۔ گاہے بگاہے اپنی کمیونٹی کے لوگوں کی مالی امداد کیا کرتا

تھا۔ اس کے چچا پربت شاہ کو یہ حرکتیں گراں گزرتی تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ نورنگ نے ان ناکارہ اور نسل در نسل چلے آتے غریب لوگوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔

پھر جب اونچے پہاڑ کے دامن میں نورنگ شاہ نے تین بے آسرا خاندانوں کو رہائش کے لیے تھوڑی سی جگہ دی تو پربت شاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے ان لوگوں کو تو دن چڑھنے سے پیشتر ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا، ان کے سامان کو اکٹھا کر کے آگ کا شعلہ دکھا دیا مگر بابا کی موجودگی میں نورنگ شاہ کو قائل نہ کر سکا۔ مگر پربت شاہ بڑا تھا۔ اس کا حکم ماننا نورنگ شاہ پر واجب تھا۔ خاندانی تربیت یہی تھی۔ جب اس کے دل میں حبس بھر گیا، سانس کی راہ دشوار ہو گئی تو اس نے سندر بن چھوڑنے اور انگلینڈ آنے کا اعلان کر دیا۔

چونکہ پربت شاہ جانتا تھا کہ وہ اس کے رویے کے باعث احتجاجی انداز اختیار کر رہا تھا، اس لیے اس نے بھرپور مخالفت کی مگر اسے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد پربت شاہ نے اپنے بابا پر دباؤ ڈالا۔ "بابا! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ آج یا کل...... سبھی نے یہاں سے پردہ کر جانا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ جیتے جی تمام جائیداد میرے نام کر دیں۔ اگر نورنگ کو آدھی جائیداد ملی تو وہ اپنی عادت کے مطابق لچے لفنگوں میں بانٹ کر آپ کی وراثت کا بیڑہ غرق کر دے گا۔"

بابا نے اسے حق تلفی قرار دیا۔ جب پربت شاہ کا اصرار منفی انداز اختیار کر گیا تو ایک دن بابا نے چپکے سے ریونیوڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ اپنی وسیع و عریض اراضی کے دو برابر حصے کر دیے۔ دونوں بیٹوں کے نام جائیداد کا برابر بٹوارا کر دیا۔ جب پربت شاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولہ ہو کر بابا پر چڑھ دوڑا۔ بابا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ بھی سننے

بڑے کام

دنیا میں ہمیشہ دو ہی قسم کے انسان ہوتے ہیں، ایک وہ انسان جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کچھ کرے اس کی قیمت مع اضافہ کے وصول کرنا چاہیے، دوسرا انسان؛ وہ ہے کہ وہ جو کچھ کرے اسے بھول جائے۔ اسے اپنے کیے کا کوئی معاوضہ نہ ملے تب بھی وہ کوئی شکایت اپنے دل میں نہ لائے اسے بھول جائے۔ اس کی تسکین کا سامان یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مقصد میں لگائے ہوئے ہے نہ یہ کہ اس کو اس کے عمل کا فوری معاوضہ مل رہا ہے پہلی قسم کے لوگ بھی انسان ہیں اور دوسری قسم کے لوگ بھی انسان، مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ظاہری صورت کے سوا دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں پہلی قسم کے لوگ صرف بازار چلاتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے لوگ تاریخ بناتے ہیں۔

یہی دوسری قسم کے لوگ انسانیت کا اصل سرمایہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ مل کر کام کریں۔ جب اس طرح لوگ ملتے ہیں تو کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ، کوئی کریڈٹ پاتا ہے اور کوئی بے کریڈٹ رہ جاتا ہے کسی کا استقبال ہوتا ہے اور کوئی دیکھتا ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ صورتحال بالکل فطری ہے اور یہ تفریق ہمیشہ نظر آتی ہے۔ بڑا کام کرنے والے وہ لوگ ہیں کہ ان کا عمل اور حسن اخلاق ہی ان کا معاوضہ اور بدل بن جائے اپنی بھرپور ذمہ داری ادا کر کے ان کو وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جسے کسی پیمانے سے ناپا اور کسی ترازو سے تولا نہیں جا سکتا اور ایسے شخص کو دنیا ہی میں ایک بہت بڑا انعام اور معاشرے میں ایک بہترین مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

حسن اختر پریتم ...... ناظم کراچی

اور ماننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر اس نے جھگڑے کا اختتام اس تقریر پر کر دیا۔ "بابا! تم نے میرا حق غصب کرتے ہوئے یہ ساری وادی نورنگ کے نام کر دی ہے۔ مجھے پچھلی وادی دی ہے۔ میں اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام جائیداد مجھے دی جاتی کیونکہ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ تمہارے بڑھاپے کا سہارا بنا ہوں جبکہ وہ بے وفا نکلا، تمہیں چھوڑ گیا اور اس نے لوٹ کر تمہاری خبر تک نہیں لی۔ اگر تمہیں اس کا اتنا ہی خیال تھا تو بندرہ وادی اس کے نام کر دیتے اور سندر بن مجھے دیتے۔ وادی کے ساتھ ساتھ اب وہ اس حویلی اور گاؤں کا مالک بھی بن گیا ہے جبکہ میرے حصے میں صرف جنگل آیا ہے۔ اس کا میں کیا کروں؟ اب تم میرا فیصلہ بھی سن لو۔ میں تمہارے نورنگ کو سندر بن کا ایک درخت بھی نہیں دوں گا۔ وہ کیا، اس کی سات نسلیں بھی سندر بن میں قدم نہیں رکھ سکیں گی۔ خدا کرے کہ تم وہ وقت دیکھنے کے لیے زندہ رہو جب وہ سندر بن میں قدم رکھے اور میں اس کی قمیص سرخ کروں۔"

اسے مطمئن کرنے کے لیے بابا نے سندر بن کے عقب میں واقع بندرہ وادی کی پرفضا ڈھلان میں ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی۔ اس کے چاروں اطراف میں کوئی درجن بھر چھوٹے مکانات بھی تعمیر کرائے جہاں پربت شاہ اپنے ملازمین کے خاندانوں کو ٹھہرا سکتا تھا۔ یہ سب کرنے کے باوجود وہ پربت شاہ کو راضی نہ کر سکا۔ اس کا غصہ فرو نہ ہوا۔ بابا چاہتا تھا کہ نورنگ شاہ اور پربت شاہ کے درمیان نفرت کی دیوار حائل نہ رہے اور اس کے مرنے کے بعد دونوں بھائی محبت سے رہیں مگر وہ تادم آخر اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر پائے۔ سندر بن کے جملہ واقعات اور حالات سے بابا نے نورنگ شاہ کو خطوں کے ذریعے آگاہ رکھا۔ کہیں کہیں اس کے لیے یہ مشورہ بھی درج تھا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی سندر بن سے دور گزار دے۔

سنبل کا بچپن جن سوالوں کے جوابات کی کھوج میں گزرا تھا، ان سب کے جواب اسے پاپا کی تحریروں سے مل چکے تھے۔ اپنی بنیاد سے کٹ کر دور گرے ہوئے درخت کے اندرونی دکھ کا احساس ہوتے ہی وہ پاپا کو بہت دلیر انسان سمجھنے لگی اور دل ہی دل میں اسے پوجنے لگی۔

اس کے ذہن میں جس سندر بن کا نقشہ کھنچ چکا تھا، اس میں وہ کبھی بھی پاؤں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کبھی بھی پاکستان آنے اور اپنے پاپا کے گاؤں کو دیکھنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ عالمی سطح پر پاکستان کا جو ڈراؤنا امیج بنایا گیا تھا، وہ بھی اس حق میں نہیں تھا کہ وہ ادھر کا رخ کرتی۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی اور وہ اگلی تعطیلات میں کینیڈا کی سیاحت کا پروگرام ترتیب دے رہی تھی مگر ایک فیس بک فرینڈ نے اس کا سکون غارت کر دیا۔

ایک شب، جب وہ انٹرنیٹ پر بیٹھی سندر بن کا عنوان دے کر سرچ کر رہی تھی تو اسے فیس بک میں ایک بھولا بھالا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ سمیر تھا۔ معصوم صورت...... سادہ لوح......

(اس داستان دل فریب کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے)